میں، جب کہ موسم بہار میں سردی رہی، ابوسعید نے ثمر دار درختوں کا محصول معاف کر دیا۔ اس نے خاصّہ کی اراضی کو سیراب کرنے کے لیے گلستان (مشہد کے قریب) کا مشہور بند تعمیر کرایا تھا۔ اُن اعلیٰ قابلیت کے افراد میں سے جو وزیر کے عہدے پر فائز ہوے نمایاں ترین شخص قطب الدین طاؤس سَمْنانی تھا، جو زرعی اُمور کا خصوصی ماہر تھا۔ اس نے ہرات کے شمال میں جوے سلطانی کھدوائی۔

یہ معلوم نہیں کہ اس کے عہد میں آبادی کے خانہ بدوش عناصر کا حال کیسا تھا۔ ۸۷۰ھ/ ۱۴۶۵-۱۴۶۶ء میں ابوسعید نے خراسان میں خانہ بدوشوں کے پندرہ ہزار خاندان آباد کرائے، جو قرہ قویونلُو کے علاقوں سے بھاگ کر آئے تھے۔ عام طور پر تیموری سلطنت اپنے مغربی ہمسایوں کے مقابلے میں خانہ بدوشوں کی تعداد کے اعتبار سے کمزور رہی اور اس کی فوجی مہموں کی نااہلیت کی وجہ یہی تھی۔

۱۴۶۸ء کی مہم: ابوسعید ترکمانوں سے وہ علاقے واپس لینے کی امید میں جو شاہ رخ کی وفات کے بعد تیموریوں کے ہاتھ سے نکل گئے تھے تیموریوں کے قدیم اتحادی آق قویُونلُو کے خلاف قرہ قویُونلُو حسن علی بن جہان شاہ کی مدد کے لیے روانہ ہوا۔ بڑے بڑے شہروں کے لیے، جنھیں فتح کرنا مقصود تھا، پہلے سے حاکم نامزد کر دیے گئے، لیکن ابوسعید کی سلطنت نسبۃً پُرامن تھی اور مہم کے لیے، جس کا فیصلہ عجلت میں کیا گیا تھا، عسکری اعتبار سے اچھی طرح تیاری نہ کی جا سکی تھی۔ ابوسعید سوار فوج لے کر چل پڑا اور ان ہزار ہا گاڑیوں کا انتظار تک نہ کیا جو فوج کا سامان اٹھانے کے لیے خراسان اور مازندران سے حکمًا حاصل کی گئی تھیں۔ خراسانیوں کی پیادہ فوج پر، جو عقب میں تھی، فوج کے فراریوں نے حملہ کر دیا۔ جب ابوسعید کے فوت ہو جانے کی خبر ہرات پہنچی تو اس وقت تک وہ عساکر جو 'ہندوستان' (یعنی افغانستان) میں بھرتی کیے گئے تھے منظّم نہیں ہوے تھے۔ ان ناقص تیاریوں کے باوجود ابوسعید نے غلطی یہ کی کہ سردی آ جانے پر وہ آذربیجان کے ملک میں دور تک بڑھتا چلا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُوزون حسن نے اس کا سلسلۂ مواصلات منقطع کر کے اسے گرفتار کر لیا۔ چند روز بعد ایک تیموری امیر یادگار محمد نے، جو اُوزون حسن کے متوسّلین میں سے تھا، اپنی دادی گوہرشاد کے قتل کا انتقام لینے کے لیے ابوسعید کو قتل کرا دیا (فروری ۱۴۶۹ء)۔

مآخذ: (۱) عبدالرزاق سمرقندی کی مطلع السعدین سب سے بڑا ماخذ ہے (طبع محمد شفیع، لاہور ۱۹۴۱-۱۹۴۹ء)؛ مزید براں (۲) روضۃ الصفاء؛ (۳) حبیب السِیَر؛ (۴) معزّ الانساب؛ (۵) بابُرنامہ، طبع و ترجمہ بیورج (Beveridge)؛ (۶) الاِسفِزاری: روضۃ الجنّات فی تاریخ ہرات (قب Barbier de Meynard، در *JA*، ۱۸۶۲ء، ج ۱۱)؛

مغول کے بارے میں ابوسعید کی حکمت عملی: (۱) تاریخ رشیدی، طبع Elias و ترجمہ از E. D. Ross.

سِیَر: (۱) سیف الدین حاجی: آثار الوزراء (مخطوطہ)؛ (۲) خواندامیر: دستور الوزراء، تہران ۱۳۱۷ھ؛ اور نقشبندی مجموعات: (۳) کاشفی: رشحات عین الحیات، مطبوعۂ تاشقند و لکھنؤ؛ (۴) الاَبِیْوَردی: روضۃ السالکین (مخطوطہ) وغیرہ.

دستاویزیں: دیکھیے (۱) مجموعات انشا - مخطوطات (بالخصوص کتب خانۂ ملّیہ، پیرس، ضمیمۂ فارسی، ۱۸۱۵ء)؛ (۲) A. N. Kurat: *Topkapi Sarayi müzesi arşivindeki... yarlik ve bitikler*، استانبول ۱۹۴۰ء (ایک خط)؛ قب نیز (۳) فریدوں بک: منشآت.

مطالعات: چونکہ اس عہد کے متعلّق مخصوص تصنیفات نہیں ملتیں اس لیے اس عہد کے مسائل اور اس کے قریب کے ادوار سے متعلّق کتابیں دیکھنا چاہییں، بالخصوص: (۱) بارٹولڈ (V. V. Barthold): *Ulug Beg i iego vremja*، ۱۹۱۸ء (جرمن ترجمہ از ہنز (Hinz): *Ulug Beg und seine Zeit*، ۱۹۳۵ء) اور *Mir Ali Shir i političeskaja zizn' Herat* (ترجمہ از ہنز (Hinz): *unter Husain Baiqara*)؛ (۲) مقالات (از Molčanov Yakubov-skij و Belenitskij وغیرہ)، دو مجموعوں میں: (i) *Rodonačal'nik uzbekskoj literetury*، تاشقند ۱۹۴۰ء؛ (ii) *Ali Shir Navoj Sbornik*، تاشقند ۱۹۴۶ء؛ (۳) Belenitskij: *K istorii feodal'nago zemlevladenija Srednej Azii pri Timuridakh*، در Istorik-Mar*ksist*، ۱۹۴۱ء، ج ۴؛ (۴) I. P. Petrushevskij کی تصانیف؛ (۵) W. Hinz: *Irans Aufstieg zum Nationalstaat*، ۱۹۳۶ء؛ (۶) ہرات میں روسی سفارت ۱۴۶۴ء کے لیے قب *ZVO*، ۱: ۳۰ بعد؛ (۷) نیز دیکھیے Browne، ج ۳؛ (۸) Grousset: *Empire des Steppes*؛ (۹) Bouvat: *Essai sur la civilisation timouride*، در *JA*، ۱۹۲۶ء اور *L' Empire mongol (2e phase)*، پیرس ۱۹۲۷ء کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

(J. AUBIN)

----

* **ابوسَعِید فضل اللہ بن ابی الخیر**: ایران کے ایک صوفی، جو یکم محرّم ۳۵۷ھ/ ۷ دسمبر ۹۶۷ء کو خراسان میں اَبِیْوَرد اور سَرَخس کے درمیان مَیْہَنَہ (مہانہ، مِہْنَہ) کے مقام پر پیدا ہوے، جسے آج کل میئآنہ کہتے ہیں اور ۴ شعبان ۴۴۰ھ/ ۱۲ جنوری ۱۰۴۹ء کو اسی جگہ فوت ہوے۔ ان کے حالاتِ زندگی ان کے اخلاف میں سے محمد بن ابی رَوْح لطف اللہ بن ابی سعید ابن ابی طاہر بن ابی سعید بن ابی الخیر نے حالات و سخنان شیخ ابی سعید بن ابی الخیر کے عنوان سے لکھے تھے، طبع V. Zhukowski، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۹ء (ایک مخطوطہ بعنوان چہل مقام، در آیا صوفیا، شمارہ ۲۹ ء ۴۷۹۲ اور شمارہ ۴ ء ۴۸۱۹؛ ترکی ترجمہ در کتاب خانۂ استانبول یونیورسٹی ییلدِز، شمارہ ۹۵۸) اور اس سے بھی زیادہ شرح و بسط کے ساتھ مذکور الصدر کے عم زاد بھائی محمد بن المنوّر ابن ابی سعید نے بعنوان اسرار التوحید فی مقامات الشیخ ابی سعید؛ طبع V. Zhukowski، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۹ء، دو ناقص مخطوطوں کی مدد سے؛ طبع ثانی، تہران

۱۳۱۳ھ ـش؛ طبع تازہ، تہران ۱۳۳۲ھ ـش (مخطوطات نیز درسقوطری، ہُدائی، تاش ۲۳۸، اور استانبول میں شہید علی پاشا، ۱۴۱۶)۔ عطار نے تذکرۃ الاولیاء اور جامی نے نفحات الانس میں اسی تصنیف کو ماخذ کے طور پر استعمال کیا۔ ابو سعید کے والد دوا فروش تھے اور بابو (بابا) ابوالخیر کے نام سے مشہور تھے۔ وہ کبھی کبھی اپنے بیٹے کو ان رقص وسماع کی محفلوں میں لے جاتے تھے جو قصبے کے صوفی باری باری اپنے گھروں میں منعقد کیا کرتے تھے۔ ابوسعید نے طریقت کا پہلا سبق ابوالقاسم بِشْر یاسِین (م ۳۸۰ھ/ ۹۹۰ء) سے لیا، جو شعر وسخن کا ذوق بھی رکھتے تھے اور وہ اشعار جو ابوسعید بعد میں اپنے مواعظ میں سنایا کرتے تھے بیشتر انھیں کی تصنیف ہوتے تھے۔ جوان ہونے پر ابوسعید نے مرو میں شافعی فقہ کی تعلیم ابو عبداللہ الحُصْرِی اور ابوبکر القَفّال (م ۴۱۷ھ، السُبکی: طبقات، ۳:۱۹۸ـ۲۰۰) سے حاصل کی۔ ان کے ہم سبقوں میں امام الحَرَمین کے والد ابو محمد الجُوَینی (م ۴۳۸ھ، السُبکی: الطبقات الشافعیة، ۳:۲۰۸ـ۲۱۹) بھی تھے۔ بعدازاں انھوں نے تفسیر قرآن، عقائدِ اسلام اور حدیثِ نبوی کی تعلیم سَرَخْس میں ابوعلی ظاہر (م ۳۸۹ھ، السُبکی، ۲:۲۲۳) سے پائی، جنھوں نے سَرَخْس سے معتزلہ عقائد کا استیصال کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

سَرَخْس میں لقمان السَرَخْسی نامی مجذوب ولی نے ابوسعید کا صوفی ابوالفضل محمد بن حَسَن السرخسی سے تعارف کرایا اور انھیں نے ابوسعید کو علومِ ظاہری کی تحصیل ترک کر کے تمام تر توجہ علوم باطنی پر صرف کرنے کی ترغیب دی۔ ابوسعید ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے اور جملہ مشکلات میں اپنے انھیں مرشد کی طرف رجوع کرتے تھے، بلکہ ابوالحسن کی وفات کے بعد بھی ابوسعید کی عادت یہ تھی کہ مایوسی (قبض) لاحق ہونے پر وہ اپنے مرشد کے مزار پر سَرَخْس جایا کرتے تھے۔ شیخ ابوالفضل کے حکم کے مطابق انھوں نے مشہور صوفی السُلَمی سے خرقہ حاصل کیا۔ ابوالفضل کی وفات کے بعد وہ نَسَا ہوتے ہوئے آمل گئے اور کچھ عرصہ ابوالعباس القصّاب کی صحبت میں گزارا۔ انھوں نے بھی ابوسعید کو خرقہ عطا کیا۔ مَیْہَنَہ میں لوٹ آنے کے بعد ــــ اس دور کے تاریخ وار حالات کا تعین بہت مشکل ہے ــــ شیخ ابوسعید پورے ذوق وشوق کے ساتھ سخت زاہدانہ اور صوفیانہ ریاضتوں میں مشغول ہوگئے۔ وہ اپنے وقت کا بیشتر حصّہ اپنے والد کے گھر پر ایک حجرے میں مکمّل تنہائی میں گزارتے تھے، لیکن کچھ وقت گرد ونواح کی خانقاہوں، خاص کر رباط کہن نامی خانقاہ میں بھی بسر کرتے رہے۔ یہاں ان کے والد نے انھیں بعض اوقات تعقیبِ نفس کی غیر معمولی حالت میں پایا۔ طہارت کے بارے میں وہ فرائضِ شرعیّہ سے بہت آگے چلے جاتے اور اپنے حجرے کے در و دیوار تک کو دھویا کرتے تھے؛ تکیے کے سہارے ٹیک لگا کر کبھی نہ بیٹھتے، دن کے وقت کچھ نہ کھاتے اور رات کے وقت بھی صرف ایک لُقمۂ نان پر کفایت کرتے تھے؛ لوگوں سے وہ صرف اسی وقت گفتگو کرتے جب بات کرنا ناگزیر ہو؛ ذکر کے وقت اپنے آپ کو حجرے میں بند کر لیتے اور کانوں میں روئی ٹھونس لیتے تاکہ کوئی خلل واقع نہ ہو۔ بعض اوقات انھیں اپنے ہم جنس انسانوں کو دیکھنے سے بھی سخت وحشت ہوتی اور وہ کئی کئی مہینے پہاڑوں یا قریب کے صحرا میں غائب رہتے تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ نفس کشی اور علائقِ دنیوی کو مکمّل طور پر ترک کرنے کی غرض سے مشقّت وریاضت کے ذریعے اپنی تربیت کرنے اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی [حضرت] رسول اللہ [صلّی اللہ علیہ وسلّم] کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی کوشش کا یہ دَور چالیس سال کی عمر تک جاری رہا۔ اس وقت بھی ابوسعید پر طریقت کے معاشرتی محرّک یعنی ''خدمت درویشاں'' کی اہمیت منکشف ہونے لگی تھی؛ چنانچہ وہ مساکین کے لیے خود بھیک مانگتے، مسجدوں میں جھاڑو دیتے، طہارت خانوں کو صاف کرتے، وغیرہ وغیرہ۔ غریبوں کی خدمت کا یہ جذبہ، جس سے ابتدا میں شکست خودی مقصود ومتصوّر تھی، ابوسعید کی زندگی میں آگے چل کر اور نمایاں ہوتا چلا گیا؛ چنانچہ ایک دفعہ انھوں نے کہا کہ اللہ تک پہنچنے کا نزدیک ترین راستہ کسی مسلمان کی جان کو آرام پہنچانے میں ہے (''راحتے بادلِ مسلمانی رساندن''ــــ اسرار التوحید، ص ۲۴۲)۔ زندگی کا یہ طریق اپنی مکمل صورت میں خراسان کے صدر مقام نیشاپور میں نمایاں ہوا، جہاں وہ عَدَنی کُوبان کے محلے میں ابوعلی طَرُسُوسی کی خانقاہ میں ایک سال مقیم رہے۔ یہاں نوجوان لوگ جوق در جوق ان کے پاس آتے تھے۔ وہ بڑے بڑے مجمعوں کو تلقین فرماتے اور اُن کے سامنے روحانی مُرشد کی صورت میں ظاہر ہوتے (صِدْق مع الحق، رِفْق مع الخَلْق)۔ اس موقع پر اُن کا خاص ملکۂ کشفِ قلوب (''فِراست'')، جسے ان کے پیرو کرامت یا خرق عادت مانتے تھے، بہت کام دیتا تھا۔ یہ وصف ان کے دشمنوں تک کے دلوں کے مخفی سے مخفی محرکات کو ان پر منکشف کر دیتا تھا۔ مخالف بھی اس کے سامنے عاجز رہ جاتے اور اکثر مخالفت چھوڑ کر ان کی پیروی اختیار کر لیتے۔ وہ بہت فراخدلی سے، بلکہ مسرفانہ حد تک، اپنے مریدوں کی ضیافتیں کرنا پسند کرتے، جن کا خاتمہ محفل سماع پر ہوتا تھا۔ ان سماع کی محفلوں میں، جیسا کہ اس زمانے کا معمول تھا رقص اور ہاوہُو (نعرہ زدن) کا ہنگامہ برپا ہوتا۔ وجد کی حالت میں جبّے اتار کر پھینک دیے جاتے یا پھاڑ دیے جاتے اور ان کے ٹکڑے سب کو تقسیم کیے جاتے تھے۔ ایسی پُرتکلّف تقریبات کے لیے، جن پر ایک دن میں تقریباً ایک ہزار دینار تک صرف ہوجاتے تھے، شیخ قرض لینے میں بھی تامّل نہ کرتے تھے، عوفی نے یہی حال دیکھ کر لکھا ہے کہ آخری دَور میں ابوسعید کو زاہدِ مرتاض کی زندگی سے بہ مشکل کوئی مناسبت تھی، بلکہ وہ ایک سلطان کی طرح رہتے تھے (بارٹولڈ (Barthold): *Turkestan*، ص ۳۱۱)۔ اُن کے قرضے ان کے امورِ خانہ داری کے مُنْصرِم حسن مُؤَدِّب کے لیے بسا اوقات پریشانی کا موجب بن جاتے تھے، مگر بہرحال کوئی نہ کوئی باثروت مرید ایسا مل جاتا تھا جو اکثر آخری لمحے پر مطلوبہ رقم پیش کر دیتا تھا۔ بعض اوقات وہ حَسَن کو اپنے مریدوں کے پاس، بلکہ اپنے مخالفین کے پاس بھی، جن کے ہاں وہ ٹھیرتے، روپیہ مانگنے کے لیے بھیج دیتے اور اس بارے میں بالکل بے تکلفی سے کام لیتے۔ یہ روپیہ فی الفور خرچ کر دیا جاتا تھا، کیونکہ دانستہ املاک

(معلوم) کا نہ رکھنا اور کچھ جمع نہ کرنا ان کا طے شدہ اصول تھا۔ ان کے طرزِ زندگی نے کرّامیہ فرقے کے ابوبکر محمد بن اسحٰق بن مُحمشاذ کو ناراض کر دیا جس نے حنفی قاضی صاعد بن محمد الأُسْتُوائی (م ۴۳۲ھ؛ دونوں کے حالات کے لیے دیکھیے (۱) عُتْبی۔ مَنِینی، ۲: ۳۰۹ بعد، فارسی ترجمہ از جُرفادقانی، تہران ۱۲۷۲ھ، ص ۴۲۷ بعد؛ (۲) بارٹولڈ (W. Barthold): *Turkestan*، ص ۲۸۹-۲۹۰، ۳۱۱؛ مؤخّر الذکر کے لیے دیکھیے ابن ابی الوفاء: الجواهر المُضِیْئة، شمارہ ۶۸۵ اور السَّمْعانی: الانساب، تحت مادّۂ الأُسْتُوائی) کے ساتھ ہم نوا ہو کر سلطان محمود بن سبکتگین کے سامنے ابوسعید کے متعلّق عرض داشت پیش کی۔ سلطان نے تحقیقات کا حکم صادر کر دیا۔ یہ حکم غالبًا ملاحدہ کی اس عمومی دار و گیر ہی کے سلسلے میں ہو گا جو مذکورۂ بالا کرّامیہ والی ابوبکر نے جاری کر رکھی تھی (Barthold: *Turkestan*، ص ۲۹۰)، مگر ابوسعید نے مہارتِ کشفی سے کام لے کر کسی نہ کسی طرح دونوں کی کوششیں ناکام کر دیں اور اُنھوں نے ابوسعید سے مؤاخذے کا خیال چھوڑ دیا۔ ان کے خلاف الزامات یہ تھے کہ شیخ منبر پر کھڑے ہو کر قرآن و حدیث کے بجائے شعر پڑھتا ہے، مُسرفانہ ضیافتیں کرتا ہے اور نوجوانوں کو رقص کراتا ہے۔ امام القُشَیْری نے، جس کی نیشاپور میں ابوسعید سے ملاقات ہوئی، شیخ کے انتہائی آزادانہ طریق زندگی پر اور ان کے رقص و سماع پر اعتراض کیا۔ ان دو بزرگوں کے اخلاق کا فرق ایک برمحل قصے سے ظاہر ہوتا ہے۔ القُشَیْری نے ایک درویش سے قطع تعلّق کر کے اسے شہر بدر کر دیا تھا۔ ابوسعید نے ایک ضیافت کے موقع پر دکھایا کہ کس طرح زیادہ نرم طریقہ اختیار کر کے بھی درویش کو سفر پر بھیجا جا سکتا ہے (نکلسن، ص ۳۵-۳۶).

طبیعت کی انتہائی نرمی اور مہربانی اور بنی نوع کے ساتھ محبت و شفقت کے اوصاف ابوسعید کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ وہ توبہ و استغفار کے واعظ نہ تھے۔ انھوں نے اپنے وعظوں میں قرآن پاک کی اُن آیات کا جن میں جہنم کے عذاب کا ذکر ہے شاید ہی کبھی حوالہ دیا ہو گا۔ اس مضمون کی بہت سی حکایتیں بیان کی گئی ہیں کہ کس طرح وہ اپنی فراست کے ذریعے گنہگاروں اور مخالفوں کے دل کے بھید معلوم کر لیتے اور انھیں پوری طرح شرمسار کر دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس حدیث کو بنیادی طور پر اپنی زندگی کا اصول بنا رکھا تھا: صِلْ مَنْ قَطَعَکَ وَاَعْطِ مَنْ حَرَمَکَ وَاغْفِرْ مَنْ ظَلَمَکَ (جو تجھ سے قطع تعلّق کرے تو اس سے تعلّق رکھ، جو اپنا ہاتھ تجھ سے روکے تو اسے دے اور جو تجھ پر ظلم کرے تو اسے معاف کر دے، اسرار التوحید، ص ۳۱۱)۔ مشہور صوفی ابن باکُویہ (م ۴۴۲ھ/ ۱۰۵۰ء) نے ابوسعید کو اس پر ملامت کی کہ انھوں نے نوجوانوں کو معمّر لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت دے رکھی ہے، نوجوانوں کے ساتھ بھی اسی قسم کا سلوک کرتے ہیں جیسا بزرگوں کے ساتھ اور انھیں رقص کی اجازت دیتے ہیں، متروک خرقہ اس کے مالک کو واپس دے دیتے ہیں حالانکہ متروک ہونے کے باعث اسے مشترکہ سمجھنا چاہیے۔ ابوسعید نے ان بدعات کے لیے بظاہر معقول دلائل پیش کیے (اسرار التوحید، ص ۱۷۰-۱۷۱)۔ ابن حَزْم شیخ کو کافر قرار دیتا ہے، کیونکہ وہ کبھی صُوف پہنتے، کبھی ریشم، کبھی روزانہ ہزار رکعت نماز پڑھتے اور کبھی بالکل نہ پڑھتے تھے (فِصَل، ۴: ۱۸۸)۔ بہر حال ان کی زندگی کے دوسرے دَور میں انفرادی سیر و سلوک کی بہ نسبت خدمتِ خلق کا معاشرتی پہلو بہت زیادہ غالب تھا اور اس نقطۂ نگاہ سے ان کا موازنہ ابواسحٰق الکازرونی [رکّ بآن] سے کیا جا سکتا ہے (اگرچہ ان دونوں میں اہم فرق پائے جاتے ہیں)، مگر شیخ ابوسعید نے الحلاّج کے 'انا الحق' کی طرح کا ایک شطحیّہ بھی ایک بار زبان سے نکالا تھا۔ ایک وعظ کے دوران میں ان پر باطنی جوش کا ایسا غلبہ ہوا کہ وہ پکار اُٹھے: لیس فی الجبة الا اللہ (اس جبے کے اندر اللہ کے سوا کوئی نہیں) اور یہ کہتے ہوے انگشت شہادت اپنے جُبّے میں سے گزار دی۔ یہ جُبّہ تقسیم کیا گیا اور جس حصّے میں انھوں نے انگلی سے سوراخ کر دیا تھا اسے محفوظ کر لیا گیا۔

نیشاپور میں شیخ نے حکیم ابن سینا سے بھی ملاقات کی اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس حکیم کے ساتھ طویل مذاکرات ہوے۔ دونوں کی خط و کتابت محفوظ ہے۔ ابوسعید نے حکیم سے دریافت کیا تھا کہ اس کے تجربے کے مطابق اللہ تک پہنچنے کی راہ کیا ہے؟ اس خط کا جواب انھیں موصول ہوا (طبع H. Ethé: *SBBayr. Ak.*، ۱۸۷۸ء، ص ۵۲ بعد؛ ابن سینا: النَّجات، قاہرہ ۱۳۳۱ھ، ص ۱۲-۱۵؛ ابن ابی اُصَیْبِعہ، ۲: ۹-۱۰؛ العاملی: الکَشْکول، قاہرہ ۱۳۱۸ھ، ص ۲۶۴-۲۶۵)۔ قیام نیشاپور کے آخر میں وہ اپنے بیٹے ابوطاہر کے ساتھ حج کو جانا چاہتے تھے، لیکن مشہور و معروف صوفی ابوالحسن خَرَقانی نے انھیں خَرَقان میں روک لیا۔ از اں بعد وہ بِسطام گئے، جہاں ابویزید (بایزید) کے مزار کی زیارت کی، وہاں سے دَامغان ہوتے ہوے بالآخر ریّ پہنچے اور وہاں سے اپنے بیٹے کے ساتھ وطن واپس آئے اور بقیہ زندگی اپنے وطن قصبہ مَیْہَنہ میں گزار دی۔

ابوسعید کو بہت سی رباعیات کا مصنّف خیال کیا جاتا ہے (مختلف طباعتوں کے لیے قبّ نکلسن، ص ۲۴، حاشیہ؛ نیز مطبوعۂ بمبئی ۱۲۹۴ھ و لاہور ۱۹۳۴ء)، لیکن صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے صرف ایک شعر اور ایک رباعی لکھی تھی (نکلسن، ص ۴)۔ اگر یہ صحیح ہے تو رباعیات کو ان سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ ایک رباعی کی، جس کے ذریعے خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے قرآن مجید کے معلّم ابوصالح کی بیماری کا علاج کیا تھا (اسرار التوحید، ص ۲۲۹) اور جو "حَوْراء" کے لفظ سے شروع ہوتی ہے؛ اس کی شرح عبداللہ بن محمود الشّاشی نے رسالۂ حَوْرائیه کے نام سے لکھی تھی (اسرار التوحید، ص ۳۲۲-۳۲۵).

ابوسعید نے اپنے پس ماندگان کی ایک بڑی تعداد چھوڑی۔ وہ ایک سو سال سے زیادہ مدت تک ان کے مزار کی دیکھ بھال کرتے رہے اور انھیں مَیْہَنہ میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ شیخ کے سب سے بڑے بیٹے ابوطاہر سعید (م ۴۸۰ھ) نے "مساکین کی خدمت" کا سلسلہ جاری رکھا، جس کی وجہ سے وہ قرض دار بھی ہو گئے؛ یہ قرضہ نظام الملک نے ادا کیا۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہ

تھے۔ انھوں نے دس سال کی عمر سے پہلے ہی مکتب کو خیر باد کہہ دیا تھا اور انھیں قرآن پاک کی صرف ۴۸ ویں سورۃ [الفتح] حفظ تھی۔ وہ اتنی شخصی وجاہت نہ رکھتے تھے کہ باپ کی وفات کے بعد (جیسا کہ جلال الدین رومی کے بیٹے سلطان وَلَد نے کیا) ایک سلسلۂ طریقت کی بنیاد رکھ سکتے، حالانکہ ابوسعید ایسا سلسلہ بنانے کے لیے ایک قسم کا دستور العمل چھوڑ گئے تھے (نکلسن، ص ۴۶)، لیکن ملک کے سیاسی واقعات نے یہ روایت منقطع کردی۔ جب سلجوقی خراسان میں داخل ہوے تو ابوسعید بقیدِ حیات تھے۔ سلجوقیوں نے مَیہَنہ پر قبضہ جمالیا۔ ابوسعید طُغرِل اور چَغری بیگ کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ سلطان مسعود نے شہر کا محاصرہ کیا اور اسے سر کرلیا، لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد ۴۳۱ھ/ ۱۰۴۰ء میں اس نے دَندانقان کے مقام پر فیصلہ کن شکست کھائی۔ ۵۴۸ھ/۱۱۵۳ء میں جب غُزوں نے خراسان کو تاراج کیا تو مَیہَنہ بالکل اجڑ گیا اور ابوسعید کے خاندان کے ایک سو پندرہ افراد کو طرح طرح کی عقوبتیں دے کر قتل کردیا گیا۔ ابوسعید کے ایک مرید مسمّٰی دُوست بُوسعد دَدَہ کو شیخ نے اپنی موت سے کچھ عرصہ پہلے غزنی بھیجا تھا تاکہ سلطان سے شیخ کے جمع شدہ قرضوں کا بار چُکانے کے لیے کہے۔ وہ واپس آیا تو شیخ کا انتقال ہوچکا تھا۔ دُوست بُوسعد بغداد چلا گیا اور وہاں اس نے مَیہَنہ کی خانقاہ کی ایک شاخ کھول دی۔ ابن المُنوَّر کے زمانے تک اس کا خاندان بغداد میں شیخ الشُّیُوخ کے رتبے پر فائز تھا، مگر اس شاخ کے بعد کے حالات کا ہمیں کچھ علم نہیں (اسرار التوحید، ص ۲۹۴-۳۰۰).

مآخذ: اُن کے علاوہ جو مقالے میں مذکور ہوچکے ہیں: (۱) السُبکی: الطبقات الشافعیۃ الکبری، ۳: ۱۰؛ (۲) R. A. Nicholson: *Studies in Islamic Mysticism*، کیمبرج ۱۹۲۱ء، ص ۱-۷۶.

(H. RITTER رِٹّر)

---

* **ابوسعید الجنّابی:** رک بہ الجَنّابی.

---

* **ابوسُفیان:** مقبول عام روایت کے مطابق ابوسُفیان زمانۂ قبل از اسلام میں جبل الزّاویہ میں البارہ کا بادشاہ تھا، جو قدیم اپامیہ (Apamea) کے شمال اور مَعَرَّۃ النُّعمان کے مغرب میں واقع ہے۔ البارہ کے کھنڈر اس علاقے میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ جس دَور میں یہ شہر، جو سُریانی زبان میں کَفرُاذِبا رُتا کہلاتا تھا، اپنی خوشحالی کے معراجِ کمال پر تھا وہ پانچویں صدی سے لے کر ساتویں صدی عیسوی تک کا زمانہ ہے۔ اسلام کی عمل داری میں یہ شہر ایک عرصے تک خوشحال رہا۔ اس میں یہودیوں کی ایک بستی بھی تھی۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں یہ مقام جنگ و جدال کا ایک مرکز بن گیا۔ غالباً اسی زمانے میں شہر کے شمال میں مسلمانوں کا ایک قلعہ بنا، جو آج کل قلعہ ابوسُفیان کے نام سے موسوم ہے (البارہ کے لیے دیکھیے (۱) ابن خُرَّ دَاذبہ، ص ۷۶؛ (۲) الیعقوبی، ص ۳۲۴؛ (۳) یاقوت، ۱: ۴۶۵؛ (۴) Littmann (دیکھیے مآخذ)؛ (۵) M. van Berchem: *Voyage en Syrie*، ۱: ۱۹۶-۲۰۰؛ (۶) R. Dussand: *Topogr. hist. de la Syrie*، ص ۱۸۱ و اشاریہ). [اس سلسلے میں ایک افسانہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ] یہ قلعہ زمانۂ قبل از اسلام میں تعمیر ہوا تھا اور اس میں ایک یہودی بادشاہ ابوسفیان حکمران تھا۔ [حضرت] ابوبکر صدیق[رض] کے بیٹے عبدالرحمٰن اس کی بیٹی لُہَیفہ پر عاشق ہوگئے اور اسی قلعے میں مقیم تھے کہ ان کے والد [حضرت ابوبکرؓ] نے انھیں اسلام لانے کی دعوت دی۔ عبدالرحمٰن اور لُہَیفہ دونوں مسلمان ہوگئے اور قلعے سے بھاگ نکلے۔ ابوسفیان نے ان کا تعاقب کیا۔ ان کے درمیان جو جنگ ہوئی اس میں اسلام کے غازی بالخصوص [حضرت] عمر[رض] اور [حضرت] خالد[رض] بن الولید آپہنچے، جنھیں [حضرت] جبرائیل[ع] نے عبدالرحمٰن اور لُہَیفہ کی مدد کے لیے بلایا تھا۔ [حضرت] عمر[رض] نے ابوسَفیان کو قتل کردیا اور سارا علاقہ مسلمانوں کے زیرِنگین آگیا.

مآخذ: (۱) E. Littmann: *Semitic Inscriptions*، ص ۱۹۱، ۱۹۳ ببعد.

(E. LITTMANN)

---

* **ابُوسُفیان[رض] بن حَرب بن اُمَیّہ:** قریش کے ایک کنبے ''عبدشمس'' کے فرد، جو مکّے کے ایک ممتاز تاجر اور سرمایہ دار تھے (انھیں [حضرت] رسولِ [اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم] کے عم زاد بھائی ابوسُفیان بن الحارث بن عبدالمطلب سے ملتبس نہ کرنا چاہیے)۔ ان کا نام صَخر تھا اور ان کی کُنیت بعض اوقات ابوحَنظَلہ بیان کی جاتی ہے۔ [ان کی ولادت عام الفیل سے دس سال قبل مکّے میں ہوئی]۔ عبدشمس کا کنبہ پہلے مکّے کے سیاسی حِلف معروف بہ ''مُطیَّبُون'' میں شامل تھا (بنی ہاشم کا کنبہ بھی اسی حِلف میں شامل تھا)، لیکن [حضرت] رسول [اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم] کی بعثت کے وقت وہ اس حِلف کو چھوڑ کر بعض معاملات میں حِلفِ مخالف، یعنی مخزُوم، جُمَح، سَہم وغیرہ، کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے لگا تھا۔ [حرب فُجار میں ابوسفیان اپنے باپ کے جھنڈے تلے لڑے تھے (المحبّر، ص ۱۶۹ ببعد۔)] خاندان عبدشمس کا سردار ہونے کی حیثیت سے ہجرت سے پہلے کے سالوں میں ابوسفیان [حضرت] رسول اللہ [صلّی اللہ علیہ وسلّم] کی مخالفت میں شریک تھے، لیکن ان کی مخالفت اتنی شدید نہ تھی جتنی کہ ابوجہل کی۔ متعدّد مواقع پر وہ بذاتِ خود قافلوں کی قیادت کرتے تھے، بالخصوص ۲ھ/ ۶۲۴ء میں، جب کہ انھیں کی قیادت میں ایک ہزار اونٹوں کا وہ قافلہ شام سے مکے کو لَوٹ رہا تھا، جس پر مسلمانوں کی طرف سے انھیں حملے کا خیال پیدا ہوا۔ اہلِ مکّہ نے ابوسُفیان کی مدد کی درخواست پر ایک ہزار نفوس کا لشکر ابوجہل کی سرکردگی میں بھیجا۔ ابوسفیان قافلے کو اپنی ہشیاری اور مستعدی کی بدولت مسلمانوں کے ہاتھوں سے بچا لے گئے، لیکن ابوجہل مسلمانوں کے ساتھ لڑنے پر مُصِرّ تھا؛ چنانچہ وہ اہلِ مکّہ پر جنگِ بدر کی تباہی لانے کا موجب بنا۔ ابوسفیان کے بیٹوں میں سے حَنظَلہ اس جنگ میں مارا گیا اور عَمرو گرفتار ہوا، جو بعد میں رہا کردیا گیا۔ ابوسفیان کی بیوی ہِند کا باپ عُتبہ بھی مارا

گیا۔ جنگِ بدر کا انتقام لینے کے لیے اہلِ مکہ نے جو تیاریاں کیں اُن کے نگران بظاہر ابوسفیان ہی تھے اور اس کثیر لشکر کی جو ۳ھ/ ۶۲۵ء میں مدینے پر بھیجا گیا، سپہ سالاری غالباً موروثی حق (قیادۃ) کی بنا پر انھیں کو دی گئی۔ ابوسفیان جانتے تھے کہ جنگِ اُحد کا نتیجہ قریش کے لیے تسلی بخش نہیں نکلا، لیکن صفوان بن اُمیّہ جُمَحی نے ممکن ہے حسد کی وجہ سے انھیں مدینے کی خاص بستی پر حملہ کرنے سے روک دیا۔ ابوسُفیان نے اس بڑے وفاق (الاحزاب) کی تنظیم بھی کی تھی جس نے ۵ھ/ ۶۲۷ء میں مدینے کا محاصرہ کیا تھا۔ اس مہم کی ناکامی سے شاید ابوسُفیان کی ہمت ٹوٹ گئی؛ کم از کم مکے میں رسول [اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم] کی مخالفت کی آئندہ قیادت مقابل جتھے کے رہنماؤں صَفْوان بن اُمیّہ، سُہَیل بن عمرو اور عِکْرِمہ ابن ابی جہل کے ہاتھوں میں منتقل ہوگئی۔ صلح حدیبیہ کے سلسلے میں ابوسُفیان کا نام کہیں مذکور نہیں۔ ۸ھ/ ۶۳۰ء میں قریش [اور ان کے] حلیفوں نے علی الاعلان عہد شکنی کی [اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی پیش کردہ شرائط کے جواب میں معاہدۂ حدیبیہ کی تنسیخ کا اعلان کر دیا۔ بعد ازاں جب قریش کو اپنے اس فیصلے پر ندامت محسوس ہوئی تو انھوں نے ابوسُفیان کو حضورؐ کی خدمت میں بھیجا تا کہ معاہدے کی تجدید ہو جائے، لیکن ابوسفیان کو اس کوشش میں کامیابی نصیب نہ ہوئی اور وہ مکّے واپس آ گئے]۔ یہ یقینی بات ہے کہ جب رسول [اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم] نے اس کے بعد جلد ہی مکّے پر چڑھائی کی تو ابوسفیان اور حکیم بن حزام نے شہر سے باہر آ کر (اور علی الاعلان مسلمان ہو کر) اطاعت قبول کر لی۔ [بارگاہ رسالت سے] اعلان کر دیا گیا کہ جو [شخص ہتھیار ڈال دے گا یا] ابوسُفیان کے ہاں پناہ لے گا [یا دروازہ بند کر لے گا یا خانۂ کعبہ میں داخل ہو جائے گا] اسے امن دیا جائے گا۔ اس طرح مکّے کی پُرامن تسخیر [عمل میں آئی]۔ ازاں بعد ابوسفیان نے غزوۂ حُنین اور پھر محاصرۂ طائف میں شرکت کی، جس میں ان کی ایک آنکھ جاتی رہی۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیگر اہلِ مکّہ کی طرح وہ بھی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ ہَوازِن اور ثَقِیف کے قبائل [ہی کو قریش کے بعد عرب کی سیادت کا دعوٰی ہے۔ آنحضرت [صلی اللہ علیہ وسلم] نے ثقیف کا محاصرہ اٹھا کر مراجعت فرمائی اور جعرانہ پہنچ کر مالِ غنیمت تقسیم فرمایا۔ اس موقع پر مکے کے اکثر نومسلم رؤسا کو، جن میں ابوسفیان بھی شامل تھے،] گرانقدر عطیات ملے۔ جب اہلِ طائف نے ہتھیار ڈالے تو ابوسفیان نے، جن کے اس شہر سے خاندانی اور کاروباری تعلقات رہے تھے، اللّات کا بُت توڑنے میں مدد دی۔ روایت ہے کہ انھیں نَجْران اور شاید حجاز کا بھی والی مقرّر کیا گیا تھا، مگر یہ امر متنازعہ فیہ ہے کہ یہ تقرّر خود آنحضرت [صلّی اللہ علیہ وسلّم] نے کیا تھا یا [حضرت] ابوبکر [صدیقؓ] نے۔ اگر یہ بات درست ہے کہ وہ [حضرت] رسول [صلّی اللہ علیہ وسلّم] کی وفات کے وقت مکے میں موجود تھے اور انھوں نے [حضرت] ابوبکرؓ کے خلاف تقریر کی تھی تو وہ اس وقت نَجْران کے والی نہیں ہو سکتے؛ لیکن ممکن ہے کہ یہ مزعومہ تقریر ابوسفیان کے متعلق دوسرے بیانات کی طرح اسی مخالفانہ تبلیغ کا حصہ ہو جو بنو اُمیّہ کے خلاف کی جاتی رہی ہے۔ جنگ یَرمُوک (۱۵ھ/ ۶۳۶ء) میں وہ حاضر و شامل تھے، لیکن [بظاہر] اس لڑائی میں انھوں نے جوانوں کو ہمت دلانے سے زیادہ اَور کچھ کام نہیں کیا ہوگا، کیونکہ اس وقت ان کی عمر ستّر سال کے قریب تھی۔ [اس جنگ میں ان کی دوسری آنکھ بھی جاتی رہی۔] کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ۳۲ھ/ ۶۵۳ء میں وفات پائی جب کہ ان کی عمر ۸۸ سال کی تھی اور ان کے بیٹوں میں سے یزید نے ۱۸ھ/ ۶۳۹ء میں فلسطین میں ایک مسلمان سپہ سالار کی حیثیت سے وفات پائی اور معاویہؓ بنو اُمیّہ کے پہلے خلیفہ بنے۔

مآخذ: (۱) ابن ہشام، واقدی، ابن سعد، طبری، دیکھیے اشاریات؛ (۲) ابن حجر: الاصابۃ، ۲:۴۷۷-۴۸۰؛ (۳) ابن الأثیر: اُسد، ۳:۱۲-۱۳ و ۵:۳۱۶؛ [(۴) الأغانی، ۶:۸۹؛ (۵) ابن عساکر، ۶:۳۸۸؛ (۶) نکت الھمیان، ص ۱۷۲؛ (۷) المُحبّر، ص ۲۴۶؛ (۸) البدء و التاریخ، ۵:۱۰۷؛] (۹) Caetani: *Annali*، ج ۱ و ۲ (حصہ اوّل)۔

(W. MONTGOMERY WATT)

ابوسَلَمہ: حَفْص بن سلیمان [الہمدانی] الخلّال، [بنو عبّاس کا] وزیر، [بلکہ * کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے عباسی خلیفہ کا سب سے پہلا وزیر یہی تھا]۔ وہ کوفے کا ایک آزاد شدہ غلام تھا اور اسے ۱۲۷ھ/ ۷۴۴-۷۴۵ء میں عباسیوں کے ایک بڑے داعی کے طور پر وسیع اختیارات دے کر خراسان بھیجا گیا۔ اس نے اس جنگی بغاوت میں حصّہ لیا جس نے بنو اُمیّہ کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا اور اسے کوفے کا والی بنا دیا گیا۔ انقلاب کے آخری مرحلے پر وہ علویوں کی طرف جُھک گیا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایک علوی خلافت قائم کرنے کے لیے کچھ کوشش بھی کی۔ یہ شاید حقوقِ ''اہلِ بیت نبوی'' کے بارے میں اس ابہام کا نتیجہ تھا جسے عَمداً دعوت اِنقلاب میں شامل کر دیا گیا تھا۔ بہرکیف السفّاح خلیفہ منتخب ہو گیا اور ابوسلمہ نے اس کی بیعت کر لی (۱۳۲ھ/ ۷۴۹ء)۔ خلیفہ نے ابوسلمہ کو وزیر بنا دیا، لیکن اس کے متعلق دل میں شُبہات بدستور رہے؛ چنانچہ اسی سال اسے برطرف کرنے کی تدابیر سوچنے لگا۔ اس خوف سے کہ شاید خراسان کا طاقتور والی ابومسلم، جو دعوت میں ابوسَلَمہ کا ساتھی تھا، اس کے ساتھ متفق الرائے ہو اور اس کی برطرفی سے چڑ جائے، خلیفہ نے اپنے بھائی ابوجعفر (المنصور) کو ابومسلم سے مشورہ کرنے کے لیے بھیجا۔ ابومسلم نے اس تجویز کی راہ میں کسی قسم کی مشکلات پیدا نہ کیں، بلکہ ابوسَلَمہ کو قتل کرنے کے لیے خود ایک اجیر [الضبی] قاتل بھیج دیا، [جس نے اسے ۱۳۳ھ/ ۷۵۰ء میں قتل کر دیا] ابوسَلَمہ کا قتل بعد میں خوارج کے سر تھوپ دیا گیا۔ ابوسَلَمہ کو تعلیم یافتہ اور قابل شخص بیان کیا گیا ہے اور عباسیوں کی طرفداری میں اس کی خدمات مسلّم ہیں۔ تاہم مآخذ کی متفقہ شہادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں خلیفہ کے شبہات درست تھے۔

مآخذ: (۱) الدِینَوَری: الاخبار الطِّوال (طبع Guirgass)؛ (۲) الیعقوبی؛

(۳) الطبری؛ (۴) المسعودی: مُروج، بمد اشاریات؛ (۵) ابن خلّکان، شمارہ ۲۰۰؛ (۶) ابن القِفْطِی: فخری (طبع Dérenbourg)، ص ۲۰۵ - ۲۱۰؛ [(۷) ابن کثیر: البدایة و النهایة، ۱۰:۵۵؛ (۸) ابن عساکر: تهذیب، ۴:۷۷ ۳؛ (۹) ابن العماد: شذرات الذهب، ۱:۱۹۱؛] (۱۰) S. Moscati، در *Rend. Linc.*، ۱۹۴۹ء، ص ۳۲۴-۳۳۱.

(S. MOSCATI)

---

* **ابوسُلَیمان المَنْطِقی**: محمد بن طاہر بن بہرام السِّجستانی، فلسفی، جو ۳۰۰ھ/ ۹۱۲ء کے قریب پیدا ہوا اور ۳۷۵ھ/ ۹۸۵ء میں انتقال کر گیا۔ وہ متّی بن یُونُس (م ۳۲۸ھ/ ۹۳۹ء) اور یحییٰ بن عدی (م ۳۶۴ھ/ ۹۷۴ء) کا شاگرد تھا اور بغداد میں رہتا تھا. (عَضُد الدولہ اس کا مربّی تھا، جس کے نام سے اس نے اپنے بعض رسائل کا انتساب کیا ہے) اور بغداد کے فلسفیوں میں اُسے ممتاز مقام حاصل تھا۔ اس کا نظامِ فلسفہ اپنے ماحول کے اکثر دیگر افراد کے فلسفے کی طرح نو افلاطونیت (اشراقیت) کا گہرا رنگ لیے ہوئے ہے۔ اس کی تعلیم کے ماحصل کے لیے ہم زیادہ تر ابوحیّان التوحیدی [رک بآں] کے مرہونِ منّت ہیں، جس کی تصانیف بالخصوص المُقابَسات اور الاِمتاع والمُؤانسة حکمت، فلسفہ اور دیگر موضوعات پر ابوسلیمان کے ملفوظات و اقوال سے بھری پڑی ہیں، اگرچہ ان کا اندازِ بیان عام طور پر پیچیدہ اور مغلق ہے۔ ابوسلیمان کے مختصر رسائل میں سے چند ایک مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہیں۔ یونان اور اسلام کے حکما کی تاریخ پر اس کے رسالے صِوان الحِکمَة کا صرف خلاصہ چند مخطوطات کی صورت میں موجود ہے (قب M. Plessner، در *Islamica*، ۱۹۳۱ء، ص ۵۳۴-۵۳۸؛ اضافہ کریں Brit. Mus.، شمارہ ۹۰۳۳.Bodl. Marsh Or؛ ۵۳۹ کو کاٹ دیں؛ لائڈن، شمارہ ۱۳۳، الغَضَنْفر التبریزی کے مختصر تر خلاصے پر مشتمل ہے)۔ الشہرستانی نے الملل و النحل میں حکمائے یونان کا جو حال لکھا ہے اس کے مآخذ میں یہ رسالہ صِوان الحِکمة بھی شامل تھا (قب P. Kraus، در *BIÉ*، ۱۹۳۷ء، ص ۲۰۷= *IC*، ۱۹۳۸ء، ص ۱۴۶)۔ تاریخِ فلسفہ کے بارے میں معلومات کے لیے بعض دوسرے مصنّفوں نے بھی ابوسلیمان سے اقتباسات کیے ہیں، یعنی ابن النّدیم نے (جو اس کا شاگرد تھا)، الفہرست، ص ۲۴۱، ۲۴۳، ۲۴۸؛ ابن مَطْران نے، دیکھیے P. Kraus: *Jābir Ibn Ḥayyān*، ۱: Ixiii؛ ابن ابی اُصَیْبِعَہ نے، ۱:۹، ۱۵، ۵۷، ۱۰۴، ۱۸۶-۱۸۷.

مآخذ: (۱) الفہرست، ص ۲۶۴، ۳۱۶؛ (۲) ابوشُجاع: ذیل تجارب الامم (طبع امدروز Amedroz و مرجلیوث Margoliouth)، ص ۷۵-۷۷؛ (۳) البیہقی: تتمۂ صِوان الحِکمة (طبع محمد شفیع)، ص ۴۷-۷۵؛ (۴) یاقوت: ارشاد الاریب، ۲: ۸۹ و ۳: ۱۰۰ و ۵: ۳۶۰، ۳۹۸ (بہ تتبع ابوحیّان)؛ (۵) صاعد الاندلُسی، ص ۸۱؛ (۶) ابن القِفْطی، ص ۲۸۲ - ۲۸۳؛ (۷) ابن ابی اُصَیْبِعَہ، ۱: ۳۲۱ - ۳۲۲؛ (۸) براکلمان (Brockelmann)، ۱: ۲۳۶ و تکملہ، ۱: ۳۷۷؛ (۹) محمد بن عبدالوہّاب قزوینی: شرح حال ابوسلیمان منطقی سجِستانی، (طبع Société des Études Iranniennes، عدد ۵)، Chalons-sur-Saone ۱۹۳۳ء = بیست مقالہ، تہران ۱۹۳۴ء، ص ۹۴ ببعد.

(S. M. STERN)

---

* **ابوشامہ**: شہاب الدین ابوالقاسم [وابومحمد] عبدالرحمٰن بن اسمٰعیل المَقْدِسی، ایک عرب مؤرّخ، جو ۲۳ ربیع الثانی ۵۹۹ھ/ ۱۰ جنوری ۱۲۰۳ء کو دمشق میں پیدا ہوا۔ اس کی ساری زندگی دمشق ہی میں بسر ہوئی، اس کے سوا کہ وہ حصولِ تعلیم کے لیے ایک سال مصر میں رہا، چودہ دن کے لیے القُدس گیا اور دو مرتبہ حج کے لیے حجاز۔ اسے اپنی وفات، بتاریخ ۱۹ رمضان المبارک ۶۶۵ھ/ ۱۳ جون ۱۲۶۸ء، سے صرف پانچ سال پہلے دمشق کے المدرسة الرُّکنیّہ اور المدرسة الاشرفیہ میں مدرّسی کا عہدہ ملا تھا۔ اپنے زمانے کے اکثر و بیشتر علما کی طرح اس نے سنّی عقائد کی بنیاد پر مختلف علوم کی تعلیم پائی؛ لہٰذا اس کی تصانیف میں متعدّد موضوعات سے بحث ملتی ہے، لیکن اس کی شہرت تاریخی کتابوں کی وجہ سے ہے.

اس کی اہم تصانیف حسبِ ذیل ہیں: -

(۱) کتاب الرَّوْضَتَین فی اخبار الدَولتَین، نورالدّین اور صلاح الدّین کی تاریخ (قاہرہ ۱۲۸۸ھ، ۱۲۹۲ھ؛ اقتباسات مع فرانسیسی ترجمہ از باربیہ دمینار (Barbier de Meynard)، در *Recueil des historiens des croisades, Hist.Or.*، ج ۴ و ۵، پیرس ۱۸۹۸ء و ۱۹۰۶ء؛ ترجمہ جرمن زبان میں، جو بے احتیاطی سے کیا گیا ہے اور نامکمل ہے، از E. P. Goergens، بعنوان *Buch der beiden Garten*، ۱۸۷۹ء)۔ یہ تاریخ ہم عصر اسناد سے ماخوذ ہے اور اس میں عمادالدین الکاتب کی البَرق الشامی، ابن ابی طیّ کی سیرة صلاح الدین اور القاضی الفاضل کے متعدّد رسائل جیسی اہم تصانیف کے متون جزوی طور پر محفوظ ہیں۔ واقعات تاریخ وار ضبطِ تحریر میں لائے گئے ہیں اور بیان کی تائید میں دستاویزی شہادتیں زیادہ تر الفاضِل اور العماد سے لے کر پیش کی گئی ہیں۔ اس کتاب میں اقتباس دیتے وقت وہ اپنے مآخذ کا نام لکھتا ہے اور العماد کے سوا انھیں کے الفاظ نقل کر دیتا ہے.

(۲) الذَیل علی الروضتین، مذکورۂ بالا کتاب کا ذیل۔ اس کتاب کے پہلے حصّے میں وہ زیادہ تر سِبط ابن الجوزی کی مِرآة الزمان سے اخذِ مطالب کرتا ہے۔ آخری حصّے میں وہ خود واقعات کا عینی شاہد ہے۔ یہ کتاب تاریخ سے زیادہ سِیَر پر مشتمل ہے، بالخصوص دوسرے حصے میں اور کتاب الروضتین ایسی اہم نہیں (مطبوعۂ قاہرہ ۱۹۴۷ء، بعنوان تراجم رجال القَرنین السّادس و السّابع؛ اقتباسات فرانسیسی ترجمے کے ساتھ، در *Recueil des historiens des croisades*).

(۳) تاریخِ دمشق (دونسخوں میں)، اسی نام کی ابن عساکر کی نہایت ضخیم کتاب کا خلاصہ ہے (Ahlwardt: *Verz. arab. Hs. Berlin*، شمارہ ۹۷۸۲).

(۴) [ابرز المعانی] قصیدۃ الشاطِبِیَّۃ کی شرح (مطبوعۂ قاہرہ).

(۵) اپنے استاد عَلَم الدین السَّخَاوی (م ۶۴۳ھ/ ۱۲۴۵ء) کی سات نعتیہ نظموں کی شرح، مخطوطہ (پیرس، شمارہ ۱۴۱۳، ۱) کی شکل میں باقی ہے.

[(۶) الباعث علی انکار البدع والحوادث، مصر ۱۳۱۰ھ.

(۷) مختصر کتاب المؤمل للردّ الی الامر الاوّل، چھپ چکی ہے.

(۸) المرشد الوجیز، مخطوطے کی شکل میں مکتبۃ البدیریہ، بیت المقدس میں موجود ہے].

اس کی دیگر تصانیف، جو مختلف موضوعات پر لکھی گئی تھیں، ضائع یا ناپید ہوچکی ہیں۔ بعض سوانح نگار کہتے ہیں کہ وہ تصانیف اس کے کتب خانے کے ساتھ آگ کی نذر ہوگئی تھیں.

مآخذ: (۱) الکتبی: فوات، ۱:۲۵۲؛ (۲) السیوطی: طبقات الحفّاظ، ۱۹:۱۰؛ [(۳) وہی مصنف: بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۹۷؛] (۴) الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، حیدرآباد، ۴:۲۵۱؛ [(۵) السبکی: طبقات الشافعیۃ، ۵:۶۱؛] (۶) المقریزی: خِطَط، ۱:۴۶؛ [(۷) المقّری: نفح الطیب، ۱:۴۶؛ (۸) ابن کثیر: البدایۃ و النہایۃ، ۱۳:۲۵۰؛ (۹) غایۃ النہایۃ، ۱:۳۶۵؛ (۱۰) النعیمی، ۱:۲۳؛] (۱۱) *Orientalia*، طبع جوئنبول (Juynboll)، ۲:۲۵۳؛ (۱۲) براکلمان (Brockelmann)، ۱:۳۸۶ وتکملہ، ۱:۵۵۰.

(حلمی احمد)

---

* **ابوشُجاع:** احمد بن حَسَن (یا حُسَین) بن احمد، ایک مشہور شافعی فقیہ اور مفتی، جس کا خاندان اصفہان سے آیا تھا۔ اس کا باپ عَبّادان میں اور وہ خود ۴۳۴ھ/ ۱۰۴۲-۱۰۴۳ء میں بصرے میں پیدا ہوا۔ بصرے ہی میں اس نے چالیس سال سے زیادہ مدّت تک فِقہ شافعی کی تعلیم دی۔ وہ ۵۰۰ھ/ ۱۱۰۶-۱۱۰۷ء میں زندہ تھا، لیکن اس کی تاریخ وفات معلوم نہیں۔ ایک زمانے میں وہ قاضی بھی مقرّر ہوا تھا۔ اس نے فِقہ شافعی کا ایک چھوٹا سا خلاصہ تصنیف کیا، جس کا نام الغایۃ فی الاِختصار یا المختصر یا التقریب ہے۔ اس کتاب سے شافعی مذہب کی ادبی روایات کا ایک بڑا سلسلہ شروع ہوگیا اور اس پر ساتویں صدی ہجری/ تیرھویں صدی عیسوی سے لے کر تیرھویں صدی ہجری/ انیسویں صدی عیسوی تک بہت سی شرحیں اور حواشی لکھے گئے، جن میں سے اکثر چھپ چکے ہیں۔ اس کا متن پہلی بار S. Keyser کے (ناقابلِ اعتماد) ترجمے کے ساتھ، بعنوان *Précis de jurisprudence musulmane*، لائڈن میں ۱۸۵۹ء میں چھپا [بمبئی ۱۲۹۷ھ]؛ (۲) متن کا ترجمہ، از G. H. Bousquet: *Abrégé de la loimusulmane*، جو *Revue Algérienne* ۱۹۳۵ء، سے لے کر جداگانہ بھی طبع ہوچکا ہے؛ ابن قاسم الغَزّی (م ۹۱۸ھ/ ۱۵۱۲ء) کی شرح، بعنوان فتح القریب، کی طبع مع ترجمہ ناقص، از L.W.C van den Berg، لائڈن ۱۸۹۵ء (ترجمے کی بعض تصحیحات، در Bousquet: کتاب التنبیہ، Bibliothéque de la Faculté de Driot de l'Université d'Alger، ج ۲، ۱۱، ۱۳، ۱۵، الجزائر ۱۹۴۹ - ۱۹۵۲ء؛ ابراہیم الباجُوری (م ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۱ء) کے حواشی کا جزوی ترجمہ، جسے متن کے متعلقہ ابواب کے ساتھ زخاؤ (E. Sachau) نے شائع کیا، بنام *Muhammedanisches Recht*، برلن ۱۸۹۷ء.

مآخذ: (۱) یاقوت: [ارشاد الاریب،] ۳:۵۹۸ ببعد؛ (۲) تاج الدین السُّبکی: طبقات الشافعیۃ، قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ۴:۳۸؛ (۳) جوئنبول (Juynboll): *Handleiding*، ص ۳۷۴ ببعد؛ (۴) براکلمان (Brockelmann)، ۱:۴۹۲ ببعد وتکملہ، ۱:۶۷۶ ببعد.

(J. SCHACHT)

---

* **ابوشجاع محمد بن الحسین:** رک بہ الرُّوذْرَوَرِی.

---

* **ابوالشَّمَقْمَق:** ابومحمد مروان بن محمد [الجَعْدی، اس کی کنیت ابومحمد تھی، مگر وہ ابوالشَّمَقْمَق کے نام سے مشہور ہوا (ابن خلّکان، ۲:۲۸۶)]، ابتدائی عہدِ عبّاسی کا [کوفی] شاعر، جو بصرے کے محلّہ بنوسعد میں بنوامیّہ کے [آخری خلیفہ کے] مولیٰ کی حیثیت سے پیدا ہوا۔ اس کی تاریخِ ولادت کہیں مذکور نہیں۔ اس کے لقب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ناک لمبی اور منہ بہت چوڑا تھا [لسان العرب کی رو سے الشَّمَقْمَق بمعنی طویل یا طویل جسم یا نشیط یعنی چست ومستعد ہے]۔ وہ ہارون الرشید کی تخت نشینی (۱۷۰ھ/ ۷۸۶ء) سے خاصے عرصے پہلے نقل مکانی کرکے بغداد جا چکا ہوگا۔ ابن المُعتزّ نے طبقات الشعراء المُحْدَثِین، طبع عباس اقبال، ص ۵۵، میں اس کی تاریخِ وفات تخمیناً ۱۸۰ھ/ ۷۹۶ء بتائی ہے [مگر خزانۃ الادب، ۳:۵۴، میں مذکور ہے کہ اس نے یزید بن مَزْیَد الشیبانی (م ۱۸۵ھ) کا مرثیہ لکھا اور بقول ابن المعتزّ خالد بن یزید بن مَزْیَد کو مامون نے والیِ موصل مقرر کیا تو ابوالشَّمَقْمَق اس کے ساتھ گیا تھا۔ عباس اقبال نے حواشیِ طبقات الشعراء، ص ۱۵، میں ابوالشمقمق کی تاریخِ وفات ۲۰۳ھ کے بعد قرار دی ہے اور متن کی عبارت کو الحاقی تصوّر کیا ہے]۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اپنے عہد کے دیگر شعرا کی طرح ابوالشمقمق کو کبھی کبھی کوئی سرکاری کام سپرد ہوجاتا تھا؛ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدینہ سابُور کا خراج خلیفہ کی بارگاہ تک پہنچانے پر مامور تھا؛ تاہم بحیثیت مجموعی وہ اپنی غیر یقینی معاش مدحیہ اور ہجویہ اشعار کے ذریعے حاصل کرتا تھا۔ متعدّد حکایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مقام اپنے وقت کی دنیاے ادب میں ایک حاشیہ نشین کا

تھا۔ ابن عبد ربّہ: العقد الفرید، قاہرہ ۱۳۵۳ھ/ ۱۹۳۵ء، ۴:۲۵۵ [طبع ۱۳۲۱ھ، ص۲۸۱] اسے اچھے لیکن بدنصیب طبّاعوں میں شمار کرتا ہے [''کان ادیبًا ظریفًا محارفًا و کان صعلوکًا مُتَبَرِّمًا بالناس''۔ العقد میں ہے کہ اس نے مروان بن ابی حفصہ شاعر کی مدح بھی لکھی تھی]۔ اس کی جدّت پسندی، جو نقل (Parody) کے لیے کارآمد تھی اور جس نے شاید عربی شاعری کو اس 'گربۂ ناطق' کا مضمون دیا جو اپنے افلاس زدہ مالک کو چھوڑ کر چلی گئی تھی، صلہ اور انعام حاصل کرنے میں ناکام رہی اور مستقل و مسلسل شکستہ دلی اسے اکثر مبتذل اور سوقیانہ کلام لکھنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ [ابن الندیم، ص ۱۶۳، نے اس کے کلام کا حجم ستّر ورق بتایا ہے]۔

مآخذ: (۱) G. E. von Grunebaum نے *Orientalia*، ۱۹۵۳ء، ص ۲۶۲ - ۲۸۳، میں اس کے قطعات کا مجموعہ تنقیدی تمہید اور سوانح حیات کے ساتھ شائع کیا ہے؛ (۲) المرزبانی، ص ۳۹۷؛ (۳) الأغانی، ۳:۱۹۴؛ (۴) تاریخ بغداد، ۱۳:۱۴۶]۔

(G. E. Von Grunebaum)

---

* **ابوالشَّوْق:** رک بہ بنوعَنّاز۔

---

* **ابوشَہْر:** رک بہ بُوشَہْر۔

---

* **ابوالشِّیْص:** محمد (بن عبداللہ) بن رَزِین الخُزاعی، ایک عرب شاعر، جس نے ۲۰۰ھ/ ۹۱۵ء کے قریب وفات پائی۔ اپنے ابنِ عم دِعْبِل [رک بآں ابن رَزِین] بن علی کی طرح وہ بھی ہارون الرشید کے متوسّلین میں سے تھا، جس کی شان میں اس نے مدحیہ قصائد اور پھر مرثیے بھی لکھے۔ بعد میں وہ الرَقّہ چلا گیا اور وہاں امیر عُقْبہ بن الاَشْعَث کا قرب حاصل کر لیا، تا آنکہ ۱۹۶ھ/ ۸۱۱ء تک وہ اس کا ندیم بھی تھا اور درباری شاعر بھی۔ اس کی شاعری کے ان چند اجزا سے جو محفوظ ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ابوالشِّیص نے اپنے قصائد اور شراب اور شکار کی نظموں میں کوئی جدّت پیدا نہیں کی، گو اس کے معاصر شعرا اس کی نظموں کو قدردانی کی نگاہوں سے دیکھتے تھے، بالخصوص ابونواس، جس نے اس کے مضامین کے سرقے میں بھی تأمّل نہیں کیا (دیکھیے مثلاً ابن المُعْتَزّ: طبقات الشعراء، ص ۲۷)۔ اپنی عمر کے آخری حصے میں اس نے پیرانہ سالی کے ضعف و اضمحلال کے بارے میں جو نوحے اس وقت لکھے ہیں جب اس کی بینائی جواب دے چکی تھی وہ بڑے قابلِ قدر ہیں، کیونکہ ان سے اس کے حقیقی جذبات و احساسات کا اظہار ہوتا ہے [مثلاً اس کا قصیدہ

ابقی الزمان به ندوب عضاض
و رمی سواد قرونه ببیاض

اور

خلع الصبا عن منکبیه مشیب
فطوی الذوائب رأسه المخضوب

ابن المُعْتَزّ: طبقات الشعراء، ص ۲۷ ببعد]۔ اسی طرح جب وہ خود اپنی یا ان شاعروں کی ہنسی اُڑاتا ہے جو صحرائی شاعری کی نقّالی کرنا چاہتے ہیں (مثلاً ابن قُتَیبہ: کتاب الشعر، ص ۵۳۶، غُراب البَیْن کے متعلق) تو اس کا کلام لطفِ مزاح سے خالی نہیں ہوتا۔

مآخذ: ابوالشِّیص کے کلام کے اجزا اور اس کے متفرّق اشعار متعدّد کتابوں میں موجود ہیں، مثلاً (۱) ابن قتیبہ: کتاب الشعر، ص ۵۳۵ - ۵۳۹؛ (۲) الأغانی، طبع اوّل، ۵:۳۶ و ۱۵:۱۰۸ - ۱۱۳؛ (۳) الجاحِظ: الحَیَوان، طبع دوم، ۳:۵۱۸ و ۴:۳۴۵ و ۵:۱۸۴؛ (۴) نقلی جاحِظ: محاسِن (طبع van Vloten)، ص ۶۸؛ (۵) ابن المُعْتَزّ: طبقات الشعراء، ص ۲۶ - ۳۳؛ (۶) البَیْہَقی: محاسِن، ص ۳۵۸؛ (۷) الطبری، ۳:۷۶۳؛ (۸) ابن الأثیر، ۶:۱۳۵؛ (۹) الجَہْشیاری: وزراء، ص ۹۶ ب؛ (۱۰) الخطیب: تاریخ بغداد، ۵:۴۰۱ - ۴۰۲؛ (۱۱) الصَفَدی: نَکْتُ الہِمیان، ص ۲۵۷ - ۲۵۸؛ (۱۲) ابن خلّکان، ۴:۲۳۲؛ (۱۳) الکُتُبی: فوات، ۲:۲۸۱ ببعد؛ (۱۴) عسکری: دیوان المعانی، قاہرہ ۱۳۵۲ھ، ۱:۲۵۵ و ۲:۱۲۳، ۱۹۸ - ۱۹۹، ۲۵۲؛ نیز دیکھیے (۱۵) O. Rescher: *Abriss*، ۲:۲۸-۲۹؛ (۱۶) براکلمان (Brockelmann)، ۱:۸۳ و تکملہ، ۱:۱۳۳۔

(Ch. Pellat و A. Schaade)

---

* **ابو الصَّلْت اُمیّہ:** بن عبدالعزیز بن ابی الصَّلْت الاندلُسی، ۴۶۰ھ/ ۱۰۶۷ء میں دانیہ (Denia) میں پیدا ہوا۔ وہ قاضی [ابوالولید] الوَقّشی کا شاگرد ہے اور اس کی معلومات جملہ علوم و فنون پر حاوی تھیں۔ [اس نے شعر و ادب، طب، فلسفہ، موسیقی اور دوسرے علوم میں کمال پیدا کیا؛ لہٰذا اس کا شمار فضلاے زمانہ میں ہوتا تھا۔] ۴۸۹ھ/ ۱۰۹۶ء کے قریب ہم اسے اسکندریہ اور قاہرہ میں موجود پاتے ہیں، جہاں [تاج المعالی کی وساطت سے اسے وزیرِ مملکت الافضل کا قرب حاصل ہو گیا]۔ اس نے ایک ڈوبے ہوے جہاز کو نکالنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا؛ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر الافضل نے اسے قید کر دیا۔ [یہ روایت متعدّد مآخذ میں مذکور نہیں؛ قب یاقوت، جس نے اس کی ایک دوسری وجہ بتائی ہے۔ تین سال اور کچھ ہفتے قید رہنے کے بعد اسے رہائی مل گئی، لہٰذا] ۵۰۵ھ/ ۱۱۱۱ - ۱۱۱۲ء میں اس نے مصر کو خیرباد کہا اور المہدیہ چلا گیا، جہاں زیری خاندان کے امیر یحیٰی بن تمیم اور اس کے بیٹے علی بن یحیٰی نے اس کا خیر مقدم کیا۔ ازاں بعد وہ اپنی وفات، یعنی یکم محرّم ۵۲۹ھ/ ۴ ۱۱۳۴ء (بعض دیگر تاریخیں بھی مذکور ہیں)، تک المہدیہ میں بعزت و احترام زندگی بسر کرتا رہا۔

ابو الصَّلْت کی متعدّد تصانیف میں سے حسبِ ذیل قابلِ ذکر ہیں:-

(۱) تقویم الذھن، ارسطو کی منطق پر ایک چھوٹا سا رسالہ، جسے A.

Gonzàlez Palencia نے میڈرڈ سے ۱۹۱۵ء میں ہسپانوی ترجمے کے ساتھ شائع کیا (اور مقدمے میں اس کے حالاتِ زندگی بھی لکھے).

(۲) رسالة فی العمل بالأُصْطُرلاب، اُصطُرلاب کے استعمال کے بارے میں مختصر سا تجزیہ فہرستِ ابواب کے ساتھ، در Millás: *Assaig*.

(۳) علمِ طبیعیات، کائنات اور ریاضی کے مختلف مسائل کے جوابات، مختصر خلاصہ در کتابِ مذکور.

(۴) علمِ ہیئت کا خلاصہ، جو مصر کے وزیر الافضل کے لیے مرتّب کیا گیا۔ یہ کتابچہ معاصرین کی نگاہ میں تعلیمی لحاظ سے لاطائل اور اساتذہ کے لیے بےکار تھا.

(۵) الادویة المفردة، جڑی بوٹیوں کے بارے میں؛ اس رسالے کا ترجمہ مشہور طبیب Arnaldo de Vilanova نے لاطینی میں اور Yehuda Natan نے عبرانی میں کیا.

(۶) الرسائل المصریة، یہ کتاب ابو الطاہر یحیٰی بن تمیم کے نام سے منتسب ہے اور اس میں مصر کے معاملات اور رسم و رواج کے متعلّق واضح معلومات درج ہیں، طبع عبدالسلام ہارون، در نوادر المخطوطات، طبع قاہرہ.

(۷) رسالة فی الموسیقی، اصلی عربی متن ضائع ہو چکا ہے، مگر کسی گمنام شخص کا عبرانی ترجمہ پیرس (کتاب خانۂ اہلیہ، عبرانی مخطوطات، شمارہ ۱۰۳۶) میں محفوظ ہے.

مآخذ: ابن القِفطی، ص ۸۰؛ (۲) ابن ابی اُصَیبِعہ: [عیون الانباء،] ۲: ۵۴ ببعد؛ (۳) یاقُوت: ارشاد، ۲: ۳۶۱؛ (۴) ابن خَلّکان: وفیات، ص ۱۰۱؛ (۵) المقَّری: [نفح الطیب] *Analectes*، ۱: ۵۳۰ ببعد و ۴: ۲۱۸ - ۲۱۹؛ (۶) براکلمان (Brockelmann)، ۱: ۶۴۱ و تکملہ، ۱: ۸۸۹؛ (۷) Suter، ص ۱۱۵؛ (۸) M. Steinschneider: *Die Hebräische Übersetzungen*، ص ۷۳۵، ۸۸۵؛ (۹) L. Leclerc: *Médicine arabe*، ۲: ۷۴ - ۷۵؛ (۱۰) J. M. Millás Vallicrosa: *Assaig d' História de les idees fisiques i matematiques a la Catalunya medieval*، ۱: ۷۵ - ۸۱؛ (۱۱) G. Sarton: *Introduction to the Hist. of Science*، ۱: ۲۳۰.

(J. M. MILLÁSS)

ابوالصَّلت نے علی بن یحیٰی کے بیٹے الحسن کے لیے تاریخ کی ایک کتاب بھی لکھی، یعنی ابن الرقیق کی تاریخِ اِفرِیقیہ کا ذیل، جس کا سلسلہ ۵۱۷ھ/۱۱۲۳ء تک پہنچایا گیا ہے۔ اس کے اقتباسات ابن العِذاری: البیان المُغرِب، ۱: ۲۷۴ ببعد؛ ۲۹۲ ببعد؛ التِّجانی: رحلة، تونس ۱۹۲۷ء، ص ۵۱ ببعد (= JA، ۱۸۵۲ء، ۲: ۱۳۱)، ۹۰ (= کتاب مذکور، ص ۱۷۶)، ۲۳۷ (= JA، ۱۸۵۳ء، ص ۳۷۵ ببعد) اور ابن الخطیب (*Centenario di Michele Amari*، ۱: ۴۵۵ - ۴۵۹) میں موجود ہیں.

(S. M. STERN)

ابوصُیر: رَکَ بہ بوصِیر. ✱

✱ **ابوصَخْر الہُذَلی:** عبداللہ بن سلمہ، پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی کے نصف آخر کا عرب شاعر، جس کا تعلق حجاز کے قبیلۂ ہُذَیل کی شاخ سَہْم سے تھا۔ اس نے آل مروان کی حمایت کی، جس پر عبداللہ[رض] بن الزبیر[رض] نے اسے قید کر دیا؛ لیکن جب انھوں نے وفات پائی تو اسے دوبارہ آزادی مل گئی۔ وہ کہتا ہے کہ ۷۲ھ/ ۶۹۲ء میں اس نے خود بھی مکّۂ معظّمہ کو سر کرنے میں حصّہ لیا۔ اس نے اگرچہ خلیفہ عبدالملک اور اس کے بھائی عبدالعزیز کی مدح کی (دیکھیے الأغانی، طبع اوّل، ۲۱: ۱۴۴)، لیکن سب سے بڑھ کر اَسِید خاندان کے امیر ابو خالد عبدالعزیز کی مدح کی، جس کا بھائی اُمیّہ ۷۱ھ/ ۶۹۰ء سے لے کر ۷۳ھ/اواخر ۶۹۲ء تک البصرہ کا والی تھا، دیکھیے الطبری، اشاریہ؛ اس خاندان پر خلیفہ وقت کی عنایات کے لیے دیکھیے ابن عبدربّہ: العقد الفرید، قاہرہ ۱۳۵۹ھ، ۸: ۵۵.

ابوصَخْر کے کلام میں سے تقریبًا بیس قطعات اور نظموں کا ہمیں علم ہے، جنھیں السُّکَّری نے اپنی تصنیف دیوانِ ہذیل [الھُذَلیین] میں جمع کر دیا ہے۔ ان میں بعض قدیم طرز کے قصائد ہیں، اور بعض غزل اور رثا آمیز نظمیں، جن سے عمر بن ابی ربیعہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے.

مآخذ: (۱) الأغانی، طبع اوّل، ۲۱: ۱۴۴ - ۱۵۴؛ (۲) J. Wellhausen: *Letzter Teil der Lieder der Hudhailiten*، برلن ۱۸۸۴ء، ج ۱، متن عربی، شمارہ ۲۵۰ - ۲۶۹؛ (۳) البُحتُری: الحماسة، شمارہ ۱۰۰۹؛ (۴) قُدامہ بن جعفر: نقد الشعر، ص ۱۳، ۴۴ - ۴۵.

(R. BLACHÉRE)

✱ **ابو ضَمْضَم:** حکایات کے ایک مجموعے کا بطل، جو دسویں صدی عیسوی ہی میں مشہور ہو گئی تھیں۔ ابو ضمضم سے ہر قسم کے احمقانہ اقوال، بالخصوص فقہی مسائل پر مضحکہ خیز فتاوٰی، منسوب ہیں، جیسے بعد میں قَراکُوش [گوز] کے نام سے منسوب کیے گئے۔ یہ ابو ضمضم غالبًا وہی مردِ زاہد ہے جس نے آنحضرت [صلّی اللہ علیہ وسلّم] کی زندگی میں یا آپ[ص] سے پہلے زکوٰۃ کی جگہ اپنی عزت اللہ کے بندوں کی نذر کر دی تھی، لہٰذا اپنے ہم جنسوں کے احترام کی اس بدیہی قربانی کی تعبیر یوں نہیں کی جا سکتی ہے کہ اس مردِ زاہد نے گویا اس امر کی اجازت یا دعوت دے دی تھی کہ اسے حماقت کا نمونہ قرار دے کر بدنام کیا جائے۔ اسی نام کے ایک اَور شخص کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسے قدیم اشعار کا غیر معمولی علم تھا، لیکن اس امر کے فیصلے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ وہ یہی ابو ضُمضَم تھا یا کوئی اَور.

مآخذ: (۱) ابن قتیبہ: ادب الکاتب (طبع Grünert)، ص ۳ - ۴؛ (۲) وہی مصنّف: کتاب الشعر، ص ۳ ببعد؛ (۳) الفہرست، ص ۳۱۳؛ (۴) ابن عبدربّہ:

العقد، قاہرہ ۱۳۰۲ھ، ۳:۴۴۵؛ (۵) ابن الأثیر: أُسد، ۵:۲۳۲؛ (۶) ابن حجر: الاصابة، ۴:۲۰۴؛ (۷) M. Hartmann، در *Zeitschr. d. Vereins f. Volkskunde*، ج ۵؛ (۸) J. Horovitz: *Spuren griechischer Mimen*، ص ۳۱، حاشیہ۔

(J. HOROVITZ)

---

* **ابوضیاء توفیق بک:** رک بہ Tewfik Bey در [آ]، لائڈن، طبع دوم]۔

---

* **ابوطاقہ:** رک بہ سِکّہ۔

⊗ **ابوطالب:** عبدمناف بن عبدالمطلب الہاشمی القرشی، رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے عمّ محترم اور حضرت علیؓ کے والد، حدود ۸۵ ق ھ/ ۵۴۰ء میں مکے میں پیدا اور ۳ ق ھ/ ۶۲۰ء میں وہیں فوت ہوئے۔ الاصابة میں حاکم کے حوالے سے لکھا ہے کہ اکثر متقدّمین کا خیال تھا کہ ان کا نام ہی کنیت ہے، پھر دو نام اَور لکھے ہیں ــــ عبدمناف، جو مشہور ہے اور عمران ــــ؛ ایک نام شیبہ بھی بتایا گیا ہے۔

ان کا سلسلۂ نسب ددھیال اور ننھیال کی طرف سے قریش کے دو نامور مورثوں تک منتہی ہوتا ہے، یعنی قُصَیّ اور مخزُوم۔ والدہ کا نام فاطمہ بنت عمرو تھا۔ ان کی ددھیال میں سقایہ اور ننھیال میں قبہ کے مناصب تھے۔ خطابت وشعر میں بھی ابوطالب کا ایک مقام ہے۔ ان کی طرف ایک چھوٹا سا دیوان بھی منسوب ہے ــــ دیوان شیخ الاباطح ابی طالب، جو طبع ہو چکا ہے۔ چار سو اکیس اشعار پر مشتمل اس دیوان کی ترتیب عبداللہ بن احمد کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ دیوان کے ساتھ ایک لامیہ قصیدہ بھی شامل ہے، طبع محمد صادق، نجف ۱۳۵۶ھ؛ لیکن اس میں شعری سقم اتنے ہیں کہ ابوطالب ایسے قادر الکلام کی طرف اس پورے مجموعے کا انتساب محلِّ نظر ہے۔ سیرة النبی از ابن ہشام، حماسة از ابن شجری اور شرح نہج البلاغة از ابن ابی الحدید میں بعض ایسے اشعار بھی ہیں جو دیوان میں نہیں۔ یہ اشعار حماسہ، مراثی وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ شرح ابن ابی الحدید (طبع بیروت، ۳:۶۸۹) میں لکھا ہے کہ ان کا پہلا راوی مسافر بن ابی عمرو تھا، جو حیرہ میں فوت ہوا۔ اس کے بعد عمرو بن عبد بن ابی قیس راوی بنا۔

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے تعلّق سے ابوطالب کا ذکر سب سے پہلے اس وقت آتا ہے جب آپؐ کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ عبدالمطلب نے اپنی وفات کے وقت آپؐ کی تربیت ابوطالب کے سپرد کی۔ ابوطالب نے اس فرض کو ادا کرنے میں وہ بے مثال کردار ادا کیا کہ تاریخِ اسلام ہمیشہ ان کی مدّاح رہے گی۔ وہ آپؐ سے اس قدر محبت رکھتے تھے کہ آپؐ کے مقابلے میں اپنے بچوں کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ تقریباً بارہ برس کی عمر میں آپؐ نے ابوطالب کے ساتھ شام کا سفر کیا۔ ابوطالب سفر کی تکلیف یا کسی اَور وجہ سے نہیں چاہتے تھے کہ آپؐ سفر میں ساتھ جائیں، لیکن آپؐ کو ان سے اس درجہ محبت تھی کہ جب ابوطالب چلنے لگے تو آپؐ لپٹ گئے۔ ابوطالب نے آپؐ کی دل شکنی گوارا نہ کی اور ساتھ لے لیا۔ ابوطالب ہی نے حضرت خدیجہؓ کے ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نکاح کا خطبہ پڑھا (الیعقوبی، ۲:۱۴، نے یہ خطبہ نقل کیا ہے) اور آنحضرتؐ کے اعلانِ نبوّت کے بعد ہمیشہ مخالفوں کے مقابلے میں سینہ سپر رہے۔ یکے بعد دیگرے قریش کی تین سفارشیں ان کے پاس آئیں کہ یا تو اپنے بھتیجے کو تبلیغ اسلام سے روکو یا میدان میں آجاؤ، ہم اس سے اور تم سے نپٹ لیں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب سن کر کہ بخدا اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں میں چاند لاکر رکھ دیں تب بھی میں اس کام کو نہیں چھوڑ سکتا، ابوطالب نے کہا: ''بھتیجے! جاؤ اور جس کام میں لگے ہوئے ہو اسے سرانجام دو۔ میں بھی تمھارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا'' اور قریش مکّہ کو بھی ان کی تمام تر ترغیب وترہیب کے باوجود یہی جواب دیا۔ اب قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خاندان ہاشم و عبدالمطلب کے مقاطعے کا باہم معاہدہ کیا۔ یہ معاہدہ منصور بن عکرمہ نے لکھا جو عبدالدار بن قصیّ کی اولاد میں سے تھا اور درِ کعبہ پر آویزاں کر دیا گیا۔ ابوطالب تمام خاندانِ ہاشم وعبدالمطلب کے ساتھ ابوقُبیس کی پہاڑی کے ایک درّے میں محصور ہو گئے، جو شعبِ ابی طالب کے نام سے موسوم ہے۔ تین سال تک وہ اس میں محصور رہے۔ یہ زمانہ ایسا سخت گزرا کہ افرادِ خاندان درختوں اور جھاڑیوں کے پتے کھانے پر مجبور ہو گئے۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ بچے جب بھوک سے روتے تھے تو کفار کو اس سے خوشی ہوتی تھی، لیکن بعض رحم دلوں کو ترس آجاتا تھا اور وہ چوری چھپے کچھ اشیاے خورد و نوش بھیج دیتے تھے۔ آخر خود کفار ہی میں سے ہشام بن عمرو، زہیر بن ابی اُمیہ، مطعم بن عدی، ابوالبختری ابن ہشام اور زمعہ بن الاسود وغیرہ کی تحریک سے یہ مقاطعہ ختم ہوا اور مطعم بن عدی نے مقاطعے کی دستاویز چاک کر دی۔ اس وقت ابوطالب بھی حرمِ کعبہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد مؤیّدین بنوہاشم کے پاس گئے اور انھیں درّے سے نکال لائے۔ اس کے جلد ہی بعد ابوطالب کا انتقال ہو گیا۔ مَرزُبانی لکھتا ہے کہ یہ سن ۱۰ نبوی تھا اور ابن سعد نے واقدی سے روایت کی ہے کہ شوّال کی پندرہ تاریخ تھی۔ بعض روایتوں میں ذوالقعدہ کا مہینہ بیان ہوا ہے (الخمیس)۔ تاریخ الخمیس ہی میں ہے کہ جب ابوطالب فوت ہوئے تو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی عمر ۴۹ سال ۸ ماہ اور ۱۱ دن تھی۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ ابوطالب ہجرت نبوی سے تین سال اور چار ماہ پہلے فوت ہوئے (المعارف، مصر ۱۹۳۵ء، ص ۵۳) اور الحجون کے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ [ان کی قبر پر ۱۹۲۵ء تک ایک خوبصورت قبہ بھی تھا]۔ بخاری (کتاب مناقب الانصار، ب ۴۰) میں حضرت مسیبؓ کی یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ ابوطالب کی وفات سے پہلے ان کے پاس اعزّہ کا مجمع تھا۔ آنحضرت صلّی

اللہ علیہ وسلّم نے ان سے کہا: ''چچا! کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ پڑھ لیجیے''، لیکن ان کے آخری الفاظ یہ تھے: ''عبدالمطلب کے مذہب پر''۔ ابن حجر (اصابۃ، ص ۱۱۶-۱۱۹) کا بیان ہے کہ ابن عساکر نے ابوطالب کے حالات کے ابتدائی حصے میں لکھا ہے کہ وہ اسلام لائے تھے، لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ بخاری میں حضرت عباسؓ اور حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایتوں میں آخرت میں ابوطالب کی سزا اور اس میں امدادِ رسول کی وجہ سے تخفیف کا ذکر ہے۔ علامہ ابن حجر کے نزدیک بھی گو ابوطالب کا اسلام ثابت نہیں لیکن ابوطالب کی عظمت اور قربانی ان کی نظر میں تھی اور وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مصنّفین رجال کی روش کے خلاف قدم اٹھایا اور صحابہ کے حالات میں جو کتاب الاصابۃ لکھی اس میں حرف الطا کی قسم رابع میں ان کا ذکر کیا تا کہ وہ کتاب میں شامل بھی رہیں اور صحابہ سے علٰیحدہ بھی.

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ نبی اکرمؐ نے جب ابوطالب کو تبلیغ اسلام کی تو انھوں نے کہا: ''اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ میرے بعد تم پر اور تمھارے آباو اجداد پر گالیاں پڑیں گی اور یہ کہ قریش سمجھیں گے کہ میں نے موت کے ڈر سے کلمہ پڑھ دیا ہے تو میں پڑھ دیتا''۔ اس کے بعد یہ الفاظ ہیں: ''میں وہ کلمہ تمھیں خوش کرنے کے لیے پڑھتا ہوں''۔ اب جو عباسؓ نے ان کی طرف دیکھا تو ان کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ حضرت عباسؓ نے کان لگا کر سنا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ''برادر زادے! بخدا میرے بھائی نے وہ کلمہ پڑھ دیا جو تم پڑھانا چاہتے تھے''۔ ابوطالب کے متعلق شیعی مسلک یہی ہے اور یہی نقطۂ نگاہ شبلی نعمانی کا تھا، بلکہ عبدالحسین احمد امینی نے تو لکھا ہے کہ ائمۂ اہل بیت ابوطالب کے ایمان پر متفق القول ہیں (الغدیر، ۷: ۳۸۵)۔ بہرحال ابوطالب نے آنحضرتؐ سے جو جاں نثاریاں کیں ان سے انکار نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنے جگر گوشوں پر آپؐ کو ترجیح دیتے تھے، آپؐ کی تائید میں کافروں کو اپنا دشمن بنالیا تھا، آپؐ کی خاطر شعب ابی طالب میں محصور ہوے اور فاقے برداشت کیے؛ یہ محبت، یہ جوش، یہ جاں نثاریاں یقیناً ضائع نہیں جاسکتیں.

ابوطالب نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی، جن کا نام حضرت فاطمہؓ بنت اسد بن ہاشم تھا، مشرف بہ اسلام ہوئیں۔ ان سے ابوطالب کی حسبِ ذیل اولاد ہوئی: ۱-طالب؛ ۲-اُم ہانی فاختہ؛ ۳-عقیل؛ ۴-جعفر؛ ۵-جُمانہ؛ ۶-علی؛ ۷-اُم طالب رَیطہ؛ دوسری بیوی سے ایک لڑکا پیدا ہوا طلیق (دیکھیے ابن سعد)۔ ان آٹھ بچوں میں پیدائش کے لحاظ سے جو ترتیب تھی اس کا اجمالی حال الاستیعاب (حالات حضرت عقیلؓ) اور المسعودی سے معلوم ہوتا ہے.

مآخذ: (۱) ابن ہشام: سیرۃ رسول اللہ، ص ۱۱۴-۱۱۷، ۱۶۷-۱۷۷؛ (۲) ابن سعد: طبقات، ۱: ۷۵-۷۹، ۱۳۴ ببعد، ۱۳۹ ببعد؛ (۳) الیعقوبی: تاریخ، بیروت ۱۹۶۰ء، ۱: ۲۵۰، ۲۵۱ و ۲: ۱۳ ببعد، ۱۹، ۲۰، ۲۴، ۲۶ ببعد، ۸۷؛ (۴) الطبری: تأریخ، ۱: ۱۱۲۳-۱۱۲۶، ۱۱۷۳-۱۱۸۵، ۱۱۹۸-۱۱۹۹؛ (۵) ابن الأثیر، ۲: ۳۴؛ (۶) ابن ابی الحدید: شرح نہج البلاغۃ، مطبوعۂ بیروت، ج ۳؛ (۷) القلقشندی: الصبح الأعشٰی، ۱: ۳۵۹-۳۶۰ (۸) ابن حجر: الاصابۃ، ۴: ۲۱۱-۲۱۹؛ (۹) الدیار بکری: الخمیس، ۱: ۲۹۹؛ (۱۰) البغدادی: خزانۃ، ۱: ۲۶۱؛ (۱۱) آ، لائڈن، طبع دوم، ۱: ۱۵۲؛ (۱۲) ذاکر حسین: فتح الغالب فی ایمان ابی طالب، لکھنؤ ۱۳۳۱ھ؛ (۱۳) الامینی: الغدیر، تہران ۱۳۷۲ھ-ش، جلد ۷، ۸؛ (۱۴) علی حیدر: تاریخ ائمۃ، طبع کھجوا (ہند) ۱۳۵۶ھ؛ (۱۵) محمد بن علی: مناقب آل ابی طالب؛ (۱۶) شرح الشواھد، ۱۳۵؛ النجمی، ص ۶۰.

(عبدالمنّان عمر)

ابوطالِب خان: (۱۷۵۲-۱۸۰۶ء) حاجی محمد بیگ کا بیٹا، جونسلاً ترک تھا اور لکھنؤ میں پیدا ہوا۔ اس کی زندگی کے ابتدائی سال مرشد آباد میں مظفر جنگ کے دربار میں گزرے۔ آصف الدولہ کے مسند نشین ہونے پر (۱۷۷۵ء) وہ اودھ واپس آ گیا اور اٹاوہ اور بعض دوسرے اضلاع کا ''عمل دار'' مقرر ہوا۔ اس نے کرنل ہینے (Hannay) کے ماتحت، جس نے سروار کے علاقے کا زرعی بندوبست کیا تھا، ایک تحصیلدار کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ بعد میں انگریز رزیڈنٹ مِڈلٹن (Nathaniel Middleton) نے اسے ایک ملازمت دے دی۔ بیگمات اودھ کی ضبط شدہ جاگیروں کے انتظام میں وہ رچرڈ جانسن (Richard Johnson) سے بھی منسلک رہا۔ ۱۷۹۶ء تک وہ اودھ میں مقیم تھا۔ فروری ۱۷۹۹ء میں کلکتے سے جہاز پر سوار ہوکر یورپ گیا اور انگلستان، فرانس، ترکیہ اور دوسرے مُلکوں کی سیاحت کی۔ اگست ۱۸۰۳ء میں وہ ہندوستان واپس آیا۔ اس کا سفر نامہ مَسِیر طالبی فی بلادِ افرنجی کے نام سے ۱۸۱۲ء میں طبع ہوا۔ سٹوارٹ (C. Stewart) نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا (۱۸۱۴ء) اور مالو (Ch. Malo) نے فرانسیسی میں (۱۸۱۹ء)۔ اس نے لُبّ السِیَر وجہاں نما اور خلاصۃ الافکار بھی تصنیف کیں۔ اس کی کتاب تفضیح الغافلین عہدِ آصف الدولہ میں اودھ کی تاریخ ہے اور حیدر بیگ اور مختلف انگریزی رزیڈنٹوں کے حالات کا ایک اہم مآخذ۔ اس میں کرنل ہینے (Hannay) کے انتظاماتِ مالگزاری کی حمایت بڑے شد و مد سے کی گئی ہے۔ (ترجمہ انگریزی از W. Hoey، ۱۸۸۸ء)۔ ابوطالب خان نے دیوان حافظ کا پہلا ایڈیشن بھی طبع کرایا (کلکتہ ۱۷۹۱ء)۔ [اس کا ایک دیوان بھی موجود ہے، جس میں زیادہ تر لنڈن کے قابلِ دید مقامات اور وہاں کے ان امرا و خواتین کی تعریف و توصیف کی گئی ہے جن سے اس کی ملاقات ہوئی].

مآخذ: (۱) Elliot and Dowson: *History of India*، ۸: ۲۹۸ ببعد؛ (۲) ریو (Rieu): *Cat. of Persian Mss.*، ۱: ۳۷۸ ببعد.

(C. Collin Davies)

ابوطالب کلیم: رک بہ کلیم.

---

* **ابوطالب محمد**: بن علی الحارثی المکّی، ۳۸۶ھ/۹۹۶ء میں بغداد میں فوت ہوے۔ وہ محدّث اور صوفی تھے اور بصرے کے متکلّم فرقے موسوم بہ سالمیّہ [رک بآں] کے پیشوا۔ ان کی اہم ترین کتاب ہے قوت القلوب (قاہرہ ۱۳۱۰ھ)، جس کے صفحے کے صفحے الغزالی نے اِحیاء علوم الدین میں نقل کر دیے ہیں۔

مآخذ: (۱) براکلمان (Brockelmann)، ۱:۲۰۰ و تکملہ، ۱:۳۵۹-۳۶۰؛ (۲) سید مرتضٰی: اتحاف (مطبوعۂ قاہرہ)، ۲:۶۷-۶۹ و مواضع کثیرہ؛ (۳) شَعرَوی: لطائف (مطبوعۂ قاہرہ)، ۲:۲۸؛ (۴) ابن عبّاد الرُّندی، الرسائل الکبرٰی، چاپ سنگی، فاس ۱۳۲۰ھ، ص ۱۴۹، ۲۰۰-۲۰۱؛ (۵) L. Massignon: *Essai sur les origines du lexique technique de la mystique musulmane*، طبع دوم، بمد اشاریہ و مذکورہ حوالہ جات۔

(L. MASSIGNON)

---

* **ابوطاہر سُلَیمان القَرمَطی**: رک بہ الجنّابی۔

---

* **ابوطاہر طَرسُوسی**: (طَرطُوسی، طُوسی) محمد بن حسن بن علی بن موسٰی، ایک غیر معروف شخص، جس سے نثر میں کئی ایسے طویل قصص اور حکایات کی تالیف منسوب ہے جن کے اسلوبِ بیان میں بڑے اطناب سے کام لیا گیا ہے۔ یہ قصّے عرب و ایران کی اساطیری روایات کا ایک پریشان مجموعہ ہیں، جو فارسی زبان میں قلم بند ہوے اور جن کا ترجمہ آگے چل کر ترکی میں بھی ہو گیا تھا۔ ان میں ذیل کے افسانے شامل ہیں: قَہرَمان نامہ (ایران کے نیم افسانوی تاجدار ہُوشَنگ کے عہد کے ایک دلاور سورما سے متعلق)؛ قِران حَبَشی (کیانی بادشاہ کیقباد کے عہد کے ایک 'پہلوان' کی کہانی)؛ داراب نامہ (دارا اور اسکندر کی تاریخ)۔

مآخذ: (۱) فردوسی: *Livre des rois*، طبع و ترجمہ J. Mohl، ۱: مقدمہ، ۷۴ ببعد؛ (۲) H. Ethé، در *Grundr. d. iran. Philol.*، ۲:۳۱۸؛ (۳) E. Blochet: *Cat. mss. persans Bibl. Nat. Paris*، شمارہ ۱۲۰۱-۱۲۰۲؛ (۴) وہی مصنّف: *Cat. mss. turcs,* anc. fonds، شمارہ ۳۳۵-۳۳۷؛ (۵) Ch. Rieu: *Cat. Turkish MSS Brit.Mus.*، ص ۲۱۹ ببعد۔

(H. MASSÉ)

---

* **ابوالطَیّب**: رک بہ المُفَضَّل۔

---

* **ابوطَیّب**: رک بہ (۱) الطبری؛
(۲) المُتنبّی۔

---

* **اَبُوظَبی**: (عموماً ابوظبی لکھا جاتا ہے)، ایک قصبہ (۵۴ درجے ۲۲ ثانیہ طول بلد مشرقی، ۲۴ درجے ۲۹ ثانیہ عرض بلد شمالی) اور عرب کے زیر معاہدہ (Trucial) ساحل پر ایک شیخ کے زیرِ حکومت علاقہ، جس میں ابوظبی ہی ایک بڑی بستی ہے اور اس کی آبادی چند ہزار سے زیادہ نہیں۔ یہاں سب سے زیادہ نمایاں عمارت حکمران کا قلعہ نما محل ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس قصبے کی بنا بنی یاس نے ۱۱۷۴-۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء میں رکھی تھی اور اس وقت یہ قبیلہ الظَفرَہ کے اندرونی حِصّوں میں پھیلا ہوا تھا۔ اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ یہاں پہلے بھی کوئی بستی آباد تھی۔ ابوظبی ایک تکونے جزیرے پر سمندر کی جانب واقع ہے اور اس کے اور خشکی کے درمیان ایک چھوٹی سی آبنائے (المُقطَع) حائل ہے، لہٰذا خشکی کی طرف سے اس پر حملوں کا نسبتاً بہت کم خطرہ ہے۔ اس میں چھوٹی کشتیوں کی آمد و رفت کے لیے بھی ایک حد تک محفوظ بندرگاہ موجود ہے، لیکن پینے کے پانی کی قلّت ہے۔

سردارانِ بنی یاس اندرونِ ملک میں رہتے رہے، تا آنکہ ۱۲۰۹-۱۲۱۰ھ/ ۱۷۶۵ء کے قریب حکمران قبیلے آل بوفلاح کا شَخبُوط بن ذِیاب تخت نشین ہوا۔ پھر یہ تقریباً ۱۲۱۴-۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء کا زمانہ تھا جب نجد کے وہابی اس کے سواحل پر نمودار ہوے، لیکن انھوں نے اَبوظبی کے بجاے القواسم اور البُرَیمی سے لوگوں سے قریبی تعلقات قائم کیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ بن شَخبُوط کی تخت نشینی (۱۲۴۸ھ/۱۸۳۳ء) تک بنو یاس وہابیوں کے زیرِ اثر نہیں آئے تھے۔

شَخبُوط نے اس عام صلح نامے پر دستخط کر دیے جو برطانیہ نے ۱۲۳۵ھ/ ۱۸۲۰ء میں راس الخَیمَہ کے خلاف برطانوی مہم کے بعد تیار کیا تھا۔ ۱۲۵۱ھ/ ۱۸۳۵ء میں ابوظبی نے اس عارضی بحری صلح نامے (Maritime Truce) کو بھی تسلیم کر لیا جس کی بنا پر ساحلِ زیرِ معاہدہ (Trucial Coast) کی اصطلاح وضع ہوئی (قب بحر فارس)۔ ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء میں ایک اَور الگ تھلگ معاہدہ ہوا، جس کی رُو سے برطانیہ عظمٰی نے ابوظبی میں خاص حقوق حاصل کر لیے۔ ابوظبی دیگر زیرِ معاہدہ (Trucial) ریاستوں کی طرح آزاد، لیکن برطانیہ کے زیرِ حمایت تصوّر کیا جاتا ہے۔ ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۹ء میں ابوظبی کے شیخ نے ۷۵ برس کے لیے تیل کی رعایت دے دی، جسے Petroleum Development (Trucial Coast) Ltd. کام میں لا رہی ہے اور عراق پٹرولیم کمپنی کے شرکا میں سے ہے، گو ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء تک تیل دریافت نہیں ہوا تھا۔ ساحل سے دور کھدائی کے حقوق بعض دوسری شرکتوں کو حاصل ہیں۔

زاید بن خلیفہ (م ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء) کے ترپّن سالہ عہدِ حکومت میں ابوظبی ساحل کے زیرِ معاہدہ علاقے میں سب سے بڑی طاقت بن گیا، لیکن جب اس کے چار بیٹے یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوے تو الشارقہ اور دُبَئی اس سے سبقت لے گئے، کیونکہ انھوں نے جدید دنیا سے نسبتاً زیادہ تیزی کے ساتھ اپنے روابط قائم کیے۔ ابوظبی کا موجودہ حکمران (۱۹۵۲ء) شَخبُوط بن سلطان (سن جلوس ۱۳۴۶-۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء) ہے۔ وہ زاید کا پوتا ہے۔

ابوظبی زیرِ معاہدہ ریاستوں میں دوسروں سے کہیں بڑی ہے، گو اندرونی علاقے میں اس کی بیشتر سرحدیں غیر متعین ہیں۔ اس کا دعوٰی یہ ہے کہ اس کی برّی سرحد العُدَیْد کے قریب قَطَر سے جاملتی ہے اور الظّفرہ کا بہت سا علاقہ بھی اسی کا ہے، جہاں الجواء کے چھوٹے قریوں میں بنی یاس کے بعض افراد اب بھی آباد ہیں۔ البُرَیْمی کے متعدّد گاؤں بھی آل بوفلاح کی ملکیت ہیں۔ بنی یاس بعض ایسے جزیروں میں بھی آباد ہیں جو زیرِ معاہدہ ساحلی علاقے اور قطر کے درمیان خلیج فارس میں واقع ہیں اور جن کی صدف گیری، ماہی گیری اور ہیزم کشی کے سلسلے میں دوسرے جزیروں میں آمد و رفت رہتی ہے۔ عقبی علاقے کے اکثر بدویوں سے بھی آلِ بوفلاح کے دوستانہ تعلقات ہیں، گو زمانۂ حال میں مناصیر سے ان کے روابط میں، جو کبھی بڑے استوار تھے، فرق آ گیا ہے۔

(G. RENTZ)

---

* **ابوالعالیہ:** رُفَیْع بن مِہران الرِّیاحی، بنو ریاح کے آزاد کردہ غلام، قرنِ اوّل میں بصرے میں مقیم تابعین میں سے ایک (م ۹۰ھ/ ۷۰۸-۷۰۹ء یا ۹۶ھ/ ۷۱۴ء)۔ ان سے قرآن پاک کی ایک تفسیر منسوب ہے (حاجی خلیفہ، طبع فلُوگل (Flügel)، ۲: ۳۵۲)، لیکن زیادہ تر وہ ایک محدّث اور قرآن پاک کے قاری کی حیثیت سے معروف ہیں۔ انھوں نے بصرے اور مدینے میں حدیثیں جمع کیں، خصوصًا وہ حدیثیں جن کی روایت [حضرت] عمرؓ اور اُبَیّ بن کَعْب نے کی ہے۔ انھیں ثقہ مانا گیا ہے اور انھوں نے قَتَادَہ، داؤد بن ابی ہند، عاصم الاَحْوَل اور دوسرے مشہور محدّثین کی تعلیم و تربیت میں حصّہ لیا۔ ان کا نام احادیث کے ان اسنادی سلسلوں میں بار بار آتا ہے جو بڑے بڑے مجموعوں میں شامل ہیں، چنانچہ الطبری نے بھی ان سے منسوب شدہ معلومات کو صحیح تسلیم کیا ہے، تفسیر، مواضع کثیرہ، مثلًا ۱: ۲۲۸؛ قب البیضاوی: انوار التنزیل (طبع Fleischer)، ۱: ۱۲، سطر ۲۴۔ ان سے ان کا طریقِ قراءت الاَعْمَش اور بصرے کے قاریوں ابوعمرو بن العلاء [رک بآں] اور شعیب بن الحبحاب الازدی (م ۱۳۰ھ/ ۷۴۷ء) کو منتقل ہوا۔ انھوں نے سیاست میں کوئی حصّہ نہیں لیا اور وہ [حضرت] علیؓ و شیعیانِ علیؓ اور بنواُمیّہ کے نزاع سے بھی الگ رہے۔

مآخذ: (۱) ابن سعد، ۷: ۸۱-۸۵؛ (۲) ابن قتیبہ، المعارف، قاہرہ ۱۳۵۳ھ/ ۱۹۳۴ء، ص ۲۰۰؛ (۳) الطبری، ۱: ۱۰۸-۱۲۵؛ (۴) ابونُعَیْم: حِلْیَۃ، قاہرہ ۱۳۵۱-۱۳۵۶ھ، ۲: ۲۱۷-۲۲۴؛ (۵) ابن عساکر: تاریخ، دمشق ۱۳۳۲ھ، ۵: ۳۲۳-۳۲۶؛ (۶) النّووی: تہذیب الاسماء، (طبع Wüstenfeld)، ص ۷۳۸-۷۳۹؛ (۷) عثمانی: طبقات الفقہاء، مخطوطۂ پیرس، شمارہ ۲۰۹۳، ورق ۴۳ ب؛ (۸) ابن الاَثیر: اُسُد، ۲: ۱۸۶-۱۸۷؛ (۹) ابن الجَزَری: قرأ، شمارہ ۱۲۷۲؛ (۱۰) A. Sprenger: *Leben des Mohammed*، ۳، cxvi-cvii.

(R. BLACHÈRE)

---

* **ابوالعبّاس السَفّاح:** عبداللہ بن محمد بن علی ابن عبداللہ بن العباس، پہلا عبّاسی خلیفہ، لقب السفّاح، جس کے معنی ''خونخوار'' بھی ہیں اور ''فیّاض'' بھی۔ الحسن بن قَحْطَبہ نے جب کوفے پر قبضہ کر لیا تو اس سے کچھ ہی دنوں بعد صفر ۱۳۲ھ/ ستمبر-اکتوبر ۷۴۹ء میں السفاح نے آلِ عباس کے دوسرے افراد کے ساتھ یہاں پناہ لی اور یہیں ۱۲ ربیع الثانی/ ۲۸ نومبر کو شہر کی جامع مسجد میں اس کی خلافت کا اعلان کیا گیا۔ اس موقع پر اس نے ایک مشہور خطبہ دیا۔

ابوالعباس کا پہلا کام یہ تھا کہ امویوں کو کلی طور پر شکست دے، چنانچہ عباسی فوجیں جب اس کے چچا عبداللہ بن علی کے زیرِ قیادت بالائی زاب پر مکمل طور پر فتح یاب ہو چکیں (جُمادَی الاُخْرٰی ۱۳۲ھ/ جنوری ۷۵۰ء) اور پھر عراق، شام اور فلسطین سے گزرتے ہوئے مروان ثانی کے تعاقب میں مصروف ہو گئیں، تا آنکہ مروان بھی مصر میں مارا گیا (ذوالحجہ ۱۳۲ھ/ اگست ۷۵۰ء)، تو یوں سمجھنا چاہیے کہ اصل جنگ کا خاتمہ ہو گیا، اس لیے کہ الواسط میں ابن ہُبَیْرہ [رک بآں] کی انفرادی مزاحمت پر پہلے ہی دھوکے سے قابو پا لیا گیا تھا۔ عراق اور شام میں جو بغاوتیں رونما ہوئیں وہ بھی خونریزی سے دبا دی گئیں۔ فاتحین شدید انتقامی حرکتوں پر اتر آئے تھے، جن میں سب سے اہم واقعہ نہرابی فُطْرُس [رک بآں] کا تھا، جہاں عبداللہ بن علی نے بنواُمیّہ کے کوئی اسّی امرا اور شیوخ قتل کیے اور ان کی لاشوں پر دسترخوان بچھایا؛ بعدازاں ان لاشوں کو کتوں کے آگے پھنکوا دیا گیا۔ الکوفہ، البصرہ اور حجاز میں بھی ایسے ہی مناظر دیکھنے میں آئے۔ خلفاے بنواُمیّہ کے مقابر کی بے حرمتی بھی کی گئی۔ اسی طرح علویوں کی بے چینی کا بھی، جو بنواُمیّہ کے خلاف دعوتِ خروج کی تائید و حمایت کے بعد اس خروج کے ثمرات سے محروم ہو رہے تھے، خونریزی سے خاتمہ کر دیا گیا؛ چنانچہ ۱۳۳ھ/ ۷۵۰-۷۵۱ء میں اس بغاوت کو بھی فرو کر دیا گیا جو ابومسلم [خراسانی] حاکم خراسان نے علویوں کی تائید میں کی تھی۔

یوں سررشتۂ خلافت جب عباسیوں کے ہاتھ میں آ گیا تو پھر تھوڑے ہی دنوں میں مخالفت کے بڑے بڑے سرچشموں، یعنی ان کے پرانے حریف امویوں اور علویوں کا خاتمہ ہو گیا، مگر عباسی تو اس سے بھی آگے بڑھتے ہوئے خود اپنے اعوان و انصار میں ان سیاسی اور فوجی امرا کا خاتمہ کر دینے کے درپے تھے جنھوں نے حد سے زیادہ طاقت حاصل کر لی تھی یا جن سے صحیح یا غلط طور پر سرکشی کا خطرہ تھا؛ چنانچہ ابومسلم سے ساز باز کر کے انھوں نے ابوسَلَمَہ [رک بآں] اور سلیمان ابن کثیر [رک بآں] کی سرکوبی کی۔ ازاں بعد خود ابومسلم کی باری آ گئی۔ اس کے خلاف پہلی کوشش تو ناکام رہی، جو ماوراء النہر میں زیاد بن صالح کی بغاوت کے سلسلے میں کی گئی تھی، لیکن دوسری کوشش میں، جو ابوالعباس کی وفات کے فوراً بعد اس کے جانشین المنصور [رک بآں] نے کی، خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔

ابوالعباس نے ذوالحجہ ۱۳۶ھ/ جون ۷۵۴ء میں الانبار میں وفات پائی، جہاں اس نے سکونت اختیار کر رکھی تھی۔ اس کے شخصی کردار کے بارے میں کسی قطعی رائے کا اظہار مشکل ہے، اس لیے کہ ہمیں ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں کہ اس کے

مختصر سے عہدِ خلافت میں جو واقعات رونما ہوے ان میں اس کا ذاتی حصہ کتنا تھا؛ البتہ اتنا یقینی ہے کہ اس کے عہد میں عباسی تحریک نہ صرف انقلابی دور سے گزر کر آئینی منزل میں داخل ہوگئی، بلکہ اس نے اپنے پاؤں بھی مضبوطی سے جما لیے حتّٰی کہ اُس سیاسی اور معاشی طاقت کے وہ پہلے قرائن بھی ظہور پذیر ہو چکے تھے جن کی توثیق خلیفہ المنصور کے عہدِ خلافت نے کر دی.

مآخذ: (۱) الدِینَوَری: الاخبار الطوال (طبع Guirgass)؛ (۲) الیعقوبی؛ (۳) الطبری؛ (۴) المسعودی: مُروج، ۲-۴ بہ اِمداد اشاریہ؛ (۵) الأغانی، بہ اِمداد *Tables*؛ (۶) نولدیکہ (Th. Nöldeke): *Orientalische Skizzen*، ص ۱۱۸-۱۲۱؛ (۷) J. Wellhausen: *Das arabische Reich.*، ص ۳۳۸-۳۵۲؛ لقب السفّاح کے بارے میں دیکھیے: (۸) H. F. Amedroz: *On the Meaning of the Laqab "al-Saffāh"*، در *JRAS*، ۱۹۰۷ء، ص ۶۶۰-۶۶۳؛ ابن ہُرَیْرَہ [کذا، ابن ہُبَیْرَہ] کے بارے میں دیکھیے: (۹) S. Moscati: *Il "tradimento" di Wāsit*، در *Muséon*، ۱۹۵۱ء، ص ۱۷۷-۱۸۶؛ بنوامیّہ کے قتلِ عام کے بارے میں دیکھیے: (۱۰) وہی مصنف: *Le massacre des Umayyades*، در *ArO*، ۱۹۵۰ء، ص ۸۸-۱۱۵؛ ابومسلم کے بارے میں دیکھیے: (۱۱) وہی مصنف: *Studi su Abū Muslim*، حصہ اوّل و دوم، Rend. Lin، ۱۹۴۹ء، ص ۳۲۳-۳۳۵، ۴۷۴-۴۹۵؛ ۱۹۵۰ء، ص ۸۹-۱۰۵ اور مادّۂ ابومسلم.

(S. MOSCATI)

---

* **ابو عبداللہ الشّیعی:** الحسین بن احمد بن محمد بن زکریا، جسے کبھی کبھی المحتسب بھی کہہ دیا جاتا ہے (کیونکہ کہا جاتا ہے کہ وہ عراق میں محتسب یعنی نخاس کا نگران رہ چکا تھا)، شمالی افریقہ میں دولتِ فاطمیہ کا بانی. وہ اصل میں صنعا کا رہنے والا تھا اور عراق میں جب اسمٰعیلی تحریک میں شریک ہوا تو اسے یمن میں بھیج دیا گیا، چنانچہ یہیں اس نے اپنی شاگردی کا زمانہ یمن کے اسمٰعیلی سلسلے کے رئیس منصور الیَمَن (ابن حَوْشَب) کے ساتھ بسر کیا. ۲۷۹ھ/۸۹۲ء کے حج میں اس کی ملاقات مکۂ معظّمہ میں کتامہ کے چند حاجیوں سے ہوئی؛ چنانچہ وہ ان کے ساتھ ان کے وطن کو روانہ ہوگیا، جہاں یہ لوگ ۱۴ ربیع الاوّل ۲۸۰ھ/۳ جون ۸۹۳ء کو پہنچے. اس نے اوّل سَطِیف کے قریب اِیکْ جان میں سکونت اختیار کی، مگر پھر جب کتامہ قبائل کے ایک محالفے نے اس کی مخالفت شروع کی تو ابو عبداللہ نے اپنا مستقر تازُروت میں منتقل کر لیا اور وہاں بتدریج اپنی طاقت کو مستحکم کرتا رہا، حتّٰی کہ جب میلہ (قبیلہ) اس کا گرویدہ ہوگیا تو اس نے اُن دو مہموں کے حملوں کا بڑی کامیابی سے مقابلہ کیا جو اغلبی حکومت نے ۲۸۹ھ/۹۰۲ء اور ۲۹۰ھ/۹۰۳ء میں اس کے خلاف بھیجیں، مگر پھر ایک عارضی ناکامی کے بعد اس نے اِیکْ جان کو دوبارہ اپنا مستقر بنایا اور یہی مقام آئندہ چل کر اس کے اقدامات کا مرکز بنا رہا. ۲۸۹ھ/۹۰۲ء میں الامام المہدی عبید اللہ [رکّ بآں] نے شام سے راہ فرار اختیار کی. وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ابو عبداللہ سے جا ملے، لیکن اسے مجبورًا سجلماسہ میں پناہ لینا پڑی، جہاں اسے قید کر لیا گیا. اس اثنا میں ابو عبداللہ کے بھائی ابوالعباس محمد کو، جو اس کے ہمراہ تھا، اغلبیوں نے گرفتار کر لیا اور ابو عبداللہ نے سَطِیف، طُبْنہ (۲۹۳ھ/۹۰۶ء) اور (اسی سال) بِلِزْمہ کے مقامات سر کر لیے. دارمَلُّول کی جنگ میں فتح پائی، تِیجِس اور باغایہ پر قبضہ جما لیا، دارمَدْیَن کے قریب اغلبیوں کی فوج کو شکست دی اور قُسْطِلیہ اور قَفْصہ پر بھی قابض ہوگیا (۲۹۶ھ/۹۰۹ء). پھر جب اس نے ولایت افریقیہ کے کلیدی شہر الأُرْبُس (Laribus) کو بھی فتح کر لیا (۲۳ جمادی الاُخرٰی ۲۹۶ھ/۱۹ مارچ ۹۰۹ء) تو اغلبی امیر زیادۃ اللہ رَقّادہ سے بھاگ نکلا. یکم رجب ۲۹۶ھ/۲۵ مارچ ۹۰۹ء کو ابو عبید اللہ اغلبیوں کے دارالحکومت میں داخل ہوا اور اس نے اپنے بھائی ابوالعباس کو نائب مقرر کر کے ایک لشکر کے ساتھ سِجِلْماسہ پر حملہ آور ہو کر امام [ابو عبداللہ] کو قید سے رہائی دلائی. ۲۰ ربیع الثانی ۲۹۷ھ/۶ جنوری ۹۱۰ء کو وہ ایک فاتح کی حیثیت سے رَقّادہ میں داخل ہوا اور ابو عبداللہ اور ابوالعباس کو بڑے بڑے اعزاز مرحمت کیے؛ لیکن پھر تھوڑے ہی دنوں میں حکمران اور اس کے یہ طاقت ور ملازم ایک دوسرے کے مخالف ہوگئے، چنانچہ یکم ذوالحجہ ۲۹۸ھ/۳۱ جولائی ۹۱۱ء کو دونوں بھائیوں کو قتل کر دیا گیا.

مآخذ: (۱) اہم سند اور بعد کے مؤرخین کے لیے تقریبًا واحد ماخذ القاضی النعمان کی افتتاح الدعوۃ ہے (مخطوطات بوہروں کے پاس محفوظ ہیں). یہ کتاب، جو ۳۴۶ھ/۹۵۷-۹۵۸ء میں لکھی گئی، زیادہ تر ابو عبداللہ کی سرگرمیوں کے بہت تفصیلی بیان پر مشتمل ہے؛ (۲) اس کے اقتباسات المقریزی کی المقفّٰی، ترجمہ از E. Fagnan: *Centenario Michele Amari*، ۱: ۳۵ بعد میں موجود ہیں؛ (۳) اصلی کتاب کا ایک ضخیم خلاصہ، در عماد الدین ادریس: عیون الاخبار، جلد پنجم کا نصف اوّل؛ (۴) ابن الرقیق نے اپنی گم شدہ تاریخ افریقیہ میں النّعمان کے بیان کا تتبع کیا تھا (دیکھیے اقتباس در النُّوَیری، فاطمیوں کے حالات سے متعلّق حصّے کے آغاز میں؛ قبّ J. A. Silvestre de Sacy: *Exposé de la religion des Druzes*، ۱: ۳۰۳). ابن شدّاد کی تاریخ قیروان میں، جس کا علم ان اقتباسات سے ہوا ہے جو ابن الأثیر، ۸: ۲۳ بعد، النُّوَیری، المقریزی: المقفّٰی، ترجمۂ انگریزی از Fagnan، ص ۴۷-۵۳، ۶۷-۷۸، میں آئے ہیں، متعلقہ باب ابن الرقیق ہی پر مبنی ہے. اس طرح النعمان کا بیان عام تاریخِ اسلام کے بڑے دھارے میں داخل ہوگیا (نیز قبّ ابن حَمادُو (Vonderheyden)، ص ۷؛ ابن خلدون: *Hist. des Berb.*، ۲: ۵۰۹ بعد؛ المقریزی: خِطَط، ۱: ۳۴۹-۳۵۰ و ۲: ۱۰ بعد؛ ابن خلّکان، شمارہ ۱۷۱). عریب کا بیان (جو ابن عذاری: البیان المُغْرِب کی طبعات میں چھپا ہے، یعنی Dozy، ۱: ۱۲۹ بعد؛ Colin و Lévi-Provençal، ۱: ۱۳۴ بعد) النعمان سے ماخوذ نہیں ہے. ابن العذاری (طبع Dozy، ۱: ۱۱۸ بعد، طبع Lévi-Provençal و Colin، ۱: ۱۲۴ بعد) ابو مروان الورّاق، چھٹی صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی

سے (جو بالآخر النعمان ہی پر اعتماد کرتا ہے) اور عریب کا تتبّع کرتا ہے۔ عصرِ حاضر کے بیانات میں سے جو افتتاح کی بازیابی کی وجہ سے متروک ہو چکے ہیں: (۵) F. Wüstenfeld: *Gesch. d. Fatimiden-Chalifen*، گوٹنگن ۱۸۸۱ء، ص ۸ بعد، کا بیان دیکھنے کی سفارش کی جاسکتی ہے۔ ابوعبداللہ کی زندگی کے ان پہلوؤں کے لیے جو امام کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں: قبّ (۶) W. Ivanow: *Rise of the Fatimids*، اشاریہ و مادّہ المہدی عبیداللہ۔

(S. M. STERN)

---

* **ابوعبداللہ یعقوب**: بن داؤد، وزیر اور مُحِبّانِ علی کے ایک خاندان کا فرد۔ ۱۴۵ھ/۷۶۲-۷۶۳ء میں اس نے اپنے بھائی علی کے ساتھ خلیفہ المنصور کے خلاف [امام] ابراہیم اور محمد بن عبداللہ [النفس الزکیہ] کے خروج میں حِصّہ لیا، جس کی پاداش میں اسے قید کر دیا گیا، لیکن ۱۵۹ھ/۷۷۵-۷۷۶ء میں خلیفہ المہدی نے اس کا قصور معاف کر دیا اور وہ خلیفہ کا لطف و کرم حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوگیا، جس کی وجہ از روے روایت یہ تھی کہ اس نے علویوں کے ایک اور حامی کے فرار کا خفیہ منصوبہ آشکار کر دیا۔ یوں خلیفہ کا معتمدِ علیہ اور مشیر بننے کے بعد ۱۶۳ھ/۷۷۹-۷۸۰ء میں اسے ابوعبیداللہ کی جگہ منصبِ وزارت عطا ہوا، لیکن جب اس اقتدار کی بدولت اس نے اپنے علوی دوستوں کو نوازنا شروع کیا تو خلیفہ اس کی روش سے بدگمان ہوگیا۔ یوں بھی دربارِ خلاف میں پہلے ہی اس قسم کی افواہیں مشہور تھیں [کہ وہ در پردہ علویوں کی حمایت کر رہا ہے]؛ چنانچہ کہا جاتا ہے المہدی نے اس کی آزمائش کے لیے ایک علوی کو اس کی تحویل میں دے دیا اور کہا کہ اسے خفیہ طور پر قتل کر دے، لیکن وہ اس کے اشارے سے جان بچا کر بھاگ نکلا۔ جب یہ بات کھل گئی تو خلیفہ نے اسے وزارت سے الگ کرتے ہوئے زندان میں ڈال دیا، جس سے اسے ہارون الرشید ہی نے رہائی دی، مگر اب وہ بالکل اندھا ہو چکا تھا اور اس کی واحد آرزو یہ تھی کہ اسے مکۂ [معظّمہ] بھیج دیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے اس نے وہیں غالبًا ۱۸۶ھ/۸۰۲ء میں وفات پائی۔ ممکن ہے کہ اس کی حکمت عملی فی الحقیقت ایک کوشش ہو عباسیوں اور علویوں میں مصالحت پیدا کرنے کی، جسے اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس کا یہ اقدام، جیسا کہ اسے اپنی زندگی ہی میں معلوم ہوگیا، کیسا خطرناک تھا، اس لیے کہ وہ خود ہی اس کا شکار ہوگیا۔

مآخذ: (۱) الطبری، اشاریہ؛ (۲) الجہشیاری: الوزراء والکتّاب، قاہرہ ۱۹۳۸ء، ص ۱۱۱-۱۲۲؛ (۳) ابن خلّکان، شمارہ ۸۴۰؛ (۴) ابن الطِّقطَقی: الفخری (طبع Derenbourg)، ص ۲۵۰-۲۵۵، ۲۵۷؛ (۵) S. Moscati، در *Orientalia*، ۱۹۴۶ء، ص ۱۶۴-۱۶۷۔

(S. MOSCATI)

---

* **ابوعُبَید البَکْری**: عبداللہ بن عبدالعزیز بن محمد بن ایّوب۔ وہ اور الشریف الادریسی [رکّ بآن] اسلامی مغرب کے سب سے بڑے جغرافیہ نگار ہیں۔ البکری کا شمار پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی میں اُندلس کے عربی علم و فضل کے مخصوص ترین نمائندوں میں ہوتا ہے۔

ہمیں اس کی زندگی کے بہت کم حالات معلوم ہیں، لیکن اس کے باوجود ممکن ہے کہ اس کے علمی مشاغل کے مختلف پہلوؤں کو، جن میں بظاہر وہ تمام و کمال اپنے ہی ملک میں منہمک رہا، بیان کر سکیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بلادِ مشرق، حتّٰی کہ شمالی افریقہ کی بھی کبھی سیاحت نہیں کی تھی، حالانکہ اس نے ان کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ پھر ان معلومات کی رُو سے جو ہم تک پہنچی ہیں اس کی زندگی کے بڑے بڑے واقعات یہ ہیں: اس کا باپ عزّالدولہ عبدالعزیز البکری، وَلْبَہ (Huelva) [رکّ بآن] اور شَلْطِیش (Saltes) [رکّ بآن] کی اس چھوٹی سی ریاست کا ایک ہی (یا شاید اپنے باپ ابومُصعَب محمد بن ایّوب کے بعد دوسرا) رئیس مختار تھا، جس کی بنیاد ۴۰۳ھ/۱۰۱۲ء میں قرطبہ کی مروانی [اموی] خلافت کے زوال پر جزیرہ نمائے آئی بیریا کے جنوبی اوقیانوسی ساحل پر لَبْلَہ (Niebla) کے مغرب میں تھوڑے ہی فاصلے پر رکھی گئی۔ ۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء میں عزّالدولہ المعتضد بن عبّاد [رکّ بہ بنوعبّاد] کے سیاسی دباؤ کے ماتحت وہ مجبور ہوگیا کہ اپنی ریاست تاجدارِ اشبیلیہ (Seville) کے حوالے کر دے۔ ابن عبّاد نے اس کا الحاق اپنے مقبوضات سے کر لیا۔ ہمیں ابوعبید کی تاریخِ ولادت ٹھیک معلوم نہیں، لیکن خیال یہ ہے کہ اس وقت اس کی عمر کم از کم تیس سال ہوگی۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ قرطبہ چلا گیا۔ یہ نئی جاے پناہ اس نے اس لیے منتخب کی تھی کہ وہ کم و بیش مؤثّر طریق پر وہاں کے فرمانروا ابوالولید محمد بن جوہر (قبّ بنوجوہر) کی پناہ میں آجائے۔ بہرحال یہی کچھ ابن حیّان کی بیان کردہ تفصیلات ہیں (المتین، در ابن بسّام: الذخیرۃ، ج ۲، بنقل کردۂ ابن العذاری: البیان، ۳: ۲۴۰-۲۴۲؛ اور Dozy: *Abbad.*، ۱: ۲۵۲-۲۵۳) اور جن کی صحت تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں، گو ایک دوسرے ماخذ (ضمیمۂ البیان، ۳: ۲۹۹) کی رُو سے ابوعبید اور اس کا باپ، جس کا انتقال ۴۵۶ھ/۱۰۶۴ء میں ہوا تھا، اشبیلیہ ہی چلے گئے تھے؛ یہ امر بھی بعید از قیاس نہیں۔ بہرحال ابوعبید نے تھوڑے ہی دنوں میں بطور ایک ممتاز انشاپرداز کے شہرت حاصل کر لی۔ اسے [اندلس کے مشہور] وقائع نگار ابومروان بن حیّان اور بعض دوسرے نامور اساتذہ سے تلمّذ حاصل تھا۔ طوائف الملوک، خصوصًا المیریہ (Almeria) کے بنوصُمادِح کے دربار میں بھی اس کا آنا جانا تھا۔ آگے چل کر جب وہ اپنی متعدّد تصنیفات میں سے، جن کی تیاری کے لیے اس نے بے شمار یادداشتیں فراہم کر رکھی تھیں، بیشتر مکمّل کر چکا تھا، اس نے اندلس میں المرابطون کی عسکری اور سیاسی مداخلت، علٰی ہذا "ملوک الطوائف" کی یکے بعد دیگرے معزولیوں کو دیکھا تو اس نے قرطبہ ہی میں، جسے سلطان یوسف بن تاشفین نے دوبارہ اندلس کا دارالحکومت مقرر کر دیا تھا، مستقل سکونت اختیار کر لی اور وہیں طویل عمر پا کر شوّال ۴۸۷ھ/اکتوبر-نومبر ۱۰۹۴ء میں (بقول الضبّی، جو کہتا ہے کہ اسے

''ذوالوزارتین'' کا خطاب حاصل تھا، ۴۹۶ھ میں) انتقال کر گیا.

ابوعبید البکری کو اگر اس کی تصنیفات کی بوقلمونی سے جانچا جائے تو وہ ایک مکمل قسم کا ''مشارک'' (ہمہ دان) نظر آئے گا، جسے علم وحکمت کی مختلف شاخوں میں بڑی وسیع معلومات حاصل تھیں۔ اس کی زیادہ تر حیثیت ایک جغرافیہ نگار ہی کی ہے، لیکن علاوہ اس کے وہ عالمِ الٰہیات، ماہرِ لسانیات اور عالمِ نباتیات بھی تھا، بلکہ اس نے فن شاعری میں بھی دسترس حاصل کر لی تھی، کیونکہ اس کے بعض سوانح نگاروں نے اس کے کچھ خمریّہ اشعار نقل کیے ہیں اور اسے پکّا شرابی مشہور کر دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کتابوں کا بڑا شوقین تھا اور اپنے قیمتی مخطوطے بڑے نفیس کپڑے کے غلافوں میں محفوظ رکھتا تھا.

مذہبیات کے دائرے میں ابن بَشْکُوال نے اس سے ایک کتاب منسوب کی ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس کا نام کیا تھا۔ اس کا موضوع تھا پیغمبر اسلامؐ کی رسالت کی نشانیاں (''فی اعلام نبوۃ نبیّنا'')۔ عالم لسانیات کی حیثیت سے ابن خیر نے (فہرسۃ، *BAH*، ج ۹-۱۰: ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۴۳، ۳۴۴) اس سے چار تصنیفات منسوب کی ہیں: (۱) ابوعلی القالی [رک بآں] کی تنقید التنبیہ علی اوھام ابی علی فی کتاب النوادر، طبع اے۔ صَلْحِنی جلد، قاہرہ ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۶ء؛ دیکھیے براکلمان: تکملہ، ۱: ۲۰۲؛ (۲) اسی مصنف کی امالی کی شرح، بعنوان سمط اللآلی فی شرح الامالی، طبع عبدالعزیز المیمنی، قاہرہ ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۶ء، قب براکلمان، مقام مذکور؛ (۳) ان اشعار کی شرح جو ابوعبید القاسم بن سلّام کی کتاب الغریب المصنّف میں نقل کیے گئے ہیں، بعنوان صِلۃ المَفْضُوْل؛ (۴) اسی ابو عبید بن سلّام کے مجموعۂ امثال کی شرح، بعنوان فَصْل المقال فی شرح کتاب الامثال (مخطوطات در استانبول، قب *MO*، ۷: ۱۲۳؛ *ZDMG*، ۱۹۱۰ء؛ براکلمان: تکملہ، ۱: ۱۶۶، حاشیہ)؛ آخر الامر ہم ایک اور تصنیف کا ذکر کر سکتے ہیں، جو نیم تاریخی، نیم لسانیاتی ہے اور بظاہر ضائع ہو چکی ہے: المؤتلف والمُخْتَلَف، قبائل عرب کے ناموں پر.

البکری کی نباتیاتی تصنیف کتاب النبات کا ذکر بھی ابن خیر (فَہْرَسَۃ، ۳۷۷) نے کیا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی مخطوطہ ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا؛ بہر حال اسے بھی بیانی (descriptive) نباتیات کے موضوع پر اندلسی تصنیفات کے اس سلسلے میں شامل کرنا پڑے گا جنھیں باعتبار حروفِ تہجی مرتّب کیا گیا ہے اور جس سے چھٹی صدی ہجری/ بارھویں صدی عیسوی کے ''محتسب'' اور عالم طبیعیات ابن عَبْدُوْن [رک بآں] الاشبیلی نے اپنی تصنیف عمدۃ الطبیب فی شرح الاعشاب کی تیاری میں بلا واسطہ استفادہ کیا (قب *Glosario de voces romances* :M. Asín Palacios *registradas por un botánico anónimo hispanomu-sulmán*، میڈرڈ و غرناطہ ۱۹۴۳ء، ج ۲۷، حاشیہ ۱)۔ یہ نباتیاتی تصنیف بھی، جس کا حال ابن ابی اُصیبعہ نے چند سطروں میں بیان کیا ہے (قب M. Mey-erhof: *Esquisse d' histoire de la pharmacologie et botanique chez les Musulmans d' Espagne*، در *al-And.*، ۱۹۳۵ء، ص ۱۴، وہی مصنف: *Un glossaire de matiére médicale de Maïmonide*، در *Mém. Inst. d' Égypte*، ج ۴۱، ۱۹۴۰ء، ص xxvii)، ابن عبدون کی تصنیف کی طرح زیادہ تر جزیرہ نمائے اندلس کی نباتات پر مرکوز تھی۔ اس سے نہ صرف مؤخّر الذّکر نے بلکہ طبیعیات دان الغافِقی اور ابن البیطار نے بھی فائدہ اٹھایا.

ابوعبید البکری کی جغرافی تصنیف، جس سے دراصل عربی دنیا میں اسے شہرت ہوئی، دو کتابوں پر مشتمل ہے، لیکن ان کا نہ حجم مساوی ہے نہ اہمیّت یکساں: معجم ما استعجم اور المسالک والممالک۔ معجم، جسے وُسْٹِنْفِلْڈ (F. Wüstenfeld) نے اپنے دستخط کے ساتھ شائع کیا تھا (Das geogra-phische wörterbuch، گوٹنگن ۱۸۷۶-۱۸۷۷ء، ۴ جلد، قاہرہ ۱۹۴۵-۱۹۵۱ء)، دراصل ایک فہرست ہے زیادہ تر جزیرۃ العرب کے مقامات کے ناموں کی، جن کا ذکر زمانۂ جاہلیت کی شاعری یا کتب احادیث میں آیا ہے اور جن کا تلفّظ متنازعہ فیہ تھا۔ اس فہرست کی ابتدا میں عربِ قدیم کی جغرافی وضع قطع اور اہم ترین قبائل کے مخصوص مساکن پر ایک دلچسپ مقدمہ بھی موجود ہے.

جہاں تک المسالِک کا تعلّق ہے، جو البکری کی سب سے بڑی تصنیف ہے، ابھی تک اس کا صرف ایک ہی حصہ دستیاب ہوا ہے۔ یہ بڑے بڑے طویل اجزا پر مشتمل ہے، جو سب کے سب شائع بھی نہیں ہوئے ہیں۔ مقدمے کی جلد کا بیشتر حصّہ بھی، جس میں عام جغرافیے اور مسلم اور غیر مسلم اقوام سے بحث کی گئی ہے (مخطوطۂ پیرس، مکتبۂ اہلیہ، شمارہ ۵۹۰۵)، ہنوز اشاعت طلب ہے (روسیوں اور سلافیوں پر ایک جزو سینٹ پیٹرز برگ میں ۱۸۷۸ء میں شائع ہوا تھا، از A. Kunik و V. Rosen: *Izvestiya al-Bekri i drugikh avtorov o Rusi i Slavyanakh*، جلد اوّل، قب نیز A. Seippel: *Rerum Normannicorum Fontes Arabici*، اوسلو (Oslo) ۱۸۹۶-۱۹۲۸ء)، لیکن وہ حصّہ جو بلاشبہہ سب سے زیادہ اہم ہے اور جس میں اسلامی مغرب سے بحث کی گئی ہے اس کا، جہاں تک افریقہ کا تعلّق ہے، اس کے فرانسیسی نسخے اور ترجمے کی بدولت (دونوں فرسودہ ہو چکے ہیں) مدّت سے علم ہو چکا تھا، یعنی MacGuckin de Slane: *Description de l' Afrique sept-entrionale*، عربی متن، الجزائر ۱۸۵۷ء، طبع دوم، الجزائر ۱۹۱۰ء؛ فرانسیسی ترجمہ، در *JA*، ۱۸۵۷-۱۸۵۸ء، طبع دوم، الجزائر ۱۹۱۰ء)۔ ایک ملخّص ترجمہ اس سے پیشتر ۱۸۳۱ء میں کاترمیر (Quatremère) پیرس میں شائع کر چکا تھا (*Not. et extraits* ' xii)۔ راقم الحروف نے بھی المسالک کے بعض غیر مطبوعہ حصّے، جو الاندلس کے متعلّق ہیں، شائع کیے اور ان اقتباسات کی شناخت کی جو تاریخی-جغرافی تالیف، بعنوان الرَّوض المِعْطار، از المُنْعِم الحِمْیَری السَّبْتی میں شامل ہیں

(*La péninsule ibérique au Moyen-Age*، لائڈن ۱۹۳۸ء، ص ۲۴۵-۲۵۲؛ [قب نیز احمد الرازی: *La description de l' Espagnê*، در *And.*، ۱۹۵۳ء، ص ۱۰۰ - ۱۰۴)، جس میں اس مخطوطے سے بھی استفادہ کیا گیا جو فاس میں جامع القَرَوِیین کے کتب خانے میں موجود ہے اور جس میں جزیرہ نمائے آئی بیریا کے بیان میں وہ سب سے بڑا اجزو دستیاب ہوا جس کا اب تک پتا چل سکا ہے۔

ابوعبید البکری نے بھی ازمنۂ سابقہ اور خود اپنے عہد کے جغرافیہ نگاروں کے عام اسلوب کے تتبّع میں سب سے پہلے اپنی تصنیف کو، جیسا کہ اس کے نام ''مسالک وممالک'' ہی سے ظاہر ہوتا ہے، بطور ایک راہ نامے (road book) کے تیار کیا، جس میں مختلف شہروں یا منزلوں کی درمیانی مسافتوں کے تخمینے بھی شامل تھے اور جس کا نتیجہ، اگر اس پر اس کی شخصیت کا نقش نہ ہوتا اور جزئیات کے اس انبار سے جو خدا جانے اس نے کس کس طرح جمع کی تھیں خاص خاص چیزوں کا بالامتیاز انتخاب نہ کر لیتا، بجز ناموں کی ایک بے کیف فہرست کے اور کچھ نہ ہوتا، گو اپنی جگہ پر دلچسپ، لیکن محض ایک خاکے پر مشتمل۔ پھر یہ جزئیات محض جغرافی نہیں ہیں۔ ان کا تعلق بڑی حد تک سیاسی اور اجتماعی تاریخ، بلکہ نسل نگاری (ethnography) بھی ہے اور یہی وہ بات ہے جس سے البکری کی المسالک نے اور نہیں تو کم از کم مغرب میں ناقابلِ اندازہ مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ وہ ایک متجسّس اور باقاعدگی پسند انسان تھا، لہٰذا اس نے بعض تاریخی خاکے اس خوبی سے کھینچے ہیں کہ ان کا کوئی مقابلہ نہیں ہوسکتا؛ مثلاً بنوادریس یا المرابطون کے متعلق اس کے بیانات ابھی تک سب سے معتبر اساس ہیں ان تاریخی دستاویزات کی جو اوّل الذکر کے بارے اور مؤخر الذکر کی ابتدا و آغاز کی بحث میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس نے شہروں کے جو حالات بیان کیے ہیں وہ اکثر و بیشتر نہایت صحیح ہیں۔ المغرب، افریقیہ اور بلاد السودان کی اسما نگاری (toponymy) ایسی مکمل ہے کہ اس کی افادیت سے انکار کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔

یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ البکری جب شمالی افریقہ کی گرانقدر کیفیت بیان کر رہا تھا تو اس کے پاس قرطبہ یا اشبیلیہ میں اپنے گھر میں نہ صرف وہ زبانی معلومات موجود تھیں جو افریقیہ یا مغرب سے آنے والوں نے اسے مہیا کیں، بلکہ اس کی نظر ان تصنیفات پر بھی تھی جو بعض دوسرے مصنفین ان اقطاع کے بارے میں لکھ چکے تھے؛ البتہ وہ بنیادی مآخذ جس کا اس نے بالصراحت اپنی تصنیف میں کئی بار ذکر کیا ہے محمد بن یوسف الورّاق کی المسالک والممالک ہے، جس کا موضوع تھا افریقیہ کا جغرافیہ (دیکھیے مادۂ الورّاق اور R. Brunschvig، در *Mélanges Gaudefroy Demombynes*، قاہرہ ۱۹۳۵-۱۹۴۵ء، ص ۱۵۱-۱۵۲)؛ خلیفہ الحکم ثانی کی دعوت پر مستقلاً قرطبہ میں سکونت اختیار کرنے سے قبل وہ دیر تک القیروان میں مقیم رہ چکا تھا، لہٰذا یہ الورّاق ہی تھا جس کی بدولت البکری، جس نے اس کی تصنیف سے استفادہ کیا تھا اور (جواب معلوم ہوتا ہے ناپید ہوچکی ہے)، اس قابل ہوا کہ ہمیں وہ معلومات بہم پہنچائے جن کا سلسلہ دسویں صدی عیسوی تک پہنچتا ہے، علیٰ ہٰذا یہ کہ اپنے لیے حسبِ مطلب مواد فراہم کرے۔ مزید براں قرطبہ کے محافظ خانوں (Archives) کی سرکاری دستاویزات بھی بلاشبہہ اس کے سامنے تھیں (مثلاً بُرغَواطہ [رک بآن] کے ملحد فرقے کے متعلّق)۔ پھر چونکہ اس نے اندلس میں المرابطون کی مداخلت کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا، لہٰذا اس خیال کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ اپنی کتاب المسالک کو البکری ۴۶۰ھ/ ۱۰۶۸ء ہی میں ختم کر چکا تھا، یعنی جنگ الزلّاقہ سے اٹھارہ برس پیشتر۔

لیکن ایک اور ماخذ بھی ہے، جس کی اہمیت الورّاق کی کتاب سے کم نہیں، یعنی ابوعبید کے اپنے ایک استاد احمد بن عمر العُذری کی جغرافی تصنیف، جو دَلایہ (Dalias) کا رہنے والا تھا (اور اسی نسبت سے ابن الدلائی کے نام سے مشہور ہے) اور ۴۷۸ھ/ ۱۰۸۵ء میں المریہ (Almeria) میں فوت ہوگیا (قب *Pén.. ibér.*، ج ۲۴، عدد ۲)۔ اس تصنیف میں، جس کا عنوان نِظام المَرْجان تھا اور جسے بعد میں القزوینی نے بھی بطور ماخذ کے استعمال کیا، عجائب [رک بآن] کو بڑی جگہ دی گئی تھی اور جنھیں البکری نے بھی نظر انداز نہیں کیا۔ آخرالامر ایک اور ماخذ کا بھی ذکر کر دینا ضروری ہے، یعنی ایک ایسی تصنیف جس کے متعلق اب تک معلوم نہیں ہوسکا کہ اسے کس نے لکھا، لیکن جو بالکل ممکن ہے ابوعبید ہی کی اپنی لکھی ہوئی کوئی کتاب ہو، یعنی مجموع المُفْتَرِق، جس سے آگے چل کر ابن العذاری اور المقّری دونوں نے بہت سی معلومات مستعار لیں۔ جہاں تک مسیحی اندلس اور یورپ کے باقی ماندہ حصے کے متعلق اس کے تحریری ماخذ کا تعلق ہے، اس میں قابلِ لحاظ امر یہ ہے کہ اس سلسلے میں ابوعبید نے ہمیشہ (گو بلاشبہہ بوساطتِ العُذری، اس لیے کہ القزوینی نے بھی بالواسطہ اسی کا حوالہ دیا ہے) طُرطُوش (Tortosa) کے ایک یہودی ابراہیم بن یعقوب اسرائیلی الطرطوشی کا حوالہ دیا ہے، جو چوتھی صدی ہجری/ دسویں صدی عیسوی کے شروع میں گزرا ہے، لیکن جس کی تصنیف (جو شاید عبرانی میں قلم بند ہوئی اور پھر اس کا ترجمہ عربی یا لاطینی میں ہوگیا) معلوم ہوتا ہے ضائع ہوچکی ہے۔

البکری کی المسالک کے جو اجزا محفوظ ہیں ان کے ایک مکمل تنقیدی نسخے کی ترتیب اور باقاعدہ مطالعہ از بس ضروری ہے۔ مصنف کی زبان بھی محتاجِ مطالعہ ہے۔ وہ ایسا ہی اندلسی مصنف ہے جیسے وہ مصنفین جنھوں نے رسائل ''حِسبَہ'' پر قلم اٹھایا، مثلاً ابن عبدون الاشبیلی، ابن عبدالرؤف اور السَّقَطی المَلاغی، یا رسائل زراعت پر؛ لہٰذا اس کے ذخیرۂ الفاظ میں سب سے زیادہ ہسپانوی محاورات اور کلمات ہی شامل ہیں۔ دسویں اور گیارھویں صدیوں میں مغرب کی معاشی حالت کے نقطۂ نظر سے (وہ معلومات جن کا تعلق نظامِ وزن و پیمائش، اخراجاتِ زندگی، تجارتی روابط، عام اشیا اور سامانِ تعیُّش کے کاروبار سے ہے) بصورتِ اجزا بھی یہ تصنیف اتنی کثیر الاطلاعات ہے کہ اس کی بنا پر تحلیلی فہرستیں اور نقشے مرتب کیے

جاسکتے ہیں، بعینہٖ جیسے الشریف الادریسی کی نُزْھَۃ المُشْتاق میں، جو قدرے متأخّر زمانے کا ایک دوسرا شاہکار ہے، وہ معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں جن کا تعلّق قرونِ وسطیٰ میں اسلامی دنیا کے تاریخی جغرافیے سے ہے۔

مآخذ: البکری کے سیرتی حالات مختصر اور تفصیلات بہت کم ہیں: (۱) ابن بَشْکُوال: صلۃ، عدد ۶۲۸؛ (۲) الضبّی: بغیۃ، عدد ۹۳۰؛ (۳) ابن الأبّار: الحلّۃ السیراء (Dozy...Corrections، لائڈن ۱۸۸۳ء، ص ۱۱۸ - ۱۲۳)؛ (۴) الفتح بن خاقان: قلائد العِقیان، ص ۲۱۸؛ (۵) ابن سعید: مُغْرِب، جلد ۱، قاہرہ ۱۹۵۳ء، ص ۳۴۷-۳۴۸؛ (۶) ابن بسّام: ذخیرۃ، جلد ۲، (اس کا بیان سابق الذکر نے نقل کیا ہے)؛ (۷) السیوطی: بغیۃ، ص ۲۸۵؛ (۸) ابن ابی اُصَیْبِعَہ، ۲: ۵۲؛ (۹) المَقّری: نفح (*Analectes*)، ۲: ۱۲۵؛ نیز دیکھیے (۱۰) Pons Boigues: *Ensayo*، حاشیہ ۱۲۵؛ (۱۱) J. Alemany Bolufer: *La geografía de la Peninsula ibérica en los escritores árabes*، غرناطہ ۱۹۲۱ء، ص ۴۵-۴۶؛ (۱۲) R. Blachère: *Extraits des principaux géographes àrabes*، پیرس ۱۹۳۲ء، ص ۱۸۳، ۲۵۵ (البکری کی دستاویزی قدر و قیمت اور اسلوب پر ایک مبہم تنقید کے ساتھ)؛ (۱۳) Lévi-Provençal: *La péninsule ibérique au Moyen Age*، لائڈن ۱۹۳۸ء، ص xxi-xxiv؛ (۱۴) براکلمان (Brockelmann)، ۱: ۴۷۶ و تکملہ، ۱: ۸۷۵-۸۷۶؛ بیانات از (۱۵) Reinaud: *Intr. à la Géogr. d' Aboulféda*، ص ciii اور (۱۶) M.G. de Slane، جو اس کی نامکمل طبع کے دیباچے میں ہیں، آج کل بہت فرسودہ ہو چکے ہیں۔ ان معلومات کے لیے جو البکری کی تصانیف میں مشرقی یورپ کے متعلق مذکور ہیں اور اس نے ابراہیم الطُّرطُوشی سے مستعار لیں دیکھیے (۱۷) C. E. Dubler: *Abū Ḥāmīd al-Granadino y su relaci ón de viaje por tierras eurasiàticas*، میڈرڈ ۱۹۵۳ء، ص ۱۶۱-۱۶۲۔

(E. LÉVI - PROVENÇAL)

⊗ **ابو عُبَیْد القاسم**: بن سلّام الہروی، نحوی، فقیہ اور عالمِ قرآن۔ ۱۵۴ھ/ ۷۷۰ء یا اس کے کچھ بعد خراسان کے شہر ہرات میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک رومی غلام تھا، جو خود بھی اچھی طرح عربی نہیں بول سکتا تھا اس نے اپنے آبائی وطن میں ابوعبید کو پہلا سبق دیا۔ ابوعبید ابھی نوجوان ہی تھا جب اس نے بصرے اور کوفے کا سفر کیا تا کہ خلافتِ اسلامیہ کے ابتدائی دور کے علما کی زیرِ نگرانی ادب، فقہ، حدیث اور دینی علوم کی تحصیل کرے (یاقوت: ارشاد، ۶: ۱۶۲)۔ یہیں سرزمین عراق میں اوّل اوّل اس کے وہ عالمانہ مناظرات ہوئے جن سے تشیّع کے خلاف اس کے سنّی عقائد منظرِ عام پر آئے۔ یہ امر کہ ابوعبید نے اپنے اس ارتقائی ماحول اور اس کے ساتھ ہی اپنی شروع شروع کی آزادانہ علمی کاوشوں کو کب خیرباد کہا، ہم اس کے متعلق قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بہرحال ابوعبید پھر خراسان واپس آ گیا (ابن الندیم: الفہرست، ۷۰) اور مشہور سپہ سالار ہَرْثَمہ کے خاندان میں اتالیقی اختیار کی، جو ۱۹۱ھ/ ۸۰۶ء (طبری، ۳: ۱۰۱۳) میں اس صوبے کا والی مقرر ہوا تھا، جس کا دارالخلافہ نیشاپور تھا۔ بایں ہمہ ابوعبید کا قیام یہاں زیادہ دیر تک نہیں رہا، گو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس وقت ملک میں سیاسی اضطراب رونما تھا، اس لیے کہ ۱۹۲ھ/ ۸۰۷-۸۰۸ء ہی میں اسے شاید طاہر بن الحسین کی سفارش پر، جس کی خوشنودی وہ مرو ہی میں ایک ملاقات پر حاصل کر چکا تھا (خطیب: تاریخ بغداد، ۱۲، ۴۰۵)، طرسوس کا قاضی مقرر کر دیا گیا (ابن قتیبہ: المعارف، ص ۴۷۲) اور جہاں اس عہدے کے دوران میں، جس کی مدت اٹھارہ سال تھی، اس کے تعلقات وہاں کے والی ثابت بن نصر سے اتنے دوستانہ تھے کہ اس کی وفات (۲۰۸ھ/ ۸۲۳ء) پر بھی وہ اس کے بیٹے کا مخلص دوست اور مشیر رہا (السبکی: طبقات، ۱: ۲۷۱)؛ لیکن اس زمانے میں وہ کوئی علمی کام نہیں کر سکا (خطیب، ۲: ۴۱۳) اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے عہدے سے (نواح ۲۱۰ھ) سبکدوش ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے اس کے فوراً بعد وہ مصر چلا گیا۔ بہرحال ابن حجر (تہذیب، ۸: ۳۱۵) نے ۲۱۳ھ/ ۸۲۸-۸۲۹ء میں یہاں اس کی درس و تدریس میں مصروفیت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد ابوعبید دارالخلافت بغداد میں، جو اس وقت اسلامی دنیا کا سیاسی ہی نہیں بلکہ ثقافتی مرکز بھی تھا، واپس آ گیا، جہاں خراسان کے مشہور والی عبداللہ بن طاہر کے حلقے میں اس کا بہ عزت خیر مقدم کیا گیا، اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ ابوعبید اپنے علمی مُربّی عبداللہ کے پاس نیشاپور چلا گیا ہو، کیونکہ یہیں کرج میں ابودلف نے اس سے ملاقات کی ہوگی (ابن الانباری: نزھۃ، ص ۱۹۰)۔ زندگی کے آخری ایام میں (۲۱۹ھ/ ۸۳۴ء، النّووی: تہذیب، ص ۴۶۷) اس کہن سال متقی نے، جو رات کا ایک تہائی حصہ عبادت، ایک تہائی استراحت اور ایک تہائی اپنی تصنیف و تالیف میں صرف کرتا تھا (ابن خلّکان، ۳: ۴۸۸) ایک بار پھر سفرِ حج اختیار کیا اور وہ ایک خواب کی بنا پر، جس میں اسے رسول [اکرم صلی اللہ علیہ وسلم] کی زیارت ہوئی، تادمِ وفات، جو محرم ۲۲۴ھ/ ۸۳۴ء میں واقع ہوئی، مکۂ [معظّمہ] ہی میں مقیم رہا۔

بقول صاحبِ الفہرست (ص ۷۱) ہمیں ابوعبید کی جن بیس کتابوں کے نام معلوم ہیں ان میں سے کچھ دستیاب بھی ہوئی ہیں اور کچھ شائع بھی ہو چکی ہیں، مثلاً فقہ میں اس کی اہم تصنیف کتاب الاموال (قاہرہ ۱۳۵۳ھ) اور ایسے ہی اس کی کتاب الامثال، جسے ادب میں ایک معیاری حیثیت حاصل ہے (الخطیب، ۱۲: ۴۰۴؛ ابن القِفْطی: انباہ، ۱: ۱۰۸)۔ اس کتاب میں، جیسا کہ اس قسم کی اس کی دوسری تصنیفات (کتاب غریب الحدیث اور غریب المصنف) میں اس کا معمول رہا ہے، اس نے ایسی معلومات استعمال کی ہیں جنھیں قبل ازیں لغت اور دوسرے علوم کے ماہر یک جا کر چکے تھے؛ لہٰذا اس کا یہ طریقِ کار اس امر کا ثبوت ہے کہ اس نے اپنے آپ کو کسی خاص مسلک کا پابند نہیں کیا، بالفاظ دیگر اس کی نظر انتخابی تھی۔ عام طور پر لوگ اس کا شمار بصری نحویوں میں کرتے ہیں، لیکن الزَّبیدی

نے اس کے برعکس طبقات (ص ۲۱۷) میں اس کا مسلک کوفی ٹھیرایا ہے۔ ضرب الامثال پر اس کی مذکورۂ بالا کتاب کے علاوہ ذیل کی تصنیفات بالخصوص مشہور ہیں:-

(۱) کتاب غریب الحدیث، یہ ایک ضخیم کتاب ہے، جو چالیس سال کی محنت میں تیار ہوئی اور جسے اس نے عبداللہ بن طاہر کے نام معنون کیا اور اس کے صلے میں اسے دس ہزار درہم ماہانہ کا وظیفہ عطا ہوا۔ عبدالعزیز بن عبداللہ بن ثعلبہ (م ۴۶۵ھ، دیکھیے ابن القفطی، ۲: ۱۸۳) نے اسے حروفِ تہجّی کے اعتبار سے مرتب کیا اور علی بن عبداللہ بن محمد العُقَیلی (م ۵۴۶ھ، دیکھیے ابن القفطی، ۲: ۲۸۵) نے نظم کا جامہ پہنایا۔

(۲) کتاب غریب المصنف، سب سے پہلی ضخیم لغت ہے، جو ابن سِیدہ کی کتاب کی طرح باعتبار مضامین مرتب ہوئی۔

(۳) غریب القرآن۔

ابو عبید نے ایسی معیاری کتابیں لکھی ہیں جو آنے والی نسلوں کے لیے باعث تعجب ہوئیں۔ انھوں نے ان سے استفادہ کیا اور وہ بطورِ سند بھی پیش کی گئیں۔ مسائلِ علم میں اس کی راست بازی اور دیانت داری اور ان مسائل کی تحقیق و تدقیق میں اس کی مسلّمہ مہارت اس کی ہر تصنیف سے مترشح ہوتی ہے (السیوطی: بغیة، ص ۳۷۶؛ ابن سعد: طبقات، ۷/ ۲: ۹۳)۔

مآخذ: علاوہ ان مآخذ کے جن کا حوالہ متن میں دیا گیا ہے مندرجۂ ذیل قابلِ ذکر ہیں: (۱) الأزہری: تہذیب اللغة (در *Le Monde Oriental*، ۱۹۲۰ء، ۱۴: ۱۹-۲۰)؛ (۲) ابن ابی یعلی الفرّاء: طبقات الحنابلة، ص ۱۹۰-۱۹۲؛ (۳) الذہبی: تذکرة الحفّاظ، ۲: ۶-۷؛ (۴) الیافعی: مرآة الجنان، ۲: ۸۳-۸۶؛ (۵) اسمٰعیل پاشا البغدادی: ہدیة العارفین، (استانبول ۱۹۵۱-۱۹۵۵ء)؛ (۶) G. Flügel: *Die Grammatischen Schulen der Araber*، (لائپزگ ۱۸۶۲ء)، ص ۸۵-۸۷؛ (۷) M. J. de Goeje، در *ZDMG*، ۱۸۶۴ء، ص ۷۸۱-۸۱۴؛ (۸) (براکلمان) Brockelmann، ۱: ۱۰۵-۱۰۷ و تکملہ ۱: ۱۶۶-۱۶۷؛ (۹) O. Rescher: *Abriss der arabischen Literaturgeschichte*، شٹٹ گارٹ (Stuttgart ۱۹۳۳ء)، ۲: ۱۳۹-۱۴۲؛ (۱۰) H. Gottschalk، در *Der Islam*، ۱۹۳۶ء، ص ۲۴۵-۲۸۹؛ (۱۱) A. Spitaler، در *Documenta Islamica Inedita* (برلن ۱۹۵۲ء)، ص ۱-۲۴ (فضائل القرآن کے ایک حصّے کی طباعت)؛ (۱۲) Kraemer، در *Oriens*، ۱۹۵۳ء، ص ۲۰۹ بعد؛ (۱۳) R. Sellheim: *Die Klassisch-arabischen Sprichwörtersammlungen, insbesondere die des Abū 'Ubaid* (ŝ-Gravenhange,1954)؛ (۱۴) ابن الجزری: غایة النہایة، شمارہ ۲۵۹۰۔

(RUDOLF SELLHEIM)

✱ **ابو عُبَیْد اللہ**: معاویہ بن عبید اللہ بن یَسار الاشعری، وزیر، جسے خلیفہ المنصور نے اپنے بیٹے المہدی کے ملازمین رکاب میں منسلک کیا اور پھر جب المہدی تخت نشین ہوا (۱۵۸ھ/ ۷۷۵ء) تو اس نے اسے وزیر مقرر کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے وہ اس عہدے پر ۱۶۳ھ/ ۷۷۹-۷۸۰ء تک متمکن رہا، لیکن ۱۶۱ھ/ ۷۷۷-۷۷۸ء ہی میں جب اس کے بیٹے محمد پر زندقہ کا الزام قائم ہوا اور آخر الامر اسے قتل کر دیا گیا تو اس کا منصب خطرے میں پڑ گیا، حتّٰی کہ دربار کے بارسوخ حاجب الرَّبیع بن داؤد کی عداوت نے اس کے زوال کی انتہا کر دی۔ اسے وزارت سے برطرف کر دیا گیا اور یہ عہدہ اب یعقوب بن داؤد کو ملا، گو اس کے باوجود ۱۶۷ھ/ ۷۸۳-۷۸۴ء تک دیوان الرسائل اسی کی تحویل میں رہا۔ اس کا سالِ وفات ۱۷۰ھ/ ۷۸۶-۷۸۷ء ہے۔

جملہ مآخذ اس پر متفق ہیں کہ ابو عبید اللہ نہایت بلند پایہ انسان اور بہت قابل اور دیانت دار تھا۔ [اس کا شمار اربابِ علم و فضل میں ہوتا ہے]۔ ابن الطِّقطقی نے ابو عبید اللہ کے تنظیمی اور انتظامی کارناموں کا حال بیان کیا ہے، جن میں سے آخری کارنامہ وہ ہے جس کا تعلّق خراج کی اصلاح سے تھا اور جس کے ماتحت سواد العراق سے خراج زمین کے بجائے پیداوار پر پیداوار ہی کی شکل میں متناسب لگان عائد کر دیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے ابو عبید اللہ نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی۔

مآخذ: (۱) الیعقوبی، بہ امداد اشاریہ؛ (۲) الطبری، بہ امدادِ اشاریہ؛ (۳) الجہشیاری: وزراء (قاہرہ ۱۹۳۸ء)، ص ۱۰۲-۱۱۸؛ (۴) الأغانی، فہارس؛ (۵) ابن خلّکان، ۱۱: ۸۸ [مطبوعۂ قاہرہ ۱۳۱۰ھ، ۲: ۳۳۳]؛ (۶) ابن الطِّقطقی: الفخری (طبع Derenbourg)، ص ۲۴۶-۲۵۰؛ (۷) S. Moscati، در *Orientalia*، ۱۹۴۶ء، ص ۱۶۲-۱۶۴۔

(S. MOSCATI)

✱ **ابو عُبَیْدَہ التَّیْمِی**: رَكّ بہ اباضیّہ۔

⊗ **ابو عبیدہؓ**: عامر بن عبداللہ بن الجراح، امین الامّة لقب۔ ان کی والدہ کا نام اُمیمہ بنت غَنم بن جابر تھا۔ ان کے باپ عبداللہ بحالتِ کفر غزوۂ بدر میں انھیں کے ہاتھوں مقتول ہوے (تہذیب التہذیب)؛ ماں مسلمان ہو گئی تھیں اور ان کا شمار صحابیات میں ہوتا ہے۔

بروایتِ واقدی غزوۂ بدر میں حضرت ابو عبیدہؓ کی عمر اکتالیس سال تھی، لہٰذا آغازِ اسلام میں ۲۸ سال، اور اس طرح وہ گویا حضرت عمرؓ کے ہم سن تھے۔ ان کا شمار ان صحابہ میں ہوتا ہے جو اپنی کنیت سے مشہور ہوے (الاستیعاب)۔ وہ السّابقون الاوّلون اور عشرۂ مبشّرہ میں سے ہیں اور ان کے لقب (امین الامّہ) کا ذکر صحیح بخاری میں موجود ہے۔ انھوں نے عثمانؓ بن مظعون، عبدالرحمٰنؓ

بن عوف اور ان کے رفقا کے ساتھ اسلام قبول کیا۔ یہ دعوے شاید صحیح نہیں کہ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی دعوت پر ایمان لائے۔ یہ امر بھی کہ وہ ارضِ حبشہ کی دوسری ہجرت میں شریک تھے محلِ نظر ہے۔ اس سلسلے میں مختلف روایات ملتی ہیں۔انھوں نے مکۂ معظّمہ میں وہ سب اذیتیں برداشت کیں جو حلقہ بگوشانِ اسلام کو کفار کے ہاتھوں پہنچیں۔انھوں نے مدینۂ منورہ ہجرت فرمائی تو جیسا کہ ابن سعد نے روایت کی ہے (بحوالۂ واقدی) حضرت کلثومؓ بن ہدم کے یہاں قیام فرمایا۔ پھر اگرچہ اس بارے میں روایات مختلف ہیں، لیکن ان میں سے ایک کی رو سے ان کا رشتۂ مؤاخات حضرت ابوطلحہؓ سے جوڑا گیا اور ہمارے نزدیک یہی روایت سب سے زیادہ صحیح ہے۔ صحیح بخاری میں اگرچہ ان کا نام اصحابِ بدر میں شامل نہیں، لیکن اس کے باوجود ابن عبدالبر (الاستیعاب) کا یہ بیان نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت ابوعبیدہؓ کی شرکتِ بدر وحدیبیہ میں کسی کو اختلاف نہیں۔ فدویتِ اسلام کا یہی جذبہ تھا جو غزوۂ اُحد میں بھی پوری شان کے ساتھ نمایاں ہوا، جس میں ان کے پائے استقلال کو مطلق جنبش نہیں ہوئی۔ ربیع الثانی ۶ھ میں انھیں قبیلۂ ثَعْلَبَہ وانْمار کی سرکوبی پر مامور کیا گیا۔ یہ لوگ اطرافِ مدینہ میں غارت گری کیا کرتے تھے۔ انھوں نے ان کے مرکزی مقام ذی القَصَّہ پر چھاپا مارا، جس سے غارت گروں کی یہ جمعیت پہاڑوں میں منتشر ہوگئی، البتہ ایک شخص گرفتار ہوا اور اس نے بطیب خاطر اسلام قبول کرلیا (ابن سعد)۔ حدیبیہ (۶ھ) کے صلح نامے میں بھی ان کے دستخط بطورِ گواہ شامل تھے۔ انھوں نے ذات السلاسل (۷ھ)، سیف البحر (رجب ۸ھ) اور غزوۃ الفتح (رمضان ۸ھ) میں بھی حصہ لیا۔اس آخری غزوے میں فوج کے ایک حِصّے کی امارت ان کے سپرد تھی۔ ۹ھ میں جب وفدِ نجران یمن واپس گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بھی تبلیغ اسلام اور صدقات کی وصولی کے لیے اس کے ساتھ روانہ کیا۔ یہی موقع تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے، جیسا کہ روایات سے مترشح ہوتا ہے، ان کو امین الامّۃ کہا۔ پھر اسی سال ۹ھ میں انھوں نے جزیے کی وصولی کے لیے بحرین کا سفر کیا (بخاری)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر جب انصار نے سقیفۂ بنی ساعدہ میں خلافت کا سوال اٹھایا اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ان سے گفتگو کرنے کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت ابوعبیدہؓ بھی ان کے ساتھ تھے (بخاری)۔ یہیں سقیفہ میں تقریر کرتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تھا: ''تم لوگ عمرؓ بن الخطاب یا ابوعبیدہؓ میں سے کسی کی بیعت کرلو!'' (حوالۂ مذکورہ)۔ یہی روایت 'کتاب الحدود'، ب ۳۱، میں بھی موجود ہے اور اس کے الفاظ ہیں: ''اور میں تمھارے لیے ان دو شخصوں میں سے کسی ایک کو پسند کرتا ہوں۔ تم ان دونوں میں سے جس سے چاہو بیعت کرلو''۔ پھر انھوں نے حضرت عمرؓ کا اور ابوعبیدہؓ بن الجراح کا ہاتھ پکڑ لیا اور خود بیٹھ گئے۔ الیعقوبی (۲: ۱۳۷) میں حضرت ابوعبیدہؓ کی یہ گفتگو بھی منقول ہے کہ جب زیادہ اختلاف پیدا ہوا اور شور وشغب بڑھا تو وہ اٹھے اور انصار سے فرمایا: ''اے گروہ انصار! تم نے سب سے پہلے امداد واعانت کا ہاتھ بڑھایا تھا، اس لیے تمھیں اختلاف وافتراق کی طرح نہ ڈالو''۔ بالآخر جب حضرت ابوبکرؓ کی بیعت پر اجماع ہوا تو حضرت ابوعبیدہؓ بہتوں سے آگے تھے، چنانچہ بخاری: کتاب الحدود میں حضرت عمرؓ کی جو تقریر منقول ہے اس میں تصریحًا کہا گیا ہے کہ سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے بیعت کی تھی، پھر ان کے بعد مہاجرین اور پھر انصار نے۔

۱۳ھ کے آغاز میں جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شام پر لشکر کشی کی تو حضرت ابوعبیدہؓ نے بھی سات ہزار سپاہیوں کے ساتھ (الطبری) مَعْرِقَہ کے راستے (حوالۂ سابق) شام کا رخ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے انھیں حمص کی فتح کے لیے نامزد فرمایا تھا۔ انھوں نے تھوڑی دور تک پیدل ان کی مشایعت بھی کی۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے یرموک سے گزرتے ہوئے اول بُصرٰی کو محاصرے میں لے لیا اور پھر ادائگی جزیہ پر صلح کے بعد دمشق روانہ ہوئے، جہاں سب اسلامی فوجیں جمع ہو رہی تھیں تا کہ قیصر کی جنگی تیاریوں کا مقابلہ کریں۔ اوّل اجنادین کا معرکہ پیش آیا، جس میں حضرت خالدؓ بن الولید بھی حضرت ابوعبیدہؓ کے ساتھ شریک تھے اور جس میں رومیوں کی شکست فاش کے بعد (۱۳ھ) اسلامی فوجوں نے دمشق کا محاصرہ کرلیا۔ یہ محاصرہ جاری تھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے وفات پائی (۲۲ جمادی الاُخرٰی ۱۳ھ) (ابن سعد)؛ گویا دمشق حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں فتح ہوا۔ دورانِ محاصرہ میں جب ایک روز حضرت خالدؓ کمند کے ذریعے فصیل شہر پر چڑھ گئے تو حضرت ابوعبیدہؓ شہر کے دروازے پر فوج لیے کھڑے تھے۔ ادھر حضرت خالدؓ نے نیچے اُتر کر دروازہ کھولا اور ادھر حضرت ابوعبیدہؓ شہر میں داخل ہوگئے۔ اب ان کی فوج سارے شہر میں پھیل رہی تھی۔ اہلِ شہر نے یہ حالت دیکھی تو باقی دروازے بھی کھول دیے اور اطاعت تسلیم کرلی (۱۴ھ)۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کا آغاز رجب ۱۳ھ میں ہوا تھا۔ انھوں نے زمامِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہی ایک فرمان جاری کیا جس کی رُو سے حضرت ابوعبیدہؓ شام کے سپہ سالار اعظم مقرر ہوے اور حضرت خالدؓ کو، جو اب تک اسلامی لشکروں کی قیادت فرمارہے تھے، اس عہدے سے معزول کردیا گیا۔ ان کی معزولی کے بارے میں کوئی بھی راے قائم کی جائے اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت ابوعبیدہؓ نے اس منصب کے فرائض، جو اب ان کے ذمے کیا گیا تھا، بڑی خوبی سے سرانجام دیے۔ انھوں نے ثابت کردیا کہ ان میں ویسی ہی جنگی اور انتظامی قابلیت اور وہی صفات موجود ہیں جو قیادت کا خاصّہ ہیں۔ بحیثیتِ سپہ سالارِ شام انھوں نے سب سے پہلے اس رومی لشکر کو شکست فاش دی جو فحل میں جمع ہو رہا تھا اور پھر آگے بڑھ کر مَرْج الرّوم پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد انھوں نے حمص کا رخ کیا اور باوجود شدید سردی اور برف باری کے اسے محاصرے میں لے لیا۔ رومیوں کا خیال تھا کہ محاصرین شاید جاڑے کی تاب نہیں لاسکیں گے اور اس لیے وہ قلعہ بند ہوکر بیٹھ گئے۔ بایں ہمہ حضرت ابوعبیدہؓ کے پاے استقامت میں فرق نہیں آیا اور انھوں نے محاصرہ جاری رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ بہار کا آغاز ہوا تو محصورین کے دل ٹوٹ گئے اور انھوں نے ادائگی جزیہ پر صلح کرلی (۱۴ھ)۔ حمص فتح ہوا تو حماۃ، شَیْزَر اور معرۃ النّعمان نے

بھی یکے بعد دیگرے اطاعت قبول کرلی۔ لاذقیہ بھی ایک معمولی سی مہم کے بعد فتح ہوگیا، جس کی سرداری خود حضرت ابوعبیدہؓ نے کی۔ ان کا خیال تھا کہ کیوں نہ ہرقل کے پائے تخت پر حملہ کردیا جائے، لیکن بارگاہِ خلافت سے حکم پہنچا کہ اس سال مزید پیش قدمی نہ کی جائے؛ لہٰذا حضرت ابوعبیدہؓ حمص واپس آگئے اور ۱۵ رجب تک، جب یرموک کی فیصلہ کن جنگ پیش آئی، وہیں مقیم رہے۔ اس جنگ میں، جیسا کہ سب کو معلوم ہے، شام کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا۔ بات یہ ہے کہ رومی جب شکست پر شکست کھا کر انطاکیہ پہنچے تو انھوں نے ہرقل سے فریاد کی کہ عربوں نے سارا شام فتح کرلیا ہے، انھیں روکنے کی کوئی تدبیر کی جائے۔ اس پر قیصر نے جملہ مقبوضاتِ سلطنت مثلاً قسطنطینیہ، الجزیرہ، اَرمینیہ، وغیرہ، غرض یہ کہ ہر کہیں سے فوجیں طلب کیں تاکہ حملہ آوروں کی طاقت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کردیا جائے۔ ہرقل کا خیال شاید یہ تھا کہ عربوں کے قبضۂ شام کی نوعیت محض فوجی ہے اور مقصد صرف غارت گری۔ لہٰذا یہ ممکن ہے کہ انھیں شکست دے کر پھر صحرا میں واپس دھکیل دیا جائے۔ وہ گویا واقعات کا قیاس اس آویزش کی بنا پر کررہا تھا جو ایران و روم میں صدیوں سے جاری تھی اور جس میں قبائل عرب کو اکثر عراق وشام پر یورش کا موقع ملتا۔ وہ نہیں سمجھا کہ تاریخ اپنا ورق الٹ چکی ہے اور امورِ عالم میں اب ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ بہرحال حضرت ابوعبیدہؓ حمص ہی میں تھے جب انھیں ہرقل کے اس ارادے کی خبر پہنچی، لہٰذا باہم مشورہ ہوا اور طے پایا کہ جملہ اسلامی فوجیں دمشق میں جمع ہوں؛ چنانچہ حمص خالی کردیا گیا اور حضرت ابوعبیدہؓ دمشق روانہ ہوئے۔ یہی موقع تھا جب اہلِ حمص کو جزیے کی وہ ساری رقم واپس کردی گئی جو ان سے وصول کی گئی تھی اور ایسے ہی ان شہروں کو بھی جو خالی کیے جارہے تھے، اس لیے کہ جزیے کی وصولی کے باوجود شہروں کو بے حفاظت چھوڑ دینا نقضِ عہد کے مرادف ہوتا۔ شرائط معاہدہ کی پابندی اور رواداری کی ایسی کوئی دوسری مثال تاریخِ عالم میں شاید ہی ملے، لہٰذا کوئی تعجب نہیں اگر باوجود اختلافِ مذہب اہلِ شام نے مسلمانوں کو اپنے جابر اور مستبد حکمرانوں کے مقابلے میں نجات دہندہ تصوّر کیا اور جب ہرقل کی جنگی تیاریوں کی خبر پھیلی تو اردن کے بعض اضلاع نے بغاوت کردی۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے جب ان سب واقعات کی اطلاع حضرت عمرؓ کو دی تو جواب ملا کہ اسلامی فوجیں ثابت قدم رہیں۔ انھوں نے حضرت ابوعبیدہؓ کو اطمینان دلایا کہ کمک آرہی ہے یہ کمک اس وقت پہنچی جب اسلامی فوجیں دمشق سے ہٹ کر دریاے یرموک پر صف آرا تھیں اور طرفین میں جنگ جاری تھی۔ بالآخر، جیسا کہ ہر کوئی جانتا ہے، جنگ یرموک کا خاتمہ مسلمانوں کی فتح پر ہوا اور ہرقل رومیوں کی شکست فاش اور مسلمانوں کی اس فتح عظیم کی خبر سن کر شام کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر قسطنطینیہ روانہ ہوگیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے بارگاہِ خلافت میں نامۂ فتح ارسال کیا اور ایک سفارت بھی بھیجی جس میں حضرت حُذَیفہؓ بھی شامل تھے۔

یرموک کے بعد قِنَّسرین فتح ہوا، پھر حلب اور پھر انطاکیہ۔ اس کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ بیت المقدس روانہ ہوگئے، جس کا حضرت عمروؓ بن عاص نے ان کی آمد سے پہلے محاصرہ کررکھا تھا۔ بیت المقدس، جیسا کہ سب کو معلوم ہے، حضرت عمرؓ کی تشریف آوری پر مسلمانوں کے حوالے کیا گیا۔ ۱۷ھ میں عیسائیوں نے حمص پر دوبارہ فوج کشی کی، لیکن ناکام رہے۔ یہ آخری معرکہ تھا جو حضرت ابوعبیدہؓ کو اپنی زندگی میں پیش آیا۔ بحیثیت امیرِلشکر انھوں نے اپنی فوجی اور انتظامی ذمے داریوں کے علاوہ اس امر کا بھی بالخصوص خیال رکھا کہ اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی تعلیم وتربیت سے غافل نہ رہیں؛ چنانچہ ان کے اشارے سے بعض مفتوحہ شہروں میں حلقہ ہاے درس قائم ہوے، جن میں صحابہؓ قرآن پاک کی تعلیم دیتے اور فقہی مسائل حل کرتے تھے۔ عام الرّمادہ میں جب حضرت عمرؓ نے ہر طرف سے امداد طلب کی تو سب سے پہلے حضرت ابوعبیدہؓ ہی نے ان کی آواز پر لبیک کہا اور غلّے سے لدے ہوے چار ہزار اونٹ لے کر خود بارگاہِ خلافت میں حاضر ہوے۔ اسی سال (۱۸ھ) جب عمواس کی وبا پھیلی تو حضرت عمرؓ شام تشریف لے گئے تاکہ حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح اور ان کے رفقا سے مشورے کے بعد یہ طے کرسکیں کہ وبا سے بچنے کے لیے کیا اقدام کرنا چاہیے اور حضرت ابوعبیدہؓ کہاں قیام پذیر ہوں۔ رائے یہ ہوئی کہ بہتر ہوگا اگر اسلامی فوجیں طاعون زدہ علاقے سے ہٹ جائیں۔ حضرت عمرؓ کو اس رائے سے اتفاق تھا، لیکن حضرت ابوعبیدہؓ کو اختلاف۔ انھوں نے کہا: ''کیا آپ تقدیرِالٰہی سے بھاگ رہے ہیں؟'' حضرت عمرؓ نے جواب دیا: ''ابوعبیدہؓ! کاش تمھارے علاوہ کسی اور نے یہ بات کہی ہوتی! ہم تقدیرِالٰہی سے تقدیرِالٰہی ہی کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ تمھیں کہو اگر تمھارے پاس کچھ اونٹ ہوں اور تم کسی ایسی وادی میں جا اترو جس کے دو کنارے ہوں — ایک سرسبز وشاداب، دوسرا بے آب وگیاہ — تو کیا سرسبز حصے میں اونٹ چرانا قضاے الٰہی کے موافق نہ ہوگا؟'' بایں ہمہ حضرت ابوعبیدہؓ اپنی راے پر قائم رہے۔ حضرت عمرؓ مدینۂ منورہ واپس آگئے اور حضرت ابوعبیدہؓ کو لکھا کہ وہ لشکر کو کسی بلند مقام پر لے جائیں، لیکن اسی اثنا میں خود ان پر وبا کا حملہ ہوچکا تھا اور انھوں نے اسی میں انتقال فرمایا۔ ان کی عمر اس وقت اٹھاون برس تھی۔ حضرت معاذؓ ابن جبل نے تجہیز وتکفین کا سامان کیا اور ایک بڑی پُردرد تقریر کی۔ حضرت معاذؓ نے کہا: ''آج ہم میں سے ایک ایسا شخص اٹھ گیا ہے جس سے زیادہ صاف دل، زیادہ بے کینہ، زیادہ سیر چشم اور خلق خدا کے لیے زیادہ خیرخواہ، خدا کی قسم! میں نے کسی کو نہیں دیکھا! آپ سب اس کے لیے رحم اور مغفرت کی دعا کریں!'' (الاصابۃ)۔ حضرت ابوعبیدہؓ کہاں دفن ہوے؟ اس کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ وہ فَحل میں، جو اردن کے نواح میں ہے، دفن ہوے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کی قبر بَیسان میں ہے۔ الاصابۃ میں دونوں روایتیں منقول ہیں۔ اسد الغابۃ میں عَمْواس کا نام بھی آیا ہے، جو رَملہ سے بیت المقدس کی جانب چار فرسخ کی مسافت پر واقع ہے۔

حضرت ابوعبیدہؓ کا تقوٰی، ان کی سادگی اور زہد، تواضع اور انکسار، شجاعت

اور ہمت، ایثار اور رحم دلی، خوش خلقی اور زندہ دلی صحابہؓ کی پوری جماعت میں نمایاں تھی۔ اللہ کی اطاعت، حبِّ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اتباعِ سنت میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ان کی ذات اسلامی مساوات، اخوّت اور رواداری کی ایک روشن مثال تھی۔ ان کی شفقت اور رعایا پروری سب کے لیے یکساں تھی؛ چنانچہ قرآن پاک نے جس رواداری، اصلاح اور خیرکوشی کی تعلیم دی ہے اس کا انھوں نے اپنے زمانۂ امارت میں ہر طرح سے خیال رکھا۔

حضرت ابوعبیدہؓ کا شمار ان صحابہ میں ہوتا ہے جن کی فطری صلاحیتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ تربیت سے اور زیادہ چمک اٹھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی ذات پر جو اعتماد تھا اس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی طرف کہ ''ابوعبیدہؓ امین الامت ہیں'' اشارہ کر دینا ہی کافی ہے۔ وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دست راست تھے۔ ان کی وجاہتِ ذات سے انکار کرنا ناممکن ہے؛ چنانچہ محض یہ امر کہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں خود حضرت ابوبکرؓ نے ان کا نام خلافت کے لیے پیش کیا اس امر کی دلیل ہے کہ انھیں مہاجرین اور انصار میں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ مزید براں سیاسی اور اجتماعی معاملات میں بھی ان کی شخصیت کو بڑا دخل تھا۔ حضرت عمرؓ کے تو وہ معتمد خاص تھے اور وہ ان کی انتظامی اور جنگی قابلیتوں سے ہمیشہ مطمئن رہے۔

مآخذ: (۱) حدیث: (الف) بخاری، فضائل اصحاب النبی، باب ۲۱؛ المغازی، باب ۷۲؛ اخبار الاحاد، باب ۱؛ (ب) مسلم، فضائل الصحابہ، حدیث ۵۳؛ (ج) ابوداؤد، السنّۃ، باب ۸؛ (د) ترمذی، المناقب، باب ۲۵؛ (ہ) احمد بن حنبل، ۱: ۱۹۳، ۱۹۶ (و) ابن ماجہ، المقدمہ، باب ۱۱؛ (۲) ابن ہشام، ص ۹۹۲؛ (۳) ابن سعد: طبقات، ۳/۱: ۲۹۷، ۳۰۱؛ (۴) الیعقوبی: تاریخ، ۲۰: ۱۳۷، ۱۳۹، ۵؛ (۵) الطبری: تاریخ، بہ اِمداد اشاریہ؛ (۶) ابن عبدالبر: الاستیعاب ۲: ۶۸۹؛ (۷) ابن الأثیر: اسد الغابۃ، مصر ۱۲۸۶ھ، ۳: ۸۴؛ (۸) ابن حجر: الاصابۃ، ۲: ۲۴۵؛ (۹) وہی مصنف: تہذیب، ۱۵، ۷۳؛ (۱۰) الخمیس، ۲: ۲۴۴؛ (۱۱) حلیۃ الاولیاء، ۱: ۱۰۰؛ (۱۲) البدایۃ والنہایۃ، ۷: ۹۴؛ (۱۳) البدء و التاریخ، ۵: ۸۷؛ (۱۴) ابن عساکر، ۷: ۱۵۷؛ (۱۵) صفۃ الصفوۃ، ۱: ۱۴۲؛ (۱۶) اشہر مشاہیر الاسلام، ص ۵۰۴؛ (۱۷) الریاض النضرۃ، ۲: ۳۰۷.

(سعید انصاری و ادارہ)

---

* **ابوعُبَیْدہ:** مَعْمَر بن المثنّٰی، عرب ماہرِ لسانیات، ۱۱۰ھ/ ۷۲۸ء میں بصرے میں پیدا ہوا اور ۲۰۹ھ/ ۸۲۴-۸۲۵ء میں فوت ہو گیا (تاریخ بغداد اور متأخر تصنیفات میں دوسرے سنین بھی مذکور ہیں)۔ وہ قریش کے قبیلۂ تَیم میں خانوادۂ عبیداللہ مَعْمَر کے ہاں بطور ایک مولیٰ کے پیدا ہوا (قب ابن حزم: جمہرۃ انساب العرب، قاہرہ ۱۹۴۸ء، ص ۱۳۰)، اس کے باپ یا دادا کا اصل وطن باجَرّوان تھا (الجزیرہ میں الرقّہ کے قریب؛ اس کا احتمال کم ہے کہ وہ شِرّوان میں اسی نام کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہو) اور، جیسا کہ ایک مشکوک سند کی بنا پر کہا جاتا ہے، مذہباً یہودی تھا۔ اس نے دبستانِ بصرہ کے سربرآوردہ علماے لسانیات، ابوعمرو بن العلاء اور یونس بن حبیب سے تعلیم پائی اور قواعد لغت اور لسانیات کے بعض مباحث پر متعدّد رسائل تصنیف کیے، جن میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہا۔ لسانیات میں اپنے اساتذہ کی محدود دلچسپیوں کو چھوڑتے ہوے ابوعبیدہ نے ان سب روایات کو اپنا موضوع مطالعہ بنا لیا جو عربوں کی تاریخ اور ثقافت کے بارے میں چلی آ رہی تھیں۔ [بصرے اور کوفے کے] لسانی دبستانوں میں ایک ہی یا ایک سی چیزوں کی ترتیب و تدوین کے جو علمی طریقے مستعمل تھے، ابوعبیدہ نے انھیں کو اختیار کر کے اس منتشر اور زبانی مواد کی مدد سے عرب اور صدر اسلام کی تاریخ، نیز قبائلی روایات کے متعلّق بعض اُمور پر کئی درجن رسائل تصنیف کیے، جنھوں نے عرب کے زمانۂ جاہلیت سے متعلّق سب آئندہ مطالعات کے لیے نقطۂ آغاز کا کام دیا اور بیشتر مواد بھی فراہم کر دیا۔

اس نے اپنی معلومات عام عنوانات کے ماتحت ترتیب دیں اور پھر ان میں ذیلی عنوانات قائم کیے، مثلاً کتاب الخیل میں، جس کا موضوع ہے مشہور و معروف عربی گھوڑے اور جو اب تک محفوظ ہے (مطبوعۂ حیدرآباد ۱۸۵۸ء)۔ اسی طرح جن معلومات کا تعلّق قبائل سے تھا ان کی ترتیب اکثر مناقب (خوبیوں) اور مثالب (برائیوں) کے ذیل میں ہوئی، لیکن مثالب کے عنوان سے عربوں کے قبائلی جذبۂ افتخار کو بے حد صدمہ پہنچا، بالخصوص اس لیے کہ ان میں ایرانی شعوبیہ [رک بآں] کی ان مناظرانہ تحریروں کے لیے جو عربوں کے خلاف لکھی جاتی تھیں، بہت کچھ مواد موجود تھا۔ علاوہ ازیں وہ چونکہ پکا خارجی تھا (قب ابن خلّکان؛ جاحظ: البیان، قاہرہ ۱۹۳۲ء، ۱: ۲۷۳-۲۷۴؛ الاشعری: مقالات، ۱: ۱۲۰) اس لیے اس کے دل میں اپنے ہم عصر عرب شرفا کی مطلق عزت نہیں تھی، بالخصوص آل مہلّب کی، اور وہ ان کے دعاوی کو علی الاعلان بے نقاب کرتا رہتا تھا۔ انھیں دو باتوں کی بنا پر شعوبیہ کے مخالفین اسے عربوں کا شدید دشمن اور بدنام کنندہ ٹھیراتے تھے (کان اغری الناس بمشاتم الناس - ابن قتیبہ: کتاب العرب، در رسائل البلغاء، طبع سوم، قاہرہ ۱۹۴۶ء، ص ۳۴۶)، لیکن ایسی کوئی شہادت موجود نہیں جس کی بنا پر اس کا شمار ایرانی شعوبیہ میں کیا جائے، جیسا کہ گولڈ تسیہر (Goldziher) اور احمد امین نے کیا ہے، بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے (قب المسعودی: التنبیہ، ص ۲۴۳)۔ علمی حلقوں نے اس کی صحّتِ علم و فضل کی بڑی سرگرمی سے حمایت کی ہے (دیکھیے جاحظ، محل مذکور؛ تأریخ بغداد، ۱۳: ۲۵۷)، حتّٰی کہ اس کے ناقدین کو بھی مجبوراً اس کے تعمّق و تنوع علمی کا اعتراف کرنا پڑا اور انھوں نے اس کی تصنیفات سے فائدہ بھی اٹھایا۔ صرف عربی شاعری کے اصطلاحی میدان میں اس کا درجہ اس کے حریف الاصمعی [رک بآں] سے کمتر سمجھا جاتا ہے، حالانکہ اس زمانے میں یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ''جو طالب علم الاصمعی سے تعلیم پاتے ہیں وہ موتیوں کے بازار میں اُپلے خریدتے ہیں، لیکن جب ابوعبیدہ سے رجوع

کرتے ہیں تو اُپلوں کی منڈی سے موتی خریدتے ہیں''، جو گویا ابوعبیدہ کے میلے کچیلے رہنے اور اس کے ناقص طرزِ بیان کی طرف اشارہ ہے۔ بحیثیت اشعار کے ایک مدوّن اور شرح نویس کے ابوعبیدہ نے جریر اور فرزدق کے نقائض کی شکل میں اپنی صلاحیت و قابلیت کی ایک یادگار تالیف چھوڑی ہے، جو محمد بن حبیب السُّکری کی وساطت سے ہم تک پہنچی ہے (طبع بیون A. A. Bevan، لائڈن ۱۹۰۵ - ۱۹۱۲ء)۔ اس کی تقریباً ساری زندگی بصرے میں گزری، اس کے سوا کہ وہ دو ایک مرتبہ چند دنوں کے لیے بغداد گیا۔ وہ اس سلسلے میں کہ اسے اپنی کتابوں کی اشاعت منظور نہیں تھی خاصا بدنام تھا؛ چنانچہ اس ضمن میں ایک بڑی دلچسپ حکایت بیان کی گئی ہے کہ بغداد کے طالب علموں نے اس کی تالیفات کی نقلیں کیسے حیلے سے حاصل کیں (تاریخ بغداد، ۱۲:۱۰۸)۔ ابوعبید القاسم بن سلّام، ابوحاتم (ابن) السِجِستانی، عمر بن شَبّہ اور شاعر ابونُواس اس کے مشہور تلامذہ میں ہیں۔

تاریخی روایات اور ادبی معلومات کی ترتیب و تدوین کے علاوہ ابوعبیدہ نے قرآن اور حدیث پر لسانی نقطۂ نظر سے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ معلوم ہوتا ہے اس کی تصنیف غریب الحدیث اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب ہے۔ یہ کتاب مختصر تھی اور اسناد سے خالی (ابن دُرُستوَیہ، در تاریخ بغداد، ۱۲:۴۰۵)۔ اس سے زیادہ اہم مجاز القرآن ہے (یہاں مجاز سے مراد تعبیر یا شرح مفہوم ہے)۔ یہ ہماری معلومات کے مطابق تفسیر میں اولین تصنیف ہے اور ان مختصر حواشی پر مشتمل ہے جو قرآن [پاک] کے چیدہ چیدہ کلمات اور تراکیب پر، کہ جس ترتیب سے وہ سورتوں میں آئے ہیں، لکھے گئے۔ یہ کتاب، جو اس کے شاگرد علی بن المغیرہ الاثرم کے ذریعے ہم تک پہنچی، دو مخطوطوں میں محفوظ ہے (قاہرہ میں زیر طبع)۔ ابن ہشام نے سیرۃ ابن اسحٰق کی جو تنقیح کی تھی اس پر بھی ابوعبیدہ نے لسانی پہلو سے حواشی کا اضافہ کیا ہے۔

مآخذ: (۱) الفہرست، ص ۵۳ - ۵۴؛ (۲) تاریخ بغداد، عدد ۷۲۱۰ (۱۳: ۲۵۲-۲۵۸)؛ (۳) ابن خلّکان، عدد ۷۰۲؛ (۴) یاقوت: ارشاد، ۷:۱۶۴-۱۷۰؛ (۵) الأغانی، *Tables*؛ نیز عربی تصانیف میں کئی ضمنی حوالے؛ (۶) گولڈ تسیہر (I. Goldziher): *Muh. Stud.*، ۱:۱۹۴ ببعد (لیکن دیکھیے (H. A. R. Gibb)، در *Studia Orientalia Ioanni Pederson dicata*، کوپن ہیگن ۱۹۵۳ء، ص ۱۰۵ ببعد)؛ (۷) براکلمان (Brockelmann)، ۱:۱۰۳ و تکملہ، ۱:۱۶۲؛ (۸) F. Krenkow، در کتاب الخیل، ص ۱۷۴ - ۱۷۹؛ (۹) E. Mittwoch: *Proelia Arabum panganorum*، برلن ۱۸۹۹ء؛ (۱۰) احمد امین: ضحی الاسلام، ۲:۳۰۴-۳۰۵؛ (۱۱) طٰہٰ الحاجری: الروایۃ و النقد عند ابی عبیدۃ، اسکندریہ ۱۹۵۱ء؛ [(۱۲) نزھۃ الالبّاء، ص ۱۴۷].

(H.A.R. GIBB)

ابوالعَتاہِیہ: ابواسحٰق اسمٰعیل بن القاسم ابن سُوَیْد بن کَیْسان، جو بحیثیت شاعر ابوالعتاہیہ [گمراہ، بے عقل، پگلا، مدعی حذاقت] کے نام سے مشہور ہے، کوفے (یا عین التَّمْر) میں ۱۳۰ھ/ ۷۴۸ء میں پیدا ہوا اور ۲۱۰ھ/ ۸۲۵ء یا ۲۱۱ھ/ ۸۲۶ء میں فوت ہوگیا [دیکھیے الاغانی، طبع دوم، ۳:۱۷۵، جہاں ان دو تاریخوں کے علاوہ ۲۰۹ھ اور ۲۱۳ھ بھی مذکور ہیں؛ ابوالعتاہیہ کے دوست مخارق کی روایت بھی یہی ہے]۔ اس کے خاندان کے لوگ دو یا تین پشتوں سے قبیلۂ عَنَزہ ابن ربیعہ کے موالی رہے تھے اور بڑی ادنیٰ اور حقیر خدمات سرانجام دیا کرتے تھے۔ اس کا باپ حجام (سینگیاں لگانے) کا پیشہ کرتا تھا اور خود ابوالعتاہیہ نے بھی عنفوان شباب میں گلی کوچوں میں مٹی کے برتن فروخت کیے ہیں۔ معاشرے میں اس پستی کے احساس نے ابوالعتاہیہ کے دل میں زندگی کے متعلق بڑی تلخی پیدا کردی تھی، چنانچہ حکمران طبقے اور اربابِ دولت کے خلاف اسے جو نفرت تھی اس کا اظہار اس نے اپنی شاعری کے آخری دور میں پورے طور پر کیا ہے۔ یوں ابوالعتاہیہ خود مرتے دم تک اپنی حرص و طمع اور خسّتِ نفس کے لیے بدنام رہا۔ اسے بھی بشّار بن بُرد کی طرح شاعری کا خداداد ملکہ عطا ہوا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ اس کی بدولت اس کی زندگی بڑی آسودگی اور مرفہ الحالی میں گزرے گی۔ اپنے افلاس کی وجہ سے اسے موقع ہی نہ ملا کہ لسانیات اور متقدمین کی شاعری پر درس لیتا، اور یقیناً یہی سبب ہے اس کے کلام کی تازگی اور غیر رسمی نوعیت کا۔ جوانی کے دن اس نے ان آوارہ مزاج شاعروں کی صحبت میں گزارے جو والبہ بن الحُباب کے گرد جمع رہتے تھے۔ یہی زمانہ تھا جب اس نے اپنی غزلیات اور خمریات کی بدولت شہرت حاصل کی، گو آگے چل کر ناقدانِ فن نے ان اشعار کو بودا اور زنانہ کہہ کر ٹھکرا دیا ہے (ابن قتیبہ: الشعر، ص ۴۹۷) اور اب ان کے صرف چند اجزا ہی محفوظ ہیں۔ ایسے شعرا کی طرح جو طبیعت پر زور دیے بغیر شعر کہتے ہیں ابوالعتاہیہ بھی صاف و سادہ زبان اور چھوٹی چھوٹی بحروں کو ترجیح دیتا تھا، چنانچہ اس نے سب سے پہلے شہرت حاصل کی تو خلیفہ المہدی کی شان میں ایک قصیدے کی بدولت، جس کا انداز اگرچہ غیر رسمی تھا، بایں ہمہ خلیفہ کو بہت پسند آیا۔ ابوالعتاہیہ نے المہدی کی چچازاد بہن رَیْطہ [بنت ابی العباس السفاح] کی ایک کنیز عُتبہ کی تعریف میں غزلیں لکھیں اور یوں اپنے آپ کو بغداد میں رسوا کرلیا۔ یہ کنیز خلیفہ کی نظرِ التفات کی امیدوار تو ضرور تھی، لیکن اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ اپنے آپ کو ایک نادار اور بے حیثیت انسان کے سپرد کردے۔ ادھر ابوالعتاہیہ نے عُتبہ کے حصول میں اپنی ناکامی کا ذمہ دار المہدی کو ٹھیرایا، حتّٰی کہ اپنے بعض غیر محتاط اشعار کی پاداش میں اسے کوڑوں کی سزا ملی اور وہ کوفے جلاوطن کردیا گیا۔ المہدی کا انتقال ہوگیا تو اس نے کچھ ایسے اشعار لکھ کر جن کے دو معنی لیے جاسکتے تھے خلیفہ سے اپنا انتقام لے لیا۔

ابوالعتاہیہ بغداد واپس آیا تو اس نے (خلیفہ) الہادی کی مبالغہ آمیز مدح شروع کی، جس نے الہادی کے جانشین ہارون الرشید کو یہاں تک برافروختہ کردیا کہ اس نے اسے اور اس کے دوست ابراہیم الموصلی کو قید میں ڈال دیا، لیکن آگے

چل کر جب اسے خلیفہ کی خوشنودی حاصل ہوگئی تو اس نے اپنے عشقیہ کلام سے اس کا دل موہ لیا، مگر پھر دفعۃً اس نے غزل گوئی ترک کر کے راہبانہ انداز کی نظمیں لکھنا شروع کر دیں (حدود ۱۷۸ھ)۔ ہارون الرشید کو شروع شروع میں تو اس کی یہ تبدیلیِ روش پسند نہیں آئی اور اس نے اسے قید کر دیا، لیکن بعد میں الفضل بن الربیع کی سفارش پر اور یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ایک حد تک عوام میں اس کی مقبولیت کی بنا پر اسے معاف کر دیا۔ ابوالعتاہیہ نے بڑی کثرت سے چھوٹی بڑی نظمیں کہیں جن میں مواعظ کی بھرمار ہے اور موت کے بھیانک مناظر کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جو امیر و غریب سب کو یکساں کر دیتی ہے۔ اس کا روے سخن خاص طور پر اربابِ ثروت و اقتدار کی طرف تھا اور اس کی زد سے خلیفہ بھی محفوظ نہیں رہا۔ ابوالعتاہیہ کا یہ اندازِ شاعری اس قدر نفع بخش ثابت ہوا کہ جب ابونواس نے بھی ''زہدیات'' میں طبع آزمائی شروع کی تو اس نے اسے تنبیہ کی کہ وہ اس سرزمین میں مداخلت نہ کرے جس پر طے ہو چکا ہے کہ اس کا حق قائم ہے (اخبار ابی نواس، قاہرہ ۱۹۲۴ء، ص ۷۰)۔ پھر متأخّرین میں بعض نقادوں نے ابوالعتاہیہ کے اس زہد کو خلوص پر مبنی سمجھنے میں جو تأمّل کیا ہے وہ بلاوجہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اس حقیقی زاہد ابوالعلاء المعری کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے جو اس کا ذکر بطور ایک داہیہ [بہت ہوشیار اور چالاک شخص] کے کرتا ہے (ابن فضل اللہ: مسالک الابصار، ج ۱۵، مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، شمارہ ۵۷۵، ورق ۱۳۶)۔

ایک دوسرا الزام، جو ابوالعتاہیہ پر اکثر عائد کیا جاتا ہے، زَندقہ یا الحاد کا ہے، جو اس زمانے میں ایک بڑا عام حربہ تھا۔ گولڈ تسیہر (Goldziher) کا یہ خیال ہے کہ ابوالعتاہیہ کو قید کیا گیا تو شاید اس لیے بھی کہ اس کی کچھ نظموں کا لب و لہجہ کبھی کبھی مسلّمہ عقائد کے خلاف ہو جاتا تھا اور یہ اس لیے کہ اس نے دینیات کی تعلیم نہیں پائی تھی [دیکھیے الأغانی، طبع دوم، ۳:۱۹۰، س ۹]۔ وہ شاید ان مانوی عقائد، یا ان کے ترمیم شدہ بقایا سے، جو اس وقت عراق میں رائج تھے، متأثّر ہو گیا تھا۔ ان عقائد کی رو سے دنیا کی ساری بدنظمیوں کی علّت خیر و شر کے دو بنیادی اصول ہیں، گو ابوالعتاہیہ کا خیال تھا کہ دونوں کو اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کیا ہے۔ پھر اس نے اس طرح کے اشعار بھی کہے ہیں کہ ''اگر تم کسی شریف انسان کو دیکھنا چاہتے ہو تو کوئی ایسا بادشاہ تلاش کرو جس نے درویش کا لباس پہن رکھا ہو'':

[اذا اردت شریف النّاس کلّھم

فانظر الی ملک فی زیّ مسکین]

ہوسکتا ہے ابوالعتاہیہ کا اشارہ اس قسم کے اشعار میں [امام] موسیٰ کاظمؒ اور دوسرے شیعی اماموں کی طرف ہو جن سے اسے دل ہی دل میں ارادت تھی اور جن کے حقوق کا اس وقت کوفے میں بڑا چرچا تھا۔

بحیثیت شاعر ابوالعتاہیہ کی حیرت انگیز کامیابی کا راز اس کی زبان کی سادگی، قادرالکلامی، سہولتِ ادا اور بے ساختہ گوئی میں مضمر ہے۔ برعکس اس کے ابوالعتاہیہ کے ہم عصر شعرا پُرتکلف، تصنّع اور آورد کا غلبہ تھا۔ وہ عوام کے احساسات بڑی خوبی سے ادا کرتا تھا [اس باب میں دیکھیے اس کا اپنا بیان، الأغانی، طبع دوم، ۳:۱۵۵]۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے الموصلی کی صحبت حاصل ہوگئی [الأغانی، ۳:۱۲۳]، جو اس عہد کا ممتاز ترین ماہر موسیقی تھا اور جس نے اس کی بہت سی نظموں کو موسیقی کے سانچے میں ڈھال دیا [جیسے اس کے دوست مُخارق المغنّی نے بھی اس کے اشعار کے لیے کچھ دُھنیں تیار کیں، الأغانی، طبع دوم، ۳:۱۵۸]۔ ابوالعتاہیہ اور اس کا نوجوان ہم عصر ابان بن عبدالحمید [رک بآں] پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ''مُزْدَوِج'' میں اشعار کہے [اس قسم کی نظم کے ہر بیت میں دو قافیے ہوتے ہیں۔ ابوالعتاہیہ کے ارجوزہ مزدوجہ ''ذات الامثال'' کے لیے دیکھیے الأغانی، طبع دوم، ۳:۱۳۸]۔ پھر المعرّی کے نزدیک بحر مضارع کو بھی ابوالعتاہیہ ہی نے ایجاد کیا (الفصول والغایات، ۱:۱۳۱)۔ وہ ایک ایسی بحر بھی استعمال کرتا تھا جو آٹھ اسبابِ ثقیلہ پر مشتمل تھی۔ وہ بڑا پُرگو تھا اور اس لیے اس کے کلام کی تمام و کمال کبھی تدوین نہیں ہوسکی، البتہ اندلسی عالم ابن عبدالبرّ (م ۴۶۳ھ/۱۰۷۱ء) نے اس کی ''زُہدیات'' کو مدوّن کیا ہے۔

مآخذ: (۱) ابن خلّکان، شمارہ ۹۱، مطبوعۂ قاہرہ، شمارہ ۱۳۱، ص ۱۷۱؛ (۲) الأغانی، طبع ثانی، ۳:۱۲۶ - ۱۸۳ (طبع ثالث، ۴:۱ - ۱۱۲)؛ دوسرے حوالوں کے لیے دیکھیے نیز (۳) فہارس الأغانی (*Tables*)، از گویڈی (Guidi)؛ (۴) تاریخ بغداد، ۶: ۲۵۰-۲۶۰؛ (۵) Goldziher: *Trans. IX Congress of Orientalists*، ص ۱۱۳ ببعد؛ (۶) G. Vajda، در *RSO*، ۱۹۳۷ء، ص ۲۱۵ ببعد، ۲۵۵ ببعد؛ (۷) براکلمان (Brockelmann)، ۱:۶۷ و تکملہ، ۱:۱۱۹؛ (۸) دیوان ابی العتاہیہ کے بعض اجزا بیروت میں طبع ہوے، ۱۸۸۷ء و ۱۹۰۹ء [و ۱۹۱۴ء]؛ نیز دیکھیے (۹) مجموعۃ، طبع بشانی، بیروت ۱۹۲۷ء؛ (۱۰) زُھدیات، ترجمہ از O. Rescher، شٹٹ گارٹ ۱۹۲۸ء.

(A. GUILLAUME غیوم)

ابوالعَرَب: محمد بن تمیم بن تمام التمیمی، ایک مالکی فقیہ، محدث، مؤرخ اور شاعر، قیروان کا باشندہ اور ایک اونچے عرب خاندان کا چشم و چراغ (اس کا پردادا تونس کا حاکم تھا، جس نے ۱۸۳ھ/۷۹۹ء میں قیروان پر قبضہ کر لیا اور آگے چل کر بغداد کے زندان میں جان دی)۔ ابوالعرب قیروان میں ۲۵۰ھ/۸۶۴ء اور ۲۶۰ھ/۸۷۳ء کے درمیان کسی سال میں پیدا ہوا۔ اس نے مختلف اساتذہ سے تحصیل علم کی اور بعد ازاں خود بھی بہت سے شاگردوں (بالخصوص ابن ابی زید القیروانی) کی تعلیم و تربیت میں حصّہ لیا۔ وہ فاطمیوں کے خلاف ابو یزید کی بغاوت میں شریک تھا، جس کی پاداش میں اسے قید کر دیا گیا۔ اس نے ۳۳۳ھ/۹۴۵ء میں وفات پائی۔ فقہ، حدیث اور تاریخ کے موضوعات میں جو تصنیفات اس سے منسوب ہیں ان میں سے بظاہر صرف طبقات علماء افریقیۃ ہی زمانے کی دست برد سے محفوظ رہی۔ یہ قیروان اور تونس کے علما کے حکایات آمیز سوانح

حیات کا مجموعہ ہے (طبع و ترجمہ از محمد بن شنب، بعنوان *Classes des sava-nts de l'Ifrīqīya*، الجزائر ۱۹۱۵-۱۹۲۰ء).

مآخذ: (۱) الذہبی: تذکرۃ، ۳: ۱۰۵؛ (۲) ابن فَرحُون: دیباج، ص ۲۳۳؛ (۳) ابن ناجی: معالم، ۳: ۴۲؛ (۴) ابن خیر: فَہرَسۃ (*BAH*، ج ۹)، ص ۲۹۷، ۳۰۱؛ (۴) ایچ - ایچ عبدالوہاب: المنتخب المدرسی، طبع دوم، قاہرہ ۱۹۴۴ء، ص ۳۷-۳۸.

(CH. PELLAT)

---

* **ابوعَرُوبہ:** الحسین بن ابی معشر محمد بن مودود السُّلَمی الحَرّانی، حرّان کا عالم حدیث (ولادت: تخمیناً ۲۲۲ھ/ ۸۳۷ء؛ وفات: ۳۱۸ھ/ ۹۳۰-۹۳۱ء).

ہم اس کی زندگی کے بارے میں بجز اس کے شیوخ اور طلبہ کے ناموں کے، جن میں سے بعض نے بڑی شہرت اور نام پایا، کچھ بھی نہیں جانتے۔ کہا جاتا ہے وہ حرّان کا قاضی یا مفتی تھا۔ ایک ماخذ (ابن عساکر، منقولہ الذہبی) میں یہ بھی مذکور ہے کہ وہ بنواُمیّہ کا طرف دار تھا.

الفہرست، ص ۲۳۰، کے مطابق ابوعروبہ نے صرف ایک کتاب لکھی اور یہ ان احادیث پر مشتمل تھی جو اس کو اپنے اساتذہ سے ملیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ وہی تالیف ہے جو طبقات کے نام سے موسوم ہے اور جسے الذہبی نے ابوعروبہ کی تالیف بتایا ہے۔ طبقات کا ایک اقتباس، جس میں [حضرت] نبی [کریم صلی اللہ علیہ وسلم] کے صحابہ اور ان کی روایت کردہ احادیث سے بحث کی گئی ہے، دمشق میں محفوظ ہے (قب یوسف العِشّ: فہرس مخطوطات دار الکتب الظاہریۃ، دمشق ۱۹۴۷ء، ص ۱۶۹)۔ کہا جاتا ہے ابوعروبہ نے حرّان کی ایک تاریخ (یا الجزیرہ کے علما کے سوانح کا مجموعہ) اور کتاب الاوائل بھی تصنیف کی.

مآخذ: (۱) براکلمان (Brockelmann)، ۲: ۶۶۳؛ (۲) الفہرست، ص ۳۲۲؛ (۳) سَمعَانی: الانساب، ورق ۱۶۱ الف و مواضع کثیرہ؛ (۴) یاقوت، ۲: ۲۳۲ و مواضع کثیرہ؛ (۵) ابن العدیم: بغیۃ، مخطوطہ در متحف طوپ قپوسرائے، احمد ثالث، شمارہ ۲۹۲۵، ج ۴، ورق ۱۷۸ ب تا ۱۷۹ الف؛ (۶) الذہبی: نبلاء، مخطوطہ در متحف طوپ قپوسرائے، احمد ثالث، شمارہ ۲۹۱۰، ۹: ۵۴۵-۵۴۷؛ (۷) وہی مصنف: تاریخ الاسلام، سال ۳۱۸ھ؛ (۸) ابن العماد: شذرات، ۲: ۲۷۹؛ (۹) F. Rosenthal: *A History of Muslim historiography*، لائڈن ۱۹۵۲ء، ص ۳۱۰، ۳۸۹، ۳۹۳.

(F. ROSENTHAL)

---

* **ابوعَرِیش:** ولایت عَسِیر کا ایک قصبہ، جو جیزان سے بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ فلبی (Philby) کے نزدیک یہ پتنگ نما قصبہ تقریباً ایک میل تک چلا گیا ہے۔ یہ زیادہ تر عرائش (جھاڑیوں کی ٹہنیوں سے بنی ہوئی جھونپڑیوں) پر مشتمل ہے اور اس کے آس پاس وسیع کھنڈر موجود ہیں۔ باشندے (تقریباً بارہ ہزار) تل اور باجرے کی کاشت کرتے ہیں۔ تاجر بیشتر حضرمی نسل کے ہیں.

یہ قصبہ سب سے پہلے ایک شیخ نے آباد کیا تھا (ساتویں صدی ہجری/ تیرھویں صدی عیسوی میں زیدی اماموں کے عہد میں، جو ۱۰۳۶ھ/ ۱۶۲۷ء میں اس پر قابض ہوے، اس نے خوب ترقی کی، لیکن اگلی ہی صدی میں مقامی اشراف (رؤسا) آزاد ہو گئے۔ ۱۲۱۷ھ/ ۱۸۰۲-۱۸۰۳ء میں انھوں نے کچھ دنوں کے لیے وہّابیوں کی اطاعت قبول کر لی اور بعد ازاں مصریوں کی، مگر جب مصریوں نے حُدَیدَہ کو خالی کر دیا (۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء) تو شریف حسین نے تہامہ پر قبضہ کر لیا اور [ترکی حکومت نے] اسے پاشا کا منصب عطا کیا، جس سے عدن [میں برطانوی اقتدار] کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس پر برطانیہ نے احتجاج کیا تو ترکوں نے شریف حسین کو عسیر کی طرف واپس ہٹا دیا اور اشراف کا اقتدار، جو خانہ جنگی اور محمد بن عائض کے حملوں کے باعث کمزور ہو گیا تھا، اس وقت بالکل ختم ہو گیا جب ترکوں نے دوبارہ عسیر پر قبضہ کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ فلبی کو ان کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ اس کے بعد ابوعریش باری باری سے ترکوں، ادریسی [ائمہ] اور ابن سعود کے قبضے میں رہا.

مآخذ: حالات کے لیے (۱) C. Niebuhr: *Beschreibung von Arabien*، ص ۲۶۷؛ (۲) Tamisier: *Voyage en Arabie*، ۱: ۳۸۳-۳۹۱؛ (۳) H. St. J. Philby: *Arabian Highlands*؛ تاریخ کے لیے: (۴) Tamisier، وہی کتاب، ۱: ۳۶۵-۳۷۴؛ (۵) Philby: وہی کتاب؛ (۶) A. S. Tritton: *Rise of the Imams of Sanaa*؛ (۷) H. F. Jacob: *Kings of Arabia*، ص ۵۱-۵۴؛ (۸) محمد بن علی الشوکانی: البدر الطالع، قاہرہ ۱۳۴۸ھ، ۱: ۲۴۰ و ۲: ۶-۸؛ (۹) عثمان بن بشر النجدی الحنبلی: عُنوان المَجد، مکّہ ۱۳۴۹ھ، ۱: ۱۴۴-۱۴۵، ۲۱۱.

(C. F. BECKINGHAM)

---

* **ابوعطاء السِنْدی:** اَفْلَح (یا مَرْزُوق) بن یَسار، عربی زبان کا شاعر۔ وہ السندی کے نام سے اس لیے معروف ہے کہ اس کا باپ سندھ سے آیا تھا، لیکن ابو عطا خود کوفے میں پیدا ہوا اور بنو اسد کے مولیٰ کی حیثیت سے اس نے وہیں زندگی بسر کی۔ وہ اپنے قلم اور اپنی تلوار دونوں کی مدد سے بنو اُمیّہ کے زوال پذیر خاندان کی حمایت میں لڑتا رہا۔ اس نے ان کی مدح اور ان کے حریفوں کی مذمّت کی، مگر پھر یہ بھی صحیح ہے کہ جب بنوعباس نے اقتدار حاصل کر لیا تو اس نے کوشش کی کہ ان نئے حکمرانوں کی قصیدہ خوانی سے ان کے دلوں میں وہی جگہ پیدا کر لے۔ یہ دوسری بات ہے کہ فولاد سیرت السفاح اس قسم کی چاپلوسی سے متاثّر نہیں ہو سکا۔ اس کے جانشین المنصور کے عہدِ حکومت میں بھی ابوعطا روپوش ہی رہا اور پھر ظاہر ہوا تو ۱۵۸ھ/ ۷۷۴ء میں خلیفہ المنصور کی وفات پر؛ لیکن اس کے بعد

وہ خود بھی جلد ہی فوت ہوگیا، گو اس کی وفات کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ ابوعطاء کو ایک اچھا شاعر سمجھا گیا ہے۔ اس نے ابوہُبَیرہ [رَكَ بآن] کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ بہت مشہور ہے۔ اس کا عربی تلفّظ ناقص تھا اور اس کی زبان میں بھی لکنت تھی، لہٰذا وہ مجبور تھا کہ اپنی نظمیں دوسروں سے پڑھوایا کرے.

مآخذ: (۱) ابن قتیبہ: الشعر، ص ۴۸۲ - ۴۸۴؛ (۲) ابوتمّام: الحماسة، ۱: ۲۷۳ ببعد؛ (۳) الأغانی، طبع اوّل، ۱۶: ۸۱ - ۸۷؛ (۴) المَرزُبانی: المُعجَم، ص ۳۸۰؛ (۵) البَکری: سِمْط اللآلی (طبع میمنی)، ص ۸۰۲؛ (۶) الکتبی: فوات، قاہرہ ۱۲۸۳ھ، ۱: ۳۷۹؛ (۷) مجموعہ اجزاء، از بلوچ نبی بخش خان، در IC، ۱۹۴۹ء، ص ۱۳۷ ببعد.

(A. SCHAADE)

⊗ **ابوالعلاء المَعَرّی:** احمد بن عبداللہ بن سلیمان (۳۶۳-۴۴۹ھ/۹۷۳-۱۰۵۷ء)، ایک عرب شاعر اور حکیم، ۳۶۳ھ میں معرۃ النعمان میں پیدا ہوا۔ وہ تنوخ کے مشہور قبیلے سے تھا (اس قبیلے کی مشہور و معروف شخصیتوں کے حالات کے لیے دیکھیے یاقوت: معجم الادباء، طبع قاہرہ، ۳: ۱۰۸ ببعد)۔ المعرّی چار برس کا تھا کہ چیچک کے حملے سے اس کی بائیں آنکھ جاتی رہی اور پھر کچھ مدّت کے بعد وہ دوسری آنکھ سے بھی محروم ہوگیا۔ یہ ایک ایسا حادثہ تھا جس سے اس کے افکار اور اشعار نے گہرا اثر قبول کیا۔ بصارت سے معذوری کے باعث اسے دوسروں پر اعتماد نہ رہا۔ وہ اس سے احساس کمتری کا شکار ہوگیا اور ہمیشہ اپنے آپ کو دوسروں سے کمزور اور کمتر سمجھتا رہا، لیکن اس کا حافظہ بلا کا تھا اور ایسا فوق العادہ کہ اس پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ یہ اس کا حافظہ ہی تھا جس نے بصارت سے محرومی کے باوجود اس کی تصانیف میں حد سے زیادہ وسعت اور تنوع پیدا کر دیا تھا۔ ابوالعلاء نے مصیبت اور کشمکش کا زمانہ پایا تھا۔ حمدانی حکومت، جس میں معرۃ النعمان بھی شامل تھا، جنوب میں فاطمیوں اور شمال میں بوزنطیوں کے حملوں کے باعث اپنی شان و شوکت اور عظمت کھو چکی تھی۔ صالح بن مِرداس نے اس موقع کو غنیمت جانا، بغاوت کی اور حلب کو ۴۰۲ھ/۱۰۱۲ء میں تاخت و تاراج کر دیا۔ اس نے معرۃ النعمان کا بھی محاصرہ کیا تھا (۴۱۷-۴۱۹ھ/۱۰۲۶-۱۰۲۸ء)۔ اس زمانے میں بغداد کی حالت بھی، جو عباسی خلافت کا مرکز تھا، کچھ اچھی نہیں تھی۔ سارا اقتدار آل بویہ کے ہاتھ میں تھا۔ عقائد کے لحاظ سے حکمران شیعہ تھے.

ابوالعلاء نے لسانی اور دینی علوم کی تحصیل بچپن ہی میں اپنے والد سے کی۔ دس سال کی عمر میں وہ حلب چلا گیا۔ جہاں محمد بن عبداللہ سے ادب اور لسانیات اور یحیٰی بن مِسْعر سے حدیث میں درس لیا اور شعر کہنا شروع کر دیا۔ وہ ابھی چودہ برس کا تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہوگیا۔ علوم و فنون میں تحقیق و مطالعہ کا شوق اسے سب سے پہلے انطاکیہ لے گیا تاکہ وہاں کے مشہور کتب خانے سے فائدہ اٹھائے۔ بعد ازاں اس نے طرابلس کا رخ کیا۔ اثنائے سیاحت میں آخر الامر وہ لاذقیہ پہنچا، جو اس وقت بوزنطیوں کے قبضے میں تھا اور یہاں راہبوں سے دین مسیحی کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کیں.

لیکن تحصیلِ علم سے ابوالعلاء کا مقصد یہ نہیں تھا کہ شاعر بنے۔ وہ دراصل اپنے ذہن اور اپنی روح کی تسکین کا سہارا ڈھونڈ رہا تھا۔ پھر جب تقریبًا بیس سال کی عمر میں وہ معرۃ النعمان واپس آیا ہے تو اسے کسی کے سامنے زانوے تلمّذ طے کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی گزر اوقات تیس دینار سالانہ کی آمدنی پر تھی، جو ایک وقف سے اسے بطورِ وظیفہ حاصل ہوتی اور جس کا نصف حصہ وہ اپنے خادم کو دے دیتا تھا.

یہ وہ زمانہ تھا جب فاطمی خلفاے مصر اور حلب کے حمدانی فرمانرواؤں کے درمیان زبردست چپقلش جاری تھی۔ ہمیں ابوالعلاء المعری کے دو مکتوب ملے ہیں، جو اس نے الوزیر المغربی کے بیٹے ابوالقاسم المغربی کے نام لکھے تھے اور جن کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ابوالعلاء فاطمیوں کا طرفدار تھا، لیکن اس امر کے ثبوت کے لیے صرف یہ دو مکتوب کافی نہیں ہیں، اس لیے کہ ابوالعلاء نے اپنی تصانیف میں باطنی [اسماعیلی] افکار کا مضحکہ اُڑایا ہے.

۳۹۸ھ/ ۱۰۰۸ء کے اواخر میں ابوالعلاء نے بغداد کا سفر کیا، جس کا سبب اگرچہ واضح طور پر معلوم نہیں ہوسکا، لیکن ہوسکتا ہے کہ اس کا مقصد اپنی معلومات میں اضافہ اور اہلِ بغداد سے حصولِ تعارف ہو، یا شاید اس لیے کہ فاطمی، جو باطنی [اسماعیلی] عقائد کے پابند تھے، اب (معرۃ النّعمان کے) بالکل قریب آگئے تھے۔ اس سفر کے حالات ابوالعلاء نے اس قصیدے میں لکھے ہیں جو اس نے ابواحمد اسفرائنی کی مدح میں کہا تھا (شرح التنویر، مطبوعۂ قاہرہ، ۱: ۲۱۹)۔ بغداد میں اس کا قیام ایک سال اور سات مہینے رہا۔ یہاں بھی وہ ہمیشہ کتاب خانوں میں اپنا وقت صرف کرتا، البتہ اس نے یہاں کسی سے درس نہیں لیا؛ برعکس اس کے اس نے ایک مسجد میں گوشہ گزیں ہوکر سقط الزند کی شرح لکھی۔ اس کا اپنا بیان ہے کہ اس نے صرف عبدالسّلام بصری کی مجالس میں باقاعدہ شرکت کی۔ کہا جاتا ہے کہ بغداد میں اس نے پند و عقائد اور فلسفے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کیں، جن کا اثر اس کی بعد کی زندگی میں صاف نمایاں ہے؛ لیکن یہ امر یقینی نہیں ہے، اس لیے کہ مذاہبِ عالم کے متعلق آزادیِ خیال کے آثار اس مرثیے میں بھی موجود ہیں جو اس نے چودہ سال کی عمر میں اپنے باپ کی وفات پر لکھا تھا.

ابوالعلاء کے اپنے بیان کے مطابق وہ ماہ رمضان ۴۰۰ھ/ [اپریل-مئی] ۱۰۱۰ء میں معرۃ النعمان واپس آگیا تھا۔ اس کی وجہ تھی اس کا افلاس اور ناداری اور اس کی والدہ کی علالت؛ لیکن بغداد کی یاد اس کو آخر دم تک نہ بھولی۔ اہلِ بغداد کو الوداع کہتے وقت اس نے ایک قصیدہ بھی لکھا، جس میں وہ اس رنج و غم کا اظہار کرتا ہے جو اس خوب صورت شہر سے جدا ہوتے وقت اس کے دل میں پیدا ہوا (شرح التنویر، ۲: ۹۵ ببعد)۔ وہ ابھی راستے ہی میں تھا کہ اسے والدہ کی موت کی خبر ملی جس سے اسے بڑا دکھ ہوا اور جس نے گویا گوشہ نشینی اور عزلت گزینی کی طرف اس

کے رجحان کو اور پختہ کر دیا؛ چنانچہ ابوالعلاء اپنے اس ارادے کو اپنے اس مکتوب میں بیان کرتا ہے جو راستے ہی میں اس نے اپنے ہم وطنوں کو لکھا تھا (رسائل، بیروت ۱۸۹۴ء، ص۸۱)۔ بہر حال اس وقعے کے بعد ابوالعلاء نے عزلت اور گوشہ نشینی اختیار کر لی، گوشت، انڈے اور دودھ کا استعمال چھوڑ دیا اور اس لیے اپنے آپ کو ''رَھینُ المَحْبَسَین'' کے لقب سے ملقّب کیا، جس کا اشارہ اس کے اندھے پن اور خلوت گزینی کی طرف ہے، گو اسے کامل انزوا اور علیحدگی کی زندگی کبھی نصیب نہ ہوئی، کیونکہ ادب اور علم و حکمت کے شائق عالم اسلام کے کونے کونے سے اس کے پاس آتے اور اس سے شعر گوئی اور ادب کا فن سیکھتے۔

۴۱۷ھ/ ۱۰۲۶ء اور ۴۱۹ھ/ ۱۰۲۸ء کے درمیانی عرصے میں صالح بن مرداس نے معرۃ النعمان کا محاصرہ کیا تو اہلِ شہر نے ابوالعلاء کو سفارش کے لیے اس کے پاس بھیجا۔ صالح بن مرداس نے بظاہر اس احترام کے باعث جو اس کی ذات کے لیے تھا محاصرہ اٹھا لیا اور شہر کا نظم و نسق اس کے سپرد کر دیا۔ ممکن ہے اس روایت کا پہلا حصہ درست ہو البتہ اس امر کے بارے میں کہ وہ فی الواقع شہر کا والی مقرر رہا تھا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مشہور باطنی [اسماعیلی] شاعر ناصر خسرو کا گزر ۴۳۸ھ/ ۱۰۴۶ء میں معرۃ النعمان سے ہوا تھا۔ وہ اپنے سفر نامہ (طبع شیفر (Ch. Schefer)، پیرس ۱۸۸۱ء، متن ص ۱۰ بعد) میں لکھتا ہے:

''وہاں ایک شخص تھا جسے ابوالعلاء معرّی کہتے تھے...... وہ شہر کا رئیس تھا، بہت سی نعمتوں کا مالک۔ اس کے بے شمار نوکر چاکر تھے اور پورا شہر گویا اس کا غلام تھا، لیکن وہ زاہدانہ زندگی بسر کرتا تھا، گلیم پہنے گھر میں بیٹھا رہتا، کھانے کو نصف من (ایک رطل) جَو کی روٹی مقرر کر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کچھ نہیں کھاتا تھا...... شہر کے نظم و نسق کی نگرانی اس کے نائبوں اور ملازموں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس سے رجوع کرتے تھے تو صرف بڑی بڑی باتوں میں''۔ ممکن ہے ناصر خسرو کو اشتباہ ہوا ہو اور اس نے ابوالعلاء کے حق میں محض اس کے ہم وطنوں کی غیر معمولی عزت و احترام کو حقیقی اقتدار سمجھ لیا ہو۔

اس زمانے میں ابوالعلاء اگرچہ عمر رسیدہ ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود اس کے قوائے ذہنی میں کوئی انحطاط نہیں آیا، جیسا کہ ان رسائل سے معلوم ہوتا ہے جو اس نے اس دور میں لکھے۔ برعکس اس کے کیا باعتبار معنی اور کیا باعتبار اسلوب یہ رسائل اس کے دوسرے رسائل سے کہیں زیادہ پُرزور ہیں۔ اس نے ۱۳ ربیع الاوّل ۴۴۹ھ/ [۲۰ مئی ۱۰۵۷ء] کو تین روز بیمار رہنے کے بعد وفات پائی۔ قبر کے کتبے اور لوح کے لیے دیکھیے E. Littman: *Semitic Inscriptions*، نیویارک ۱۹۰۴ء، ص۱۸۹ بعد۔ ازدواج اور سلسلۂ توالد و تناسل کے خلاف اس کے اشعار، جو کہا جاتا ہے کہ اس کی لوح مزار پر کندہ تھے، مٹ چکے ہیں۔ وہ سپردِ خاک کیا گیا تو ستّر سے زائد شاعروں نے اس موقع پر مرثیے پڑھے۔

تصانیف: ابوالعلاء کی تصنیفات بے شمار ہیں، جو اس نے املا کرائیں۔ یہ خدمت ابوالحسن علی بن عبداللہ اصفہانی نے سر انجام دی، جو گویا اس کا مستملی (منشی یا نویسندہ) تھا۔ اس نے اس کی تصنیفات کی فہرست بھی تیار کی (دیکھیے Margoliouth: *Index librorum Abu'l-Alae Ma'arren Cent. de Amari*، پلرمو ۱۹۱۰ء، ۱: ۲۱۷ بعد۔ ناموں کی اس فہرست کا پورا متن جمال الدین ابوالحسن علی بن یوسف القفطی کی کتاب انباء الرواۃ علی انباء النحاۃ، طبع محمد بن ابی الفضل ابراہیم، قاہرہ ۱۹۵۰ء، ۱: ۵۶-۶۷، میں موجود ہے)۔ اس رسالے میں تہتّر کتابوں یا رسالوں کا ذکر ہے جن میں سے اکثر نایاب ہیں۔

منظوم تصانیف: (۱) سقط الزند، قاہرہ ۱۳۰۴ھ و ۱۳۱۹ھ۔

اس کی شروح: ابوالعلاء کی اپنی لکھی ہوئی شرح ضوء السقط، تبریزی اور بطلیوسی کی شرح (قاہرہ ۱۲۷۴ھ)، القاسم بن الحسین الخوارزمی کی شرح (ضرام السقط، تبریز ۱۲۸۶ھ)، ابویعقوب یونس بن طاہر کی شرح (شرح التنویر علی سقط الزند، بولاق ۱۲۸۶ھ، قاہرہ ۱۳۰۴ و ۱۳۲۴ھ، تبریز ۱۲۷۶ھ) تبریزی، بطلیوسی اور خوارزمی کی شرحیں یکجا دیدہ زیب صورت میں چھپ چکی ہیں، شروح سقط الزند، ج ۱-۴، قاہرہ ۱۹۴۵-۱۹۴۸ء، (لجنۃ احیاء آثار ابی العلاء، عدد ۲)۔

ابوالعلاء کے اپنے قول کے مطابق یہ دیوان اس کے عہدِ شباب کا ہے۔ اس دیوان میں اس کا وہ مرثیہ، جو اس نے چودہ سال کی عمر میں اپنے والد کی وفات پر کہا تھا اور بغداد سے واپسی پر کہے ہوئے اشعار بھی موجود ہیں۔ یہ دیوان قصائد، مراثی اور بعض دوسرے اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا جوانی کا کلام بلحاظ موضوع تو سادہ ہے، لیکن بلحاظ اسلوب پُرتکلّف۔ بعد کے کلام میں نادر کلمات زیادہ ملتے ہیں اور اس اعتبار سے دیکھیے تو دورِ جاہلیت کے اشعار اور ان میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ مدحیہ قصائد کسی نہ کسی شاعر یا ادیب کے مدحیہ قصیدے کے جواب میں ہیں۔ چند ایک قصائد ایسے بھی موجود ہیں جو بعض موہوم اشخاص کی شان میں لکھے گئے ہیں یا پھر ممکن ہے کہ ابوالعلاء نے یہ قصیدے مشق کے طور پر کہے ہوں۔ ان قصائد میں مُتنبّی کا رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ مرثیوں میں وہ اپنے دکھ اور مصائب کا حال بیان کرتا ہے، لیکن چونکہ اسے یومِ آخرت پر ایمان نہ تھا یا اس کے بارے میں اسے شکوک و شبہات تھے، اس لیے یہ دکھ درد اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ ابوالعلاء نے وہ سب کلمات استادانہ مہارت اور قوت سے استعمال کیے ہیں جن کا تعلق عالم فانی اور موجودات کی بے مائگی اور بے بضاعتی سے ہے اور جو اس کے ذہن میں موجود ہیں۔ لہٰذا ہم بھی اس کے ایک مرثیے کو طٰہٰ حسین (شرح التنویر، قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ۱: ۲۷۳ بعد) کے ہم نوا ہو کر ادبیات عربی میں بے مثل شمار کر سکتے ہیں۔

(۲) الدِّرعیات: ابوالعلاء نے خود اسے ایک الگ تصنیف قرار دیا ہے، لیکن سقط الزند کے آخر میں کتاب کے ایک حصے کے طور پر مع شرح چھپ چکی ہے (مثلاً دیکھیے شروح سقط الزند، ۴: ۱۶۴۰-۱۹۳۱)۔ اس کتاب میں ابوالعلاء نے وہ سب اشعار جمع کر دیے ہیں جو اس نے دِرع [زرہ] کی صفت میں لکھے ہیں۔

(۳) اللُّزُومِیّات یا لُزُومُ مالا یَلْزِمُ (قاہرہ ۱۸۹۱ء؛ بمبئی ۱۳۰۳ھ؛ قاہرہ

۱۳۳۲ھ و ۱۹۳۰ء): یہ دیوان ابوالعلاء کے ان اشعار پر مشتمل ہے جن میں ہر شعر صنعتِ لزوم مالا یلزم کے مطابق لکھا گیا، یعنی اس میں ہر بیت کے قافیے میں دو حرف روی آئے ہیں۔ طٰہٰ حسین کی راے میں، جس نے ابوالعلاء پر بہترین کتاب لکھی ہے، ابوالعلاء نے اس تصنع اور تکلف سے اس لیے کام لیا کہ خیالات کو مخفی رکھ سکے (دیکھیے تجدید ذکری ابی العلاء، طبع سوم، قاہرہ ۱۳۶۵ھ، ص ۲۱۸ و ۲۶۱ بعد)۔ فی الحقیقت اللزومیات بہ نسبت ایک دیوان اشعار کے ایک فلسفیانہ تصنیف سے زیادہ قریب ہے، اس لیے کہ اس کا موضوع ہیں فلسفیانہ مسائل، مثلاً مادّہ، زمان و مکان، ذات باری اور روح وغیرہ۔ ابوالعلاء کی اپنی شخصیت ان اشعار میں ایک بے باک مفکّر اور بلند اخلاق معلّم کی حیثیت سے اجاگر ہوتی ہے؛ وہ اخلاقی اور اجتماعی خرابیوں پر بڑی جسارت سے اعتراض کرتا ہے۔ انسانی مسائل مجموعی طور پر اس کے سامنے ہیں، جن کا اس نے کاملاً مطالعہ کیا ہے۔ اس نے زندگی کے مسائل مہمّہ پر غور و خوض کیا۔ اندریں صورت ابوالعلاء کا مقابلہ شعراے متقدمین سے جائز نہ ہوگا۔ ابوالعلاء اسلاف سے ہر رشتہ منقطع کرتے ہوے نسبۃً ایک بلند تر نقطۂ نظر کی حمایت کرتا ہے۔

منثور تصانیف: (۱) کتاب الفصول والغایات، جسے [غلط طور پر] کہا جاتا ہے (مثلاً ناصر خسرو، در سفر نامہ) کہ اس نے قرآن پاک کے مقابلے میں بطور جواب کے تصنیف کیا تھا۔ اس کتاب کا ایک نسخہ ملتا ہے، جو طبع ہو چکا ہے (دیکھیے A. Fischer: *Der "Koran" des Abu'l-Ala' al- Ma'arri*، در *Berichte über die Verhandlungen der Sachsischen Akad. der Wiss. zu Leipzig, Philol-hist. Klasse*، لائپزگ ۱۹۴۲ء، حصہ ۹۴، جزء ۲) ادب و حکمت کے موضوع پر یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے۔

(۲) رسائل: یہ ان مکتوبات کا مجموعہ ہے جو ابوالعلاء نے مختلف موقعوں پر لکھے ہیں؛ مختصر مکتوبات کی طبعات یہ ہیں: رسائل ابی العلاء المعرّی، مع شرح شاہین افندی، بیروت ۱۸۹۴ء؛ مع انگریزی ترجمہ از D. S. Margoliouth: *Letters of Abu'l 'A. of Ma'arra*، متن مبنی بر نسخہ لائڈن مع سوانح مصنف از الذہبی (اوکسفرڈ ۱۸۹۸ء)۔ ان مکتوبات میں سے بعض اتنے طویل ہیں کہ انھیں ایک مستقل کتاب ٹھیرایا جا سکتا ہے، جیسا کہ خود ابوالعلاء نے بھی شمار کیا ہے۔ ان میں زیادہ اہم مکتوب یہ ہیں:

(۱) رسالۃ الغفران (طبعات: رسالۃ الغفران، مع دیگر رسائل و شرح، طبع کامل کیلانی، طبع سوم، قاہرہ ۱۹۳۸ء؛ طبع بنت الشاطئ، مع تحقیق و شرح، قاہرہ ۱۹۵۰ء، علمی اور درست طباعت ہے، جس میں متن کا مقابلہ جملہ معلومہ نسخوں سے کیا گیا اور پھر چھاپا گیا۔ دوسری فروع کے لیے نیز دیکھیے R. Blachere: *Ibn al-Qarih et la genese de l'Epitre du pardon d'Al-Ma'arri (Revue des études islamiques (1941-1946)*، پیرس ۱۹۴۷ء، ص ۱ - ۱۵)۔ یہ رسالہ اس نے الوزیر المغربی کے بیٹے کے معلّم ابو منصور علی بن القارح الحلبی کے خط کے جواب میں تصنیف کیا (اس رسالے کے متن کے لیے دیکھیے کامل کیلانی، طبع مذکور، ص ۱۷ - ۶۰؛ محمد کرد علی: رسائل البلغاء، طبع ثالث، قاہرہ ۱۳۶۵ھ، ص ۲۵۴ - ۲۷۹)۔ اس کی تاریخ تالیف ضرور ۴۲۴ھ/ ۱۰۳۳ء سے مؤخر ہے۔ اس رسالے کے دو حصّے ہیں: پہلا حصہ رسالۃ الغفران ہے، جس میں ابوالعلاء قرآن [پاک] کی ایک آیت (۱۴ [ابراہیم]: ۲۴) کے ذریعے ابن قارح کو عالم عقبٰی کی سیر کراتا ہے، گو اپنے اشعار میں وہ ان معلومات کے متعلق، جو اس عالم کے بارے میں دی گئی ہیں، شک کا اظہار کرتا ہے، البتہ اس مکتوب میں اس نے جنت، جہنم اور اعراف کا وہی تصور پیش کیا ہے جو قصص و روایات و عنعنہ میں ملتا ہے؛ لیکن عالم عقبٰی کی سیر کے بارے میں یہ موضوع اس کے اپنے تصور و تخیّل کا ثمرہ ہے۔ اس رسالے اور اطالوی شاعر دانتے (Dante) کی کتاب *Divina Comedia* میں بڑی مشابہت پائی جاتی ہے، جیسا کہ ایک ہسپانوی عالم A. Palacios نے ثابت کیا ہے (دیکھیے M. Asin y Palacios: *Le Escatologia musulmana en la Divina Comedia*، میڈرڈ ۱۹۱۹ء؛ اس کتاب کا ترجمہ اور اختصار انگریزی میں بعنوان *Islam and the Divine Comedy*، از H. Sunderland، لنڈن ۱۹۲۶ء) کہ دانتے نے یہ موضوع ابوالعلاء ہی سے لیا ہے (اس موضوع پر مباحث کے نتائج اور مآخذ کے لیے دیکھیے M. Asin y Palacios: *L'influence musulmane dans la Divine comédie, histoire et critique d' une polemique*، در *Revue de litteráture comparée*، ج ۴، ۱۹۲۴ء، ص ۱۶۹ بعد، ۳۶۹ بعد و ۵۳۷ بعد۔

دوسرا حصّہ (گویا حصّۂ اوّل کا) جواب ہے اور اس میں بالخصوص زنادقہ کے متعلق بہت سی معلومات ہیں۔

(ب) رسالۃ الملائکۃ: زمانۂ قریب تک ہمیں اس کتاب کے صرف مقدمے کا علم تھا، جسے چند علما نے شائع بھی کر دیا تھا (دیکھیے Kraçkovsky: *Tasr Trude inst. vostokov. Ak. Nauk. SSSR III, 1932*، کامل کیلانی، طبع مذکور، ص ۱۴۱ - ۱۴۷)۔ ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۴ء میں اس رسالے کا ایک مکمل نسخہ شام میں دستیاب ہوا اور اسے محمد سلیم الجندی نے مع شرح طبع کیا، بعنوان رسالۃ الملائکۃ املاء الشیخ الامام ابی العلاء، دمشق ۱۹۴۴ء (مطبوعات المجمع العلمی العربی بدمشق، عدد ۱۲)۔ اس کے مقدمے میں ابوالعلاء نے اپنے بڑھاپے کا ذکر کرتے ہوے لکھا ہے کہ اسے ہر وقت ملک الموت سے نزاع و جدال میں مصروف رہنا پڑتا ہے۔ وہ اپنی خیالی پرواز و سیاحت میں فرشتوں سے علم صرف کے متعلق سوالات پوچھتا ہے اور خود ہی ان کے جوابات دیتا ہے۔ رسالے کے دوسرے حصے میں سولہ صرفی مسائل کے جوابات ہیں۔

(ج) رسالۃ الشیاطین، متن در کامل کیلانی: رسالۃ الغفران، طبع مذکور، ص ۴۷۵ - ۵۰۶۔

(د) رسالۃ الاِغْرِیْض (متن در کامل گیلانی، ص ۵۷۴-۶۱۰) الوزیر المغربی کے بیٹے ابوالقاسم المغربی کے خط کا جواب ہے، جس نے ابن السکیت کی کتاب اصلاح المنطق کا اختصار کیا تھا۔ یہ رسالہ اسی کے متعلق ہے۔

(ہ) یہ خط داعی الدعاۃ المؤیّد ابونصر بن ابی عمران کے نام گوشت نہ کھانے کے بارے میں لکھا گیا ہے (متن کے لیے دیکھیے یاقوت: معجم الادباء، ۳:۱۷۵-۲۱۳؛ D. S. Margoliouth: *Abu'l 'Ala al-Ma'arri's Correspondence on Vegetarianism*، در *JRAS*، ۱۹۰۲ء، ص ۲۹۸ ببعد)۔

۳- ملقی السبیل فی الوعظ والزھد (طبعات: حسن حسنی عبدالوہاب، در المقتبس، سال ۱۳۲۹-۱۳۳۰ھ، رسائل البلغاء، طبع مذکور، ص ۲۸۰-۲۹۹)۔ نظم و نثر پر مشتمل یہ رسالہ دنیا کی بے ثباتی، انسان کی غفلت اور نصائح کے بارے میں ہے۔

ابوالعلاء کی نثر بھی نظم کی طرح پُرتکلف اور پُرتصنع ہے۔ اس کی تمام نثری تصانیف میں چند غیر مسجّع جملوں کا ملنا بھی ممکن نہیں۔ اس نے اسی پر بس نہیں کی، بلکہ اپنی تصانیف نثر کو نادر کلمات اور مختلف قسم کی علمی اصطلاحات سے بھر دیا ہے۔ صرفی مسائل کی تحقیق وہ بڑی دقتِ نظر سے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نثر کو سمجھنے سے پہلے ہمیں ان مشکلات اور دشواریوں سے نپٹ لینا چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے اس مزاح اور تمسخر کا، جو رسالۃ الغفران میں پایا جاتا ہے، صدیوں تک احساس نہ ہوسکا۔

ابوالعلاء نے بعض شعرا کے دیوانوں کی شرحیں بھی لکھی ہیں، جن میں سے مندرجۂ ذیل آج تک موجود ہیں:-

(۱) شرح دیوان الحماسۃ؛ (۲) عبث الولید، شرح دیوان ابی الولید البحتری (طبع محمد عبداللہ المدنی، دمشق ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء)۔ عبدالقادر البغدادی: خزانۃ (۲: ۸۳) میں دیوان البحتری کی جس شرح کا ذکر کرتا ہے ممکن ہے وہ یہی ہو۔

ابوالعلاء کے ایمان اور عقائد کے مسئلے پر بھی بڑی طول طویل بحثیں ہوتی رہیں۔ بعض لوگ اس کی حمایت کرتے ہیں، بعض اسے زندیق اور ملحد گردانتے ہیں۔ بیشتر اسلامی تصانیف مؤخر الذکر رائے پر متفق ہیں، لیکن اس کی تصانیف میں جو بھی دلائل موجود ہیں ذومعنی ہیں، بلکہ کبھی کبھی یہ دلائل ایک دوسرے سے متناقض بھی ہو جاتے ہیں۔ یہاں اس امر کو، جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں، پھر بیان کر دینا ضروری ہے کہ اس کی کتاب الفصول و الغایات، قرآنِ [کریم] کے مقابلے میں نہیں لکھی گئی اور اللزومیات میں تو وہ ایک زاہد اور پرہیزگار مسلمان معلوم ہوتا ہے؛ لیکن کہا جاتا ہے کہ جہاں کہیں وہ اپنے کو ایک راسخ الاعتقاد مسلمان ظاہر کرتا ہے وہاں اس کا مقصد دراصل یہ ہوتا ہے کہ اپنے دشمنوں کو خاموش کر دے۔ بایں ہمہ اگر کوئی خیال حقیقت سے نزدیک تر ہے تو بظاہر یہی کہ ابوالعلاء نے اکثر ادیان و مذاہب سے واقفیت حاصل کر لی تھی۔ وہ ان دلائل سے واقف تھا جو ہر مذہب کا پیرو اپنے دین کے حق میں پیش کرتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ باطنیوں کی تشکیک (Scepticism) سے بے خبر ہو۔ ان سب عوامل نے اس کو مذہب کے بارے میں حیرت زدہ کر دیا تھا جیسا کہ اپنی زندگی کے ابتدائی حصے میں الغزالیؒ کی حالت تھی (دیکھیے المُنْقِذ من الضّلال)۔

ابوالعلاء بلاشک و شبہہ خدا کی وحدانیت کا قائل ہے، لیکن اس کے نزدیک اللہ [تعالیٰ] کی ہستی جملہ محتویات سے مبرا ہے، گویا ابوالعلاء کے اعتراضات کا تعلق دین کے اساسی اور بنیادی مسائل سے نہیں، بلکہ ان فرعی عناصر اور افکارِ باطلہ سے ہے، جو دین میں داخل ہو گئے ہیں۔

ابوالعلاء کے افکار کی بنیاد بڑی تلخ قنوطیت پر ہے۔ اس کے خیال میں زندگی کی ناپائداری، مصائب و آلام اور طرح طرح کی بیماریوں، موت اور بدبختی نے ہر طرف سے انسان کو گھیر رکھا ہے۔ بسبب اپنی معذوری کے وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ اپنی مشکلات پر قابو پانے کی کوشش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا محبت بھرا اور نیک دل شک کی طرف مائل رہتا تھا۔ وہ ہر وقت ان مصائب سے.... نالاں نظر آتا ہے۔ اس کا استدلال ہے [اور سرتا سر غلط ہے] کہ اگر عالم شر سے معمور ہے اور خدا اس شر کو خیر میں تبدیل نہیں کرتا تو یوں اس کے قادر المطلق ہونے میں کچھ شک سا پیدا ہو جاتا ہے [حالانکہ نہ عالم شر سے معمور ہے نہ اس شر کو دور کرنا، جس سے انسان کو سابقہ پڑتا ہے، اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ اس کی ذمے داری انسان پر ہے]۔ اندریں حالات ابوالعلاء نے اس بارے میں جو کچھ کہا ہے لفظی معنوں میں قبول کرتے ہوئے اس پر الحاد کی تہمت لگانا غلط ہے [بایں ہمہ یہ صحیح ہے کہ وہ اسلام کی صحیح روح سے بے خبر تھا]۔ وہ خود کہتا ہے کہ ان ابیات کے دوسرے معنی بھی ہیں، لیکن ہوسکتا ہے یہ بات بھی درست نہ ہو، کیونکہ ان اشعار کے معانی واضح ہیں، البتہ یہ ممکن ہے کہ ان ابیات کو، جیسا کہ اس سے پہلے واضح کر دیا گیا ہے، بے معنی اور محض شکایت اور فریاد و فغاں پر محمول کیا جائے اور اس کے علاوہ ہم ان کو کوئی دوسرے معنی نہ پہنائیں۔

ابوالعلاء نے اپنی زندگی کے آخری حصے میں گوشت، انڈے اور دودھ کا استعمال ترک کر دیا تھا، لیکن الحاد یا ہندو برہمنوں کے زیر اثر نہیں، بلکہ اس کے اپنے قول کے مطابق وہ نتیجہ تھا اس کے اس جذبۂ ترحم کا جو اسے حیوانات کے ساتھ تھا۔ ابوالعلاء نے شادی بھی نہیں کی۔ اس کا خیال تھا کہ اولاد پیدا کرنا گناہ ہے، کیونکہ دوسرے انسانوں کی طرح اولاد کی قسمت میں بھی بدبختی ہی لکھی ہوگی۔ [یہ خیال اسلام ہی کے نہیں، حقائق کے بھی خلاف ہے اور المعرّی کی قنوطیت پر مبنی]۔

موت چونکہ زندگی کے بارگراں سے رہائی کا ذریعہ ہے، لہٰذا اسے ایک مبارک حادثہ شمار کرنا چاہیے۔ وہ عورتوں کے بارے میں بھی اچھی رائے نہیں رکھتا تھا۔ اس کی نظر میں عورت بھی مرد ہی کی طرح بدفطرت ہے۔ وہ تعدّد ازواج کا بھی قائل نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا عورت کو صرف گھریلو کاموں میں مصروف رہنا چاہیے۔ اسے چاہیے خاوند سے محبت اور احترام کا تعلق قائم رکھے۔ [ظاہر ہے یہ سب ایک

ادیب اور شاعر کے خیالات ہیں اور اس کی اپنی ذات سے مختص].

ان سلبی افکار کے ساتھ ساتھ ابوالعلاء کے ہاں کچھ مثبت افکار بھی ملتے ہیں۔ وہ ہر وقت اور ہر حال میں نیکی اور راست بازی پر زور دیتا ہے اور ان فضیلتوں کو دوسرے باقی جملہ فضائل سے بلند تر سمجھتا ہے۔ وہ اس امر کے لیے کوشاں ہے کہ نظامِ اجتماعی میں ظلم کو اقتدار اور غلبہ حاصل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسے حکامِ وقت، علما اور قاضیوں پر تنقید کرنے سے کبھی فرصت نہیں ملی.

مآخذ: (متن مقالہ میں مندرجہ مآخذ کے علاوہ) اس کی زندگی کے لیے مآخذ کے متون (۱) الثعالبی کی تتمۃ الیتیمۃ سے لے کر (۲) عباس المکی کی نزھۃ الجلیس تک اس کتاب میں طبع ہو چکے ہیں: (۳) تعریف القدماء بابی العلاء، جسے طٰہٰ حسین کی نگرانی میں وزارت معارف عمومی کے ارکان کی ایک جماعت نے جمع کیا اور اس پر تحقیق کی، طبع قاہرہ ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۴ء (آثار ابی العلاء المعرّی، ج ۱)، اس کتاب میں ابن عدیم کی کتاب الانصاف والتحرّی کا متن بھی درج ہے (ص ۴۸۳-۵۷۸)؛ (۴) یوسف البدیعی: اوج التحرّی عن حیثیۃ ابی العلاء المعرّی، طبع ابراہیم الکیلانی، دمشق ۱۹۴۴ء (المعھد الافرنسی، دمشق، مجموعۃ النّصوص الشرقیّۃ)؛ تحقیقی تصنیفات میں اہم ترین یہ ہیں: (۵) الرّاجکوتی: ابوالعلاء وما الیہ، قاہرہ ۱۳۲۸ھ؛ (۶) احمد تیمور پاشا: ابوالعلاء المعری نسبہ، شعرہ و معتقدہ، قاہرہ ۱۳۵۹ھ؛ (۷) عمر فرّخ: حکیم المعرّۃ، بیروت ۱۹۴۴ء؛ (۸) براکلمان (Brockelmann)، ۱: ۲۵۴-۲۵۵ و تکملہ، ۱: ۴۴۹-۴۵۴؛ (۹) H. Laoust: *La vie et la philosophie d' Abū-l ʻĀla' al-Ma'rrī*، در *Bulletin d' Etudes Orientales*، ج ۱۰، ۱۹۴۴ء، ص ۱۱۹-۱۵۷.

(احمد آتش)

---

* **ابوعلی (AL BOHALI):** رکّ بہ الخیّاط.

---

* **ابوعلی بن سینا:** رکّ بہ ابن سینا.

---

* **ابوعلی القالی:** رکّ بہ القالی.

---

* **ابوعلی (بوعلی) قلندر** [رح]: شیخ شرف الدین پانی پتی، ہندوستان کے بزرگ ترین اولیاء اللہ میں سے ایک، جن کے متعلق خیال ہے کہ انھوں نے ۷۲۴ھ/ ۱۳۲۴ء میں وفات پائی۔ شیخ موصوف کے سوانح حیات کے بارے میں معتبر اطلاعات کی اتنی کمی ہے کہ ان کے عہد کی اُن تصنیفات میں جو اب تک سلامت ہیں، ان کا نام تک مذکور نہیں۔ سب سے پرانا حوالہ جو ان کے متعلق ملتا ہے، عفیف کی تاریخ فیروز شاہی (محررہ ۸۰۰ھ/ [۱۳۹۷-۱۳۹۸ء]) میں ہے، جس میں سلطان غیاث الدین تغلق کی ان سے ملاقات کا حال بیان کیا گیا ہے؛ البتہ گیارھویں صدی ہجری/ سترھویں صدی عیسوی میں ان کی زندگی کے جو حالات قلم بند ہوئے ان میں بتایا گیا ہے کہ وہ پانی پت کے رہنے والے تھے، جہاں ان کے والد ماجد سالار فخر الدین عراق سے آ کر آباد ہوئے تھے۔ ابتدا میں ان کی تعلیم و تربیت بطور ایک عالمِ دین کے ہوئی، لیکن آخر الامر انھوں نے اہلِ مدرسہ کو خیر باد کہی، اپنی کتابیں دریا میں پھینک دیں اور قلندر بن گئے۔ عشق الٰہی کے جذبے میں انھوں نے احکامِ الٰہیہ اور سنتِ نبوی [صلعم] کی پابندی بھی چھوڑ دی، تاہم بڑی سخت ریاضتیں اور انتہائی نفس کشی کرتے رہے۔ ان کا شمار [حضرت] قطب الدین بختیار کاکی [رکّ بآن] کے روحانی شاگردوں میں ہوتا ہے، لیکن یہ امر کہ وہ صوفیہ کے کسی منظم سلسلے سے تعلق رکھتے تھے، بہت مشتبہ ہے۔ ان کی زندگی، کرامات اور وفات کے بارے میں بے شمار روایتیں مشہور ہیں، حتّٰی کہ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ پانی پت یا کرنال کا مزار فی الواقع انھیں کا ہے، اگرچہ پانی پت کا مزار زیادہ مشہور ہے۔ ذیل کی تصانیف ان سے منسوب کی جاتی ہیں: عشق الٰہی (حقیقی) کے موضوع پر ان کے مکتوبات، جو انھوں نے اختیار الدین کو لکھے (ذخیرۂ سلیمان، علی گڑھ یونیورسٹی)؛ حِکَم نامہ (طبع Ivanow، As. Soc. Bengal، شمارہ ۱۱۹۶)، جو قطعی طور پر جعلی ہے اور دو مثنویاں: کلام قلندر (طبع میرٹھ) اور مثنوی بو علی شاہ قلندر (طبع لکھنؤ ۱۸۰۱ء).

مآخذ: (۱) اخبار الاخیار؛ (۲) گلزار ابرار (طبع Ivanow، As. Soc. Bengal، شمارہ ۲۵۹ ببعد، ورق ۳۲-۳۳)؛ (۳) صبح صادق (ذخیرۂ عبدالسجان، علی گڑھ یونیورسٹی، ج ۳، ورق ۴۱۱ الف)؛ (۴) سیر الاقطاب؛ (۵) مرآۃ الاسرار (متحف برطانیہ، شمارہ ۲۱۶، .Or، ورق ۳۸۶ الف)، (۶) معارج الولایۃ (مخطوطۂ نظامی، علی گڑھ یونیورسٹی، ص ۲۳۰-۲۳۵)؛ (۷) شرف المجالس (ذخیرۂ سلیمان، علی گڑھ یونیورسٹی)؛ (۸) *Punjab Dist. Gazetteer*، [متعلقہ ضلع] کرنال ۱۹۱۸ء، ص ۷۶، ۲۱۰-۲۱۱، ۲۲۳-۲۲۴؛ (۹) *Proc. As. Soc. Bengal.*، ۱۸۷۰ء، ص ۱۲۵؛ ۱۸۷۳ء، ص ۹۷.

(نور الحسن)

---

* **ابوعلی محمد بن الیاس:** رکّ بہ الیاسیہ.

---

* **ابوعمرو زَبّان بن العلاء:** [شذرات الذھب میں ابوعمرو بن العلاء بن عمّار التمیمی المازنی البصری،] قرآن پاک کا نامور قاری، جسے نحو میں دبستان بصرہ کا بانی تصور کیا جاتا ہے، م نواح ۱۵۴ھ/ ۷۷۰ء۔ معلوم ہوتا ہے اسے تمیم کے حلیف قبائل میں سے قبیلۂ مازن سے نسبت کا دعوٰی تھا — دیکھیے ابن خلّکان اور دوسرے سوانح نگار بشمول ابن الجزری، جس نے ایک علٰیحدہ و منفرد بیان میں اسے [بنو] حنیفہ [شمالی عرب میں قبیلۂ بکر بن وائل کی ایک شاخ؟] سے منسوب کیا ہے۔ یہ امر کہ اس کا نام ''زبّان'' تھا پورے طور پر کبھی ثابت نہیں ہو سکا اور اسے

اگر ترجیح حاصل ہے تو محض دوسرے ناموں کے مقابلے میں (شذرات الذہب میں یہ نام مذکور نہیں)۔ خیال یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ۷۰ھ/ ۶۸۹ء کے قریب مکۂ [معظّمہ] میں، یا ایک عام طور پر مسلّمہ روایت کی رو سے (بشمول ابن الجزری، ۱:۲۹۲ـــ (ابوعمرو کے ایک شاگرد قاری عبدالوارث، م ۱۸۰ھ/ ۷۹۶ء کے حوالے سے) جنوبی ایران کے شہر کازرُون میں پیدا ہوا، جیسا کہ الجزری، ۱: ۲۸۹، کی واحد شہادت سے پتا چلتا ہے۔ اگر پہلی روایت صحیح ہے تو عراق جانے سے پہلے اس نے بچپن کا زمانہ حجاز میں گزارا ہوگا اور اگر دوسری صحیح ہے تو معاملہ اس کے برعکس ہوگا۔ بہر حال امر طے شدہ یہ ہے کہ جب اس کے باپ نے حجاج کی شرطہ (پولیس) سے تنگ آ کر عراق سے بھاگ کر جنوبی عرب میں پناہ لی تو ابوعمرو اس کے ساتھ تھا؛ دیکھیے ابن الجزری، ۱:۲۸۹ (بظاہر متن میں کچھ خلا رہ گئے ہیں) اور ابن خلّکان، ۱:۳۸۶ تا اختتام۔ (ابن الانباری، ص ۳۲ محض یہ کہتا ہے کہ ابو عمرو کو الحجاج سے بھاگنا پڑا۔ وہ کوئی تفصیل بیان نہیں کرتا)۔ ابوعمرو کی اپنی یادداشت کے مطابق اس کی عمر اس وقت بیس سال سے کسی قدر زیادہ تھی (یوں ان بیانات کا وزن کسی قدر بڑھ جاتا ہے جو اس کی تاریخ ولادت ۷۰ھ/ ۶۸۹ء بتاتے ہیں؛ دیکھیے ابن خلّکان، ۱:۳۸۷)۔ ابن الجزری کی ایک عبارت، ۱:۲۸۹، س۸، کی بنا پر ہم بجا طور پر فرض کر سکتے ہیں کہ اس سفر کی بدولت اسے مکۂ [معظّمہ] اور مدینۂ [منوّرہ] میں قراءت قرآنی کو جاری رکھنے کا موقع مل گیا اور یہ سلسلہ بظاہر عراق واپس آنے پر بھی قائم رہا؛ لیکن ابن الجزری کے اس دعوے کو ابن خلّکان، ۱:۳۸۷، کے اس بیان سے تطبیق دینا مشکل ہے کہ ابوعمرو اور اس کا باپ ۹۵ھ/ ۷۱۴ء میں الحجاج کی وفات کے فوراً بعد عراق لوٹ آئے تھے۔ بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ عراق میں سکونت کے بعد ابوعمرو پھر شاذ ہی بصرے سے باہر گیا۔ فرزدق (م ۱۱۴ھ/ ۷۳۲-۷۳۳ء) نے اپنے ایک شعر میں جس شخص کی تعریف کی ہے اس کا اشارہ اگر فی الواقع ابوعمرو کی طرف ہے (دیکھیے السُّیوطی: بغیۃ، ۳۶۷) تو ماننا پڑے گا کہ ابوعمرو اس تاریخ سے پہلے ہی اپنے اختیار کردہ مسکن میں بہت کافی شہرت حاصل کر چکا تھا، قب اس کے بارے میں وہ تعریفی جملہ، جسے الحسن البصریؒ (م ۱۱۰ھ/ ۷۲۸ء) سے منسوب کیا جاتا ہے اور جسے ابن الجزری، ص ۲۹۱، نے آگے نقل کیا ہے؛ تاہم ایسی کوئی شہادت موجود نہیں جس سے بنواُمیّہ کے حکام سے اس کے تعلقات کا اظہار ہو۔ اس کے برعکس جب بنوعباس برسرِ اقتدار آئے تو معلوم ہوتا ہے بسبب اپنی شہرت کے وہ سرکاری حلقوں میں بھی روشناس ہو چکا تھا، کیونکہ بیان کیا جاتا ہے کہ خلیفہ السّفّاح کے چچا سلیمان (ابن خلّکان، ۱:۳۸۷) اور اسی طرح خلیفہ المہدی کے چچا یزید (دیکھیے الفہرست، ص ۵۰، س ۱۵)، نیز عبدالوہاب حاکم شام سے اس کے تعلقات تھے۔ مؤخر الذکر سے ملاقات کرنے کے بعد ابوعمرو واپس آیا تھا کہ ۱۵۴ھ/ ۷۷۰ء (یا ۱۵۵ھ/ ۷۷۱ء یا ۱۵۹ھ/ ۷۷۶ء) کے لگ بھگ اس کی وفات ہوگئی اور وہ کوفے میں دفن ہوا؛ دیکھیے ابن الجزری، ص ۲۹۳ (ابن خلّکان نے تاریخ وفات ۱۵۹ھ/ ۷۷۵ء بھی دی ہے)۔

معلوم ہوتا ہے ابوعمرو نے کوئی تصنیف نہیں چھوڑی، لہٰذا ابن الندیم (ص ۴۱) جب یہ کہتا ہے کہ اس نے یثہ میں ابوعمرو کے مخطوطات چوتھی صدی ہجری/ دسویں صدی عیسوی میں دیکھے تھے اور پھر جب یہی مصنف ص ۸۸ پر لکھتا ہے کہ کتاب النوادر کا ایک نسخہ، جو ابوعمرو نے چھوڑا تھا، بجنسہٖ باقی ہے تو اس سے اس کی مراد یقیناً وہی تحریریں ہوں گی جو اس کے شاگردوں نے اس کے درسی خطبات کی بنا پر تیار کی تھیں۔

ابوعمرو کا تعلق اس قرن کے علما سے ہے جن کا خیال تھا کہ عربی زبان کی تحصیل کا دارومدار قرآن پاک کے مطالعے پر ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص ابوعمرو قاری کو ابوعمرو نحوی اور ابوعمرو راویِ اشعار سے الگ کر کے دکھانے کی کوشش کرے تو یہ امتیاز محض اس کی ذاتی رائے پر مبنی ہوگا۔

قیامِ حجاز کے دوران میں ابوعمرو نے مکۂ [معظّمہ] اور مدینۂ [منوّرہ] کے طریق قراءت سے، جن کی اس وقت تشکیل ہو رہی تھی، آگاہی حاصل کی اور بالخصوص ابوالعالیہ [رتّ بآن] اور ابن کثیر کا تتبّع اختیار کیا۔ عراق میں اس نے ابی اسحٰق الحضرمی اور دوسرے قاریوں کے (بصرے میں) اور عاصم کے (کوفے میں) اصولِ قراءت کا مطالعہ کیا۔ ابن الجزری، ص ۲۸۹، نے اس کے اساتذہ کی ایک فہرست بھی دی ہے؛ قب نیز السُّیوطی: مُزہر، ۲: ۳۹۸ و الفہرست، ص ۳۹۔ آخر الامر اس نے اپنا ایک مستقل طریق قراءت مرتّب کیا، جس پر مکۂ [معظّمہ] اور مدینۂ [منوّرہ] کے اثرات غالب ہیں اور جس کے مآخذ کی C. Pellat (*Milieu Basrien*، ص ۷۷ بعد) نے ایک مکمل فہرست تیار کی ہے۔ ابوعمرو کی قراءت نے باقی سب قراءتوں، بالخصوص الحسن البصری کی قراءت کی، جو بصرے میں رائج تھی، جگہ لے لی؛ دیکھیے Pellat: وہی کتاب؛ ص ۷۶؛ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس قراءت کی کوفے کے قاری الشُّعبہ (م ۱۹۳ھ/ ۸۰۸ء) نے بھی سفارش کی تھی؛ دیکھیے ابن الجزری، ص ۲۹۲، اور ابوعمرو کے شاگردوں نے جو بعد میں بہت مشہور ہوئے دوسروں کو اسی قراءت کی تعلیم دی؛ مثلاً یونس بن حبیب، الاصمعی اور دوسرے قرّا نے؛ دیکھیے ان کی فہرست کے لیے وہی کتاب، ص ۲۸۹۔ چوتھی صدی ہجری/ دسویں صدی عیسوی میں، جب ابن المجاہد کی اصطلاحات رائج ہوئیں تو ابوعمرو کے طریق کو بھی سات مستند قراءتوں میں جگہ مل گئی۔ ابن الجزری (م ۸۳۳ھ/ ۱۴۲۹ء) کے زمانے میں قراءت کا یہ طریق یمن، حجاز اور شام میں رائج و مسلّم تھا اور شام ہی کی ولایت میں اس کی بدولت پانچویں صدی ہجری/ گیارھویں صدی عیسوی میں ابن عامر کا طریق بالآخر کلیّۃً متروک ہو گیا، دیکھیے ابن الجزری، ص ۲۹۲۔ ابن المجاہد نے قراءت کے اس طریق پر ایک رسالہ بھی تصنیف کیا، دیکھیے الفہرست، ص ۳۱، س ۱۸؛ تاہم اسی طرح کی دوسری تالیفات اس دور سے پہلے بھی لکھی جا چکی تھیں؛ فہرست کے لیے دیکھیے وہی کتاب، ص ۲۸۔ ہمیں ایک اور خلاصے کا بھی علم ہے، یعنی عمر بن القاسم النشّار (م ۹۰۰ھ/ ۱۴۹۵ء)

کی تالیف القَطرُ المصری فی قراءۃ ابی عمرو بن العلاء البصری، جو برلن میں محفوظ ہے، دیکھیے Ahlwardt، شمارہ ۶۳۹۔ ہمارے پاس قرآن پاک کے اصول املا پر ایک مختصر سی تصنیف بھی موجود ہے، جو زبانی روایات پر مبنی ہے، دیکھیے O. Rescher، *WZKM*، ۱۹۱۲ء، ص ۹۴ (یہ مختصر تصنیف آیا صوفیا کے مجموعۂ متفرقات میں شامل ہے، شمارہ ۴۸۱۴)۔ بصرے میں لغت نویسی اور صرف ونحو کا جس طرح نشوونما ہوا اس میں ابوعمرو کے اثر کو اوّلین اہمیّت حاصل تھی؛ گو یہ نسبت اس اثر کے جو اس کے اصولِ قراءت سے مترتب ہوا، اس کا مشکل ہی سے پتا چلتا ہے۔ ابوعمرو کے شاگردوں میں حسبِ ذیل قابلِ ذکر ہیں: یونس بن حبیب، الاصمعی (دیکھیے السُّیوطی: مُزہر، ۲: ۳۲۳، ۳۲۹؛ الفہرست، ص ۴۲؛ ابن الانباری، ص ۳۰)، ابوعبیدہ (دیکھیے ابن خلّکان، ص ۳۸۷)، خلف الاحمر (دیکھیے السُّیوطی، ۲: ۲۷۸، ۴۰۳) اور دبستانِ کوفہ کا آئندہ بانی الرُّؤاسی (دیکھیے وہی مصنف، ۲: ۴۰۰)۔ بہت ممکن ہے ابوعمرو کی تحریک کے زیرِ اثر ان دنوں بصرے میں صرف ونحو اور مسائلِ لغت میں بدویوں سے معلومات حاصل کرنے کا طریق رواج پا چکا ہو (دیکھیے وہ حکایت جو اسی مصنف، ۲: ۲۷۸، ۳۰۴ نے نقل کی ہے)۔

اس کے شاگردوں، بالخصوص ابوعبیدہ اور الجاحظ ایسے فاضل اشخاص نے ابوعمرو کو تمام ایسی باتوں میں جن کا تعلق عربوں سے ہے سب سے بڑا عالم ٹھیرایا ہے، جس میں صحتِ روایتِ سماعی اور صحتِ بیان دونوں خوبیاں مجتمع تھیں (دیکھیے الجاحظ: البیان، ۱: ۲۵۵، ۲۵۶؛ قب ابوالطیب، جو مُزہر، ۲: ۳۹۹، میں اسی قسم کی رائے کا اظہار کرتا ہے)؛ لیکن اس ضمن میں ایک نازک مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے متعدد دیگر معاصرین کی طرح ابوعمرو بھی اشعارِ جاہلیت اور ''ایام العرب'' کے حالات جمع کرنے کا بے حد شائق تھا، دیکھیے Blachère: *Histoire de la littérature arabe*، پیرس ۱۹۵۲ء، ۱: ۱۰۱ بعد۔ ایک بیان کے مطابق، جو الجاحظ نے ابوعبیدہ سے نقل کیا ہے، البیان، ۱: ۲۵۶ (اور جسے ذرا مختلف شکل میں ابن الجزری، ص ۲۹۰؛ ابن خلّکان، ۱: ۳۸۶ اور الکُتُبی، ۱: ۱۶۴ نے دہرایا ہے)، ''ابوعمرو نے جو کتابیں ان عربوں سے قلمبند کیں جو اس قابل تھے کہ معلومات فراہم کر سکیں ان سے اس کے مکان کا ایک کمرہ بھر گیا تھا، لیکن بعد میں جب اس نے اپنے آپ کو قرآن [پاک] کی 'قراءت' کے لیے وقف کیا تو یہ سب کتابیں نذرِ آتش کر دیں''؛ لیکن اس شہادت میں، جس کی صحت یا عدم صحت کی تحقیق کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں، یہ نہیں بتایا گیا کہ ابوعمرو نے اس ذخیرۂ شاعری کو بھی تلف کر دیا جو اس نے خود جمع کیا تھا، جیسا کہ اکثر وثوق سے بیان کیا جاتا ہے۔ دراصل ایک بہت بڑی بات جس کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے، یہ ہے کہ اس اتلاف کے باوجود بشرطیکہ واقعۃً ایسا ہوا ہو، ابوعمرو وہ دستاویزی شواہد جو اس کے حافظے میں محفوظ تھے زبانی دوسروں تک پہنچاتا رہا۔ ایسی بہت سی حکایتیں موجود ہیں جن سے قدیم شاعری کے بارے میں اس کے علم کا پتا چلتا ہے، مثلاً دیکھیے الجاحظ: البیان، ۱: ۲۵۶ و ۲: ۱۲۱؛ السیرافی، ص ۳۰؛ ابن الانباری، ص ۳۱، ۳۴۔ پھر یہ بات بھی معلوم ہے کہ ایک موقع پر اس نے ایک جعلی شعر گھڑنے میں بھی تامّل نہ کیا، رک بہ السُّیوطی: مُزہر، ۲: ۴۱۵؛ مگر اس واقعے سے، جس کا اس نے خود اعتراف کیا ہے، بحیثیت ایک مستند راوی کے اس کے درجے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ عربی زبان کے لغت نویسوں کی صف میں اس کا مقام بڑا اہم رہا ہوگا، کیونکہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس فن میں وہ الخلیل [رک بآن] کا استاد تھا، دیکھیے وہی کتاب، ۲: ۲۹۸؛ نیز دیکھیے ابوعمرو سے لغوی استشہاد کے کثیر التعداد حوالے، وہی کتاب، ۲: ۷۳، ۱۱۱، ۲۹۱، ۳۶۰۔ علاوہ ازیں ایسے سب مصنفوں نے، جنھوں نے ادب پر قلم اٹھایا یا دواوینِ اشعار مرتب کیے؛ شعرا کے سلسلے میں ابوعمرو ہی کی رائے جگہ جگہ نقل کی ہے، مثلاً وہی کتاب، ۲: ۴۷۹، ۴۸۴، ۴۸۶۔

لہٰذا یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس دور میں، جبکہ بصرے میں الخلیل، الاصمعی اور ابوعبیدہ ایسے علما کا طبقہ نشوونما پا رہا تھا جو اس شہر کے مخصوص دبستان نحو ولسانیات میں استاد بن کر چمکنے والے تھے، ابوعمرو بن العلاء کی شخصیت ان کی علمی اور ذہنی سرگرمیوں پر چھائی ہوئی تھی۔

مآخذ: (۱) الجاحظ: البیان (السَّنْدُوبی)، قاہرہ ۱۳۵۱ھ، ۱: ۲۵۵، ۲۵۶ و مواضع کثیرہ؛ (۲) السیرافی: اخبار النحویین البصریین، (طبع Krenkow و مکرر در ابن الانباری: نزہۃ الالبّاء، ص ۲۹-۳۸؛ (۳) الفہرست، ص ۳۵، ۳۹، ۸۸ و مواضع کثیرہ، جس کو فلُوگل (Flügel): *Die grammatischen Schulen*، ص ۳۲ ببعد، نے بھی استعمال کیا ہے؛ (۴) ابن خلّکان، ص ۳۸۷، مکرر در الیافعی: مرآۃ الجنان، ۱: ۳۲۵ ببعد؛ (۵) الکُتُبی: فوات، ۱: ۱۶۴؛ (۶) ابن الجزری: غایۃ النہایۃ، طبع Bergsträsser، قاہرہ ۱۹۳۳ء، ۱: ۲۸۸-۲۹۲ و مواضع کثیرہ؛ (۷) السیوطی: بغیۃ الوعاۃ، ص ۳۶۷ و (۸) مُزہِر (البجاوی)، قاہرہ ۱۹۴۲ء، ۲: ۳۹۸ ببعد و مواضع کثیرہ؛ (۹) C. Pellat: *Le milieu basrien dans la formation de Ǧāḥiẓ*، پیرس ۱۹۵۳ء، ص ۷۶-۷۸؛ (۱۰) Brockelmann، ۱: ۹۹ و تکملہ، ۱: ۱۵۸؛ [(۱۱) شذرات الذہب، قاہرہ ۱۳۵۰ھ، ۱: ۲۳۷]۔

(R. BLACHÈRE)

ابوعِنان فارس: فاس کے بنومرین [رک بآن] خاندان کا گیارھواں ✱ تاجدار، جو ۷۲۹ھ/ ۱۳۲۹ء میں پیدا ہوا اور جس نے ۷۴۹ھ/ ۱۳۴۸-۱۳۴۹ء میں، جبکہ اس کا باپ ابوالحسین علی قیروان میں شکست کھا کر مراکش کی طرف فرار ہو رہا تھا؛ اپنی تخت نشینی کا اعلان کیا۔ ابن الاحمر لکھتا ہے کہ اس کا قد بہت بلند اور رنگ گورا تھا (اس کی ماں ایک عیسائی کنیز تھی)؛ اس کی داڑھی بھی لمبی تھی۔ بے دھڑک شاہسوار ہونے کے علاوہ ادب اور فقہ پر اس کی بڑی اچھی نظر تھی اور اپنے باپ کی طرح اسے بھی تعمیرات کا انتہائی شوق تھا؛ چنانچہ اس نے متعدد ایسی عمارتوں کی تکمیل کرائی جن کی ابتدا اس کے باپ نے کی تھی اور جن میں سے

فاس، مکناس (Meknes) اور الجزائر کے مدرسے بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ ان مدرسوں میں فاس کا مدرسہ بوعنانیہ جملہ مغربی مدارس میں سب سے زیادہ شاندار ہے۔

تاج و تخت پر غاصبانہ قبضے کے بعد اس نے خلفا کی طرح امیر المؤمنین کا لقب اختیار کیا، حالانکہ اس کا باپ اس سے محترز رہا۔ اپنے باپ کی طرح اس کا نصب العین بھی یہی تھا کہ بلادِ بربر کو از سرِ نو اپنی سلطنت میں شامل کرے جس میں اسے خاصی جلدی کامیابی بھی ہوگئی، گو محض چند سال کے لیے۔ ۱۳۵۲ء میں اس نے بنو عبدالواد سے تلمسان چھین لیا اور اسی سال بجایہ (Bougie) پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۷۵۷ھ/ ۱۳۵۶ء میں اس نے قسنطینہ (Constantine) کو مسخر کیا اور پھر تونس میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا، لیکن اس کے عرب حلیف یعنی قسنطینہ کے دواوِیدا اس کا ساتھ چھوڑ گئے، لہٰذا اسے مجبوراً فاس واپس آنا پڑا۔ اس سے چند دنوں بعد ہی وہ ۷۵۹ھ/ ۱۳۵۸ء میں بیمار ہوگیا اور اس کے وزیر الفُودُودی نے اسے گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور اس کے بیٹے کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا، اور اس طرح شاہی محل کی مسلسل سازشوں اور بنو مرین کے طویل دورِ انحطاط کا آغاز ہوگیا۔

مآخذ: (۱) ابن خلدون: *Hist. des Berbéres*، طبع (de Slane)، ۲: ۴۲۳-۴۴۲؛ ترجمہ، ۴: ۲۸۷-۳۱۹؛ (۲) ابن الاحمر: روضة النّسرين، طبع و ترجمہ از Bouali و G. Marçais، ص ۲۳-۲۵، ۷۹-۸۴؛ (۳) H. Terrasse: *Hist. du Maroc*، ۲: ۶۲-۶۶؛ (۴) M. van Berchem: *Titres califiens d' Occident*، در *JA*، ۱۹۰۷ء، ۱: ۲۴۵-۳۳۵؛ (۵) G. Marçais: *Manuel d'art musulman*، (۱۹۲۷ء)، ۲: ۴۹۴ ببعد، ۵۱۷ ببعد.

(G. MARÇAIS)

----

* **ابو عَون:** عبدالملک بن یزید الخراسانی، بنو عباس کا ایک سپہ سالار، جس نے ۲۵ رمضان ۱۲۹ھ/ ۹ جون ۷۴۷ء کو خراسان میں بغاوت پھوٹنے پر متعدّد بار بنو اُمیہ کے خلاف جنگ میں حصّہ لیا۔ شروع شروع میں وہ عباسی سرلشکر قَحطبہ بن شَبِیب کے ہم رکاب تھا، جس نے بعد میں اسے شہر زور بھیج دیا، جہاں ۲۰ ذوالحجہ ۱۳۱ھ/ ۱۰ اگست ۷۴۹ء کو اس نے مالک بن طریف کی معیت میں عثمان بن سفیان کو شکست دی۔ ابو عون ابھی موصل کے قرب و جوار ہی میں تھا کہ اموی خلیفہ مروان ثانی نے اس پر لشکر کشی کر دی۔ اس نے عبداللہ بن علی کی قیادتِ اعلٰی میں زاب اکبر کی جنگ (۱۱ جمادی الاُخرٰی ۱۳۲ھ/ ۲۵ جنوری ۷۵۰ء) میں بھی حصّہ لیا اور وہ مروان کے تعاقب اور دمشق کی تسخیر میں بھی اس کا شریک تھا۔ اس کے بعد عبداللہ خود تو فلسطین ہی میں ٹھیرا رہا، البتہ صالح بن علی کو ابو عون اور بعض دوسرے سردارانِ لشکر کے ساتھ [اموی] خلیفہ کے تعاقب میں مصر روانہ کر دیا، جہاں اسی سال ایک اور شکست کے بعد خلیفہ مروان گرفتار ہو کر قتل کر دیا گیا۔ پھر جب تک مزید احکام نہیں پہنچے، ابو عون مصر میں والی کی حیثیت سے مقیم رہا۔ ۱۵۹ھ/ ۷۷۵-۷۷۶ء میں خلیفہ المہدی نے اسے خراسان کا والی مقرر کیا، لیکن اگلے سال معزول کر دیا۔

مآخذ: (۱) الیعقوبی، الطبری، المسعودی: مُروج، اشاریات؛ (۲) Wellhausen: *Das arabische Reich und sein Sturz*، برلن ۱۹۰۲ء، ص ۳۴۱-۳۴۳؛ (۳) L. Caetani: *Chronographia Islamica*، روم ۱۹۲۱ء، تحت سنین متعلقہ.

(K. V. ZETTERSTÉEN)

----

* **ابو عیسٰی الاصفہانی:** ایک یہودی کذّاب، جس نے عبدالملک بن مروان اموی یا ایک دوسرے بیان کے مطابق مروان ثانی کے عہد میں مسیح ہونے کا دعوٰی کیا۔ اس نے جن عقائد کی تبلیغ کی ان میں نمایاں ترین عقیدہ یہ تھا کہ جو لوگ یہودی نہیں ہیں ان کے لیے اسلام اور مسیحیت کو اختیار کر لینا برحق ہے۔ وہ اگرچہ مسلمانوں کے خلاف ایک لڑائی میں مارا گیا، لیکن اس کا فرقہ، جو عیسویہ کہلاتا تھا، دسویں صدی عیسوی تک باقی رہا۔

مآخذ: (۱) البیرونی: الآثار الباقية، ص ۱۵؛ (۲) ابن حزم: فِصَل، ۱: ۱۱۴-۱۱۵؛ (۳) الشہرستانی، ص ۱۶۸؛ (۴) المقریزی: خِطَط، ۲: ۴۷۸-۴۷۹ (= S. de Sacy: *Chrest arabe*، طبع ثانی، ۱: ۱۱۶)؛ (۵) H. Grätz: *Gesch. d. jüd. Volkes*، طبع چہارم، ۵: ۱۷۳ و حاشیہ ۱۷ (از A. Harkavy)؛ (۶) *Encyclopaedia Judaica*، بذیلِ مادّۂ ابو عیسٰی.

(S. M. STERN)

----

* **ابو عیسٰی:** محمد بن ہارون الورّاق جو پہلے معتزلی تھا اور بعد میں اس کا شمار اسلام کے بڑے بڑے ملاحدہ میں ہونے لگا۔ بعینہٖ یونہیں اس کے دوست اور شاگرد ابن الراوندی [رک بآں] کی بھی قلبِ ماہیت ہوئی تھی۔ المسعودی (۷: ۲۳۶) نے ابو عیسٰی کی تاریخ وفات ۲۴۷ھ/ ۸۶۱ء بیان کی ہے، لیکن اگر یہ سچ ہے کہ ابن الراوندی کا تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے اختتام کے قریب انتقال ہوا (دیکھیے Kraus، ص ۳۷۹)، تو یہ تاریخ بڑی قبل از وقت معلوم ہوتی ہے؛ البتہ اگر یہ طے ہو جائے کہ الشہرستانی، ص ۱۹۸؛ کی اس عبارت میں جس میں ۲۷۱ھ کی تاریخ مندرج ہے، ابو عیسٰی ہی سے ایک اقتباس کا سلسلہ چل رہا ہے، تو پھر اس مسئلے کا کچھ فیصلہ ہو سکتا ہے۔

ابو عیسٰی پر مانی مذہب کی طرفداری کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ اس کی حمایت میں المرتضٰی: الشافی، ص ۱۳، کی یہ توجیہ کہ ابو عیسٰی کی تصانیف المشرقی اور النوح علی البهائم مانیوں نے جعلسازی سے کام لیتے ہوئے اس سے منسوب کر دیں، یقینًا قابلِ اعتنا نہیں؛ لیکن دوسری طرف یہ بات بھی زیادہ قرینِ قیاس نہیں ہے کہ ابو عیسٰی باقاعدہ طور پر مانوی مذہب کا پیرو تھا۔ اغلب یہ ہے کہ وہ ''ایک آزاد خیال

انسان‘‘ تھا (L. Massignon)۔ وہ دلچسپ اقتباسات جن سے رائج الوقت مذہبی عقائد پر اس کے اندازِ تنقید کا پتا چلتا ہے اور جو اس کی کتاب الغریب المشرقی (یعنی ’’مشرق کا اجنبی‘‘) سے ماخوذ ہیں (الفہرست، ص ۱۷۷، اور الطوسی، ص ۹۹، میں اس کا پورا نام یونہیں مذکور ہے: ’’مشرق کا ایک اجنبی‘‘ ظاہر ہے الحاد و زندقہ کے نقیب کے طور پر پیش کیا گیا ہے) ابوحیّان التوحیدی کی الامتاع و المؤانسة، ۳: ۱۹۲، میں بھی موجود ہیں.

اس کی سب سے بڑی تصنیف کا موضوع بحث مذاہب اور مذہبی فرقے اور عنوان المقالات ہے، جو الاشعری (مقالات الاسلامیین، ص ۳۳، ۳۴، — ’’شیعہ‘‘؛ قب نیز اشاریہ ص ۳۷)، المسعودی (مروج، ۵: ۴۷۳ ببعد — ’’زیدیہ‘‘)، البغدادی (فِرَق، ص ۴۹، ۵۱)، البیرونی (الآثار الباقیة، ص ۲۷۷، ۲۸۴ — ’’یہودی فرقے، سامریّین‘‘ (Samaritans)، ابوالمعالی (بیان الادیان، طبع اقبال، ص ۱۰ — ’’جاہلی عربوں کا مذہب‘‘، جیسا کہ طابع نے ص ۵۴ ببعد پر اشارہ کیا ہے؛ اسی قبیل کی عبارتیں ابن ابی الحدید: شرح نہج البلاغة، ۱: ۳۹، ۴: ۳۷، ۴۳، میں بھی ملیں گی؛ ابن ابی الحدید نے بعض دوسری عبارتوں میں بھی ابو عیسٰی کے اقوال نقل کیے ہیں)، الشہرستانی (ص ۱۴۱، ۱۴۳ — ’’شیعہ‘‘؛ ص ۱۶۲، — ’’مزدک‘‘؛ ص ۱۸۸ — ’’مانی‘‘) ایسے مصنّفین کا اہم ماخذ ہے۔ ابوعیسٰی کے معتزلی مخالفین نے اس پر اشارۃً یہ الزام بھی لگایا ہے کہ اسے اپنی کتاب میں مانیوں کے دلائل کو نقل کرنے کا بڑا شوق تھا.

ابوعیسٰی نے شیعیوں کی موافقت میں بھی کتابیں لکھیں (الامامة؛ السقیفة، جس کا حوالہ المفید نے دیا ہے، قب اقبال: خاندان نوبختی، ص ۸۶) — اسی لیے شیعی مصنفین اس کی طرفداری کرتے ہیں.

عیسائیت کی تین شاخوں، کلیسائے قدیم (Orthodox)، یعقوبی (Jacobite) اور نسطوری (Nestorian)، پر یحیٰی بن عدی کی تردید میں اس کا ناقدانہ استدراک محفوظ ہے (قب A. Perier: *Yahya ben ʿAdi*، ص ۶۷، ۱۵۰ ببعد؛ L. Massignon: *Textes inédits concernant l'hist. de la mystique*، ص ۱۸۲ — ۱۸۵؛ A. Abel: *Abū ʿĪsâ al-Warrâq*، بروسلز ۱۹۴۹ء).

مآخذ: (۱) الخیاط: انتصار (نائبرگ)، ص ۶۷، ۱۴۶، ۱۵۰، ۱۵۲، ۱۵۵، اور حاشیہ ۲۰۵؛ (۲) المسعودی: مُروج، ۶: ۵۷ و ۷: ۲۳۶؛ (۳) الفہرست، ص ۳۳۸؛ (۴) الطوسی: الفہرست، ص ۵۸، ۷۲، ۸۹؛ (۵) النجاشی: رجال، ص ۴۷، ۲۶۳؛ (۶) Th. M. Houtsma، در *WZKM*، ۱۸۹۱ء، ص ۲۳۱؛ (۷) رٹّر (H. Ritter)، در *Isl.*، ۱۹۲۹ء، ص ۳۵ ببعد؛ (۸) عباس اقبال: خاندان نوبختی، تہران ۱۹۳۳ء، ص ۸۴ ببعد؛ (۹) P. Kraus، در *RSO*، ۱۹۳۴ء، ص ۳۷۴؛ (۱۰) G. Vajda، در *RSO*، ۱۹۳۷ء، ص ۱۶۶ — ۱۹۷؛ (۱۱) J. Schacht، در *Studia Islamica*، ج ۱، ۱۹۵۳ء، ص ۴۱ — ۴۲.

(S. M. Stern)

ابوالعَیْناء: محمد بن القاسم بن خلّاد بن یاسر بن سلیمان الہاشمی، عربی زبان کا ایک ادیب اور شاعر، ۱۹۰ھ/ ۸۰۵ء میں الاہواز میں پیدا ہوا (اس کا خاندان الیمامہ سے آیا تھا) اور بصرے میں پروان چڑھا، جہاں اس نے مشہور و معروف ماہرین لسانیات ابوعبیدہ الاصمعی، ابوزید الانصاری وغیرھُم سے تعلیم و تربیت پائی۔ وہ اپنے معاصرین میں بحیثیت ایک ماہر زبان دان ہی کے نہیں بلکہ اپنی حاضر جوابی کی وجہ سے بھی مشہور تھا۔ ابن ابی طاہر نے ایک مخصوص تالیف بعنوان اخبار ابی العَیْناء میں اس کے متعلق بہت سی حکایات جمع کر دی تھیں، جن میں سے اکثر الأغانی میں موجود ہیں۔ اصل کتاب اور ابوالعیناء کی نظموں کا مجموعہ محفوظ نہیں رہا۔ [ابن الندیم اس کتاب کو دیکھ چکا تھا جس کا نسخہ ابوعلی ابن مقلہ نے تیار کیا تھا۔] وہ چالیس سال کی عمر میں نابینا ہوگیا تھا، اس کے بعد بغداد چلا گیا، پھر بصرے میں واپس آ گیا اور وہیں ۲۸۲ھ یا ۲۸۳ھ/ ۸۹۶ء میں فوت ہوا.

مآخذ: (۱) الفہرست، ص ۱۲۵؛ (۲) ابن خلّکان، شمارہ ۶۱۵.

(براکلمان C. Brockelmann)

ابوالغازی بہادر خان: خیوا کا حاکم اور چغتائی مؤرّخ، غالباً ۱۶ ربیع الاوّل ۱۰۱۲ھ/ ۲۴ اگست ۱۶۰۳ء کو پیدا ہوا۔ وہ شیبانی ازبکوں کے خاندان میں سے عرب محمد خاں کا بیٹا تھا اور اس کی ماں بھی اسی خاندان کی ایک شہزادی تھی۔ ابوالغازی نے اپنی جوانی کے دن اُرگنج میں گزارے (جوان دنوں دریاے جیحون کا رخ تبدیل ہوجانے سے بڑی حد تک غیر آباد ہوگیا تھا)، جس کا حاکم (خان) اس کا باپ تھا۔ ۱۰۴۹ھ/ ۱۶۱۹ء میں اس کے باپ نے اسے کاث میں اپنا نائب مقرر کیا، لیکن کچھ دنوں کے بعد اپنے دو بیٹوں کی سرکشی کے استیصال میں اس کی جان جاتی رہی تو ابوالغازی کو مجبوراً سمرقند میں امام قلی خاں کے یہاں پناہ لینا پڑی اور پھر ایک طویل جنگ کے بعد وہ اور اس کا بھائی اسفندیار باہم مل کر بعض ترکمانی قبیلوں کی مدد سے اپنے سرکش بھائیوں کو حکومت سے برطرف کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ۱۰۳۳ھ/ ۱۶۲۳ء میں وہ اُرگنج میں اپنے بھائی کا نائب بنا، لیکن بعد میں بعض ترکمانی قبائل سے نزاع و جدال کے باعث اپنے بھائی سے لڑ پڑا اور ۱۰۳۶ھ/ ۱۶۲۶ء میں ناچار تاشقند بھاگ گیا، جہاں اس نے دو برس قازقوں (Kazakhs) کے دربار میں گزارے۔ خیوا کا تخت و تاج حاصل کرنے کی ایک مزید کوشش کے بعد اس نے بحالتِ جلاوطنی دس سال (۱۰۳۹ھ/ ۱۶۲۹ء سے) صفویوں کے دربار میں گزارے۔ اس زمانے میں اس کا قیام زیادہ تر اصفہان میں رہا، جہاں بیٹھ کر اس نے ان معلومات کو فارسی مآخذ کے ذریعے اور زیادہ وسیع کیا جو اُس نے قازقوں کے دربار میں اپنی قوم کے ماضی کے متعلق حاصل کی تھیں۔ اس کے ترجموں کو دیکھیے تو ماننا پڑتا ہے کہ اسے عربی اور فارسی میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ پھر جب ایران سے فرار ہوکر وہ قلمقوں (Kalmüks) کے دربار میں پہنچا تو وہاں مغولی روایات کی فراہمی سے اس نے اپنی معلومات کو اور زیادہ

مکمل کرلیا.

۱۰۵۲ھ/ ۱۶۴۲ء میں اسفندیار کے انتقال کے بعد ۱۰۵۴ھ/ ۱۶۴۴-۱۶۴۵ء میں ابوالغازی آخرکار خیوا کا فرمانروا بن سکا۔ یہاں کے خان کی حیثیت سے اس نے بشمولِ روس سارے ہمسایہ ممالک سے سفارتی تعلقات قائم رکھے، گو ان تعلقات میں بار بار کی جنگوں سے خلل بھی آتا رہا۔ ترکمان قبائل کے خلاف ۱۰۵۴ھ/ ۱۶۴۴ء، ۱۰۵۶ھ/ ۱۶۴۶ء، ۱۰۵۸ھ/ ۱۶۴۸ء، ۱۰۶۲ھ/ ۱۶۵۱ء، ۱۰۶۴ھ/ ۱۶۵۳ء کی مہموں سے بالآخر یہ نتیجہ مرتّب ہوا کہ قرہ قوم اور مُنغیشلاق کے بعض قبائل نے بھی اس کی اطاعت قبول کرلی۔ ۱۰۵۹ھ/ ۱۶۴۹ء، ۱۰۶۴ھ/ ۱۶۵۳ء، اور ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۶ء میں بھی وہ قلمقوں کے خلاف صف آرا ہوا اور پھر ۱۰۶۶ھ/ ۱۶۵۵ء اور ۱۰۷۳ھ/ ۱۶۶۲ء میں بخارا کے خلاف۔ کبھی کبھی وہ ان روسی قافلوں کو بھی، جو اس کے علاقے سے گزرتے تھے، لوٹ لینے کی اجازت دے دیتا تھا، مگر پھر کسی اور بنا پر نہیں تو اپنے ملک کے تجارتی مفاد ہی کے پیش نظر اس قسم کی لوٹ مار کا ہرجانہ بھی ادا کردیتا۔ باقی سب اُمور میں وہ اپنے ملک کی بہبود کے ساتھ ساتھ وہاں علم و فضل کی ترقی کے لیے بھی کوشاں رہا۔ اس کی عسکری صلاحیتیں، جو اس نے اپنے آپ سے منسوب کی ہیں، غیر جانب دار مآخذ کی رو سے معمولی درجے کی تھیں۔ اپنے بیٹے کے حق میں دستبردار ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد وہ ۱۰۷۴ھ/ ۱۶۶۳ء میں فوت ہوگیا.

ابوالغازی کی تصانیف میں سے مندرجۂ ذیل محفوظ ہیں:

۱۔ شِجرۂ تراکِمہ، تصنیف ۱۰۷۰ھ/ ۱۶۵۹ء، یہ کتاب زیادہ تر رشید الدین کی تاریخ اور اوغوز نامہ سے ماخوذ ہے، مگر اس میں بعض ایسے اضافے بھی موجود ہیں جن کی اپنی ایک مستقل قدر و قیمت ہے۔ چغتائی متن کا عکسی (facsimile) ایڈیشن ۱۹۳۷ء میں تورکِ دل کورومو نے انقرہ سے شائع کیا۔ کتاب کا ایک روسی ترجمہ بھی ہے، جسے ۱۸۹۲ء میں تومانسکی (A. Tumanski) نے اشکاباد سے شائع کیا.

۲۔ شَجَراتُ الاتراک (شجرۂ تورک)، جسے ابوالغازی مرتے وقت ناتمام چھوڑ گیا۔ ۱۰۵۴ھ/ ۱۶۴۴ء سے اگلے حصّے کی تکمیل اس کے بیٹے ابوالظّفر اَنُوشہ محمد بہادر نے ۱۰۷۶ھ/ ۱۶۶۵ء میں کی۔ یہ تالیف پندرھویں صدی عیسوی کے وسط سے شیبانیوں کی تاریخ پر مشتمل ہے اور ۱۰۷۴ھ/ ۱۶۶۳ء تک اس خاندان کی تاریخ کے لیے سب سے اہم ماخذ، جسے زیادہ تر حافظے کی مدد سے لکھا گیا اور مآخذ سے براہِ راست استفادہ بھی نہیں ہوا؛ لہٰذا ابتدائی ادوار کا بیان ناقص رہ گیا ہے اور اس کی تاریخیں بھی عموماً غلط ہیں۔ دیباچے کی نوعیت، جس میں چنگیز خان اور اس کے اوّلین جانشینوں کے متعلق روایات درج ہیں، تقریباً اساطیری ہے۔ یہ تصنیف چونکہ بڑے قدیم زمانے میں یورپ پہنچی تھی، لہٰذا مغلوں کی تاریخ پر اہم ترین سند تصور ہوتی رہی۔ سویڈن کے دو باشندے Tabbert von Strahlenberg اور Schenström جب Poltava کی جنگ (۱۷۰۹ء) میں اسیر ہوکر سائبیریا پہنچے تو انھیں اس کتاب کا علم ہوا اور ایک امام کے روسی ترجمے کی مدد سے انھوں نے اس کا جرمن میں ترجمہ کیا۔ v. Bentinck کا فرانسیسی ایڈیشن *Histoire généalogique des Tartars*، طبع لائڈن ۱۸۲۶ء، اسی ترجمے پر مبنی ہے۔ اس کتاب کا روسی ایڈیشن بھی تھوڑے ہی دنوں میں تیار ہوگیا۔ ۱۷۸۰ء میں انگریزی ایڈیشن شائع ہوا۔ ۱۷۱۶-۱۷۱۷ء کے اصل جرمن ایڈیشن کو ۱۷۸۰ء میں Messerschmid نے گوٹنجن (Göttingen) سے بعنوان *Geschlechtsbuch der mungalisch-mogulischen Chanen*، شائع کیا۔ آخر میں Ch. M. v. Frähn نے ۱۸۲۵ء میں قازان سے اس کا ایک لاطینی ترجمہ شائع کیا۔ بایں ہمہ اس کے متن سے ناقدانہ استفادہ اس وقت ممکن ہوا جب J. J. P. Baron Desmaisons نے چغتائی متن مع فرانسیسی ترجمہ، بعنوان *Histoire des Mogols et des Tatars*، شائع کیا، لیکن یہ تالیف بجائے خود جدید تر مطالعے کی روشنی میں نظرِ ثانی کی محتاج ہے.

مآخذ: (۱) Desmaisons، ۲: ۱۲-۳ ببعد؛ (۲) A. Strindberg: *Notice sur le MS. de la premiére traduction de la chronique d' Abulghasi- Behader*، سٹاک ہوم (Stockholm) ۱۸۸۹ء؛ (۳) I. N. Berezin: *Biblioteka vostočnykh istorikov*، ج ۳ (روسی ترجمہ از G. Sablukov)، ۱۸۵۲ء؛ (۴) احمد زکی ولیدی طوغان، در آ ترکی، ۴: ۷۹-۸۳.

(B. SPULER)

ابو غانم بشر بن غانم الخراسانی: دوسری صدی ہجری/ آٹھویں صدی عیسوی کے آخر اور تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی کے شروع کا ایک اِباضی فقیہ، جس کا وطن خراسان تھا اور جو رُستمی امام عبدالوہاب (۱۶۸ھ/ ۷۸۴-۲۰۸ھ/ ۸۲۳ء) کی خدمت میں اپنی کتاب المدوّنۃ پیش کرنے کی غرض سے تاہرت جاتے ہوئے راستے میں جبل نفوسہ کے اباضی شیخ ابوحَفص عُمَروس بن فتح کے پاس ٹھیرا تو شیخ موصوف نے اس کی ایک نقل المغرب میں محفوظ کرلی جو اباضی کتب کی ایک گراں قدر خدمت تھی.

ابوغانم کی المدوّنۃ عام اصولِ فقہ پر اباضیہ کا قدیم ترین رسالہ ہے، جسے ابوعبیدہ مسلم التمیمی (وفات بعہد المنصور ۱۳۶ھ/ ۷۵۴ء-۱۵۸ھ/ ۷۷۵ء، قب مادّۂ اباضیہ) کی ان تعلیمات کے مطابق ترتیب دیا گیا، جو اس کے شاگردوں سے منقول ہوئیں۔ المدوّنۃ کا وہ مسودہ، جس کی نقل عمروس بن فتح نے تیار کی، بارہ حصوں پر مشتمل تھا، ابوالقاسم البرّادی (آٹھویں صدی ہجری/ چودھویں صدی عیسوی) نے اباضی کتب کی جو فہرست مرتب کی ہے اس میں ان حصّوں کے عنوانات بھی درج ہیں۔ یہ کتاب بڑی نایاب ہے اور S. Smogorzewski

کی اطلاع کے مطابق اس کا ایک واحد مخطوطہ مزاب (Guerrara) کے ایک اباضی شیخ کے پاس موجود تھا۔ البرّادی کی فہرست میں ابو غانم کی فقہ پر ایک اور کتاب کا نام بھی مذکور ہے۔

مآخذ: (۱) الشمّاخی: السِیَر، قاہرہ ۱۳۰۱ھ، ص ۲۲۸؛ (۲) السالمی: اللَّمْعَة، اباضیہ کی چھے کتابوں کے مجموعے میں، الجزائر ۱۳۲۶ھ، ص ۱۸۴، ۱۹۷-۱۹۸؛ (۳) A. de Motylinsky در *Bull. Corr. Afr.*، ۱۸۸۵ء، ص ۱۸، شمارہ ۱۲ و ۱۴.

(T. LEWICK)

---

* **ابوالفتح:** رک بہ ابن العمید، ابن الفرات، المظفّر.

---

* **ابوالفتوح حسن:** رک بہ مکّہ (MECCA) [در آ، لائڈن، طبع دوم].

---

* **ابوالفتوح الرّازی:** ایرانی مفسّرِ قرآن، اس کا زمانہ قیاسًا ۴۸۰ھ/ ۱۰۸۷ء اور ۵۲۵ھ/ ۱۱۳۱ء کے درمیان ہے اور اس کے تلامذہ میں شیعہ مذہب کے مشہور عالم دین ابن شہر آشوب اور ابن بابُویہ [رک بآن] شامل ہیں۔ ابن بابُویہ نے اپنے استاد کو ایک عالم، واعظ، مفسّر اور بڑے پارسا انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ الشُّشتری (مجالس المؤمنین) کا بیان ہے کہ ابوالفتوح الزمخشری کا معاصر تھا اور وہ اس کا ذکر بطور اُس کے استاد کے کرتا ہے، جس سے ابوالفتوح کی تفسیر کے معتزلی رجحانات کی توجیہ بھی ہوسکتی ہے۔ محمد قزوینی نے ثابت کیا ہے کہ تفسیر ابوالفتوح کا زمانہ ۵۱۰ھ/ ۱۱۱۶ء سے مقدم نہیں ہوسکتا۔ ابوالفتوح کا دعوٰی تھا کہ وہ نافع[رض] بن بُدیل، صحابیِ رسول اللہ [صلی اللہ علیہ وسلم]، کی اولاد میں سے ہے۔ اس کی روض الجِنَان و رَوْح الجِنَان (تہران ۱۹۰۵ء، در دو جلد؛ ۱۹۳۷ء، در سہ جلد) ان تفاسیر میں جو ایران کے شیعہ علما نے فارسی میں لکھیں، اگر قدیم ترین نہیں تو قدیم ترین میں سے ایک ضرور ہے۔ روض الجنان کے دیباچے میں اس نے لکھا ہے کہ اس نے فارسی زبان کو ترجیح دی تو اس لیے کہ عربی جاننے والے بہت کم ہیں۔ تفسیر میں، جس کے شروع میں تفسیر قرآن پر ایک مقدمہ بھی موجود ہے، نحو، بیان و بدیع، شرعی اور مذہبی احکام کے علاوہ اُن احادیث سے بھی بحث کی گئی ہے جو آیات کی شان نزول سے متعلق ہیں اور اس میں تفسیر طبری کا اثر صاف نمایاں ہے۔ بعد کی تفاسیر کی بہ نسبت اس میں شیعی رجحانات اتنے زیادہ واضح نہیں۔ علاوہ اس تفسیر کے روایت ہے کہ ابوالفتوح نے محمد بن سلامہ القُضاعی کی شہاب الاخبار کی بھی شرح کی (براکلمان (Brockelmann)، ۱: ۳۴۳).

مآخذ: (۱) سٹوری (Storey)، حصہ ۱، عدد ۶؛ (۲) ماسہ (H. Massé)، در *Mélanges W. Marçais*، پیرس ۱۹۵۰ء، ص ۴۴۳ ببعد.

(H. MASSÉ)

---

* **ابوالفداء:** اسمٰعیل (الافضل) علی بن (المظفّر) محمود بن (المنصور) محمد بن تقی الدین عمر بن شاہنشاہ بن ایوب، الملک المؤیّد عماد الدّین، شامی امیر، مؤرخ اور جغرافیہ دان، آل ایوب [رک بآن] میں سے تھا۔ وہ جمادی الاولٰی ۶۷۲ھ/ نومبر ۱۲۷۳ء میں دمشق میں پیدا ہوا۔ بارہ سال کی عمر میں وہ اپنے باپ اور ابن عم الملک المظفّر محمود ثانی امیر حماۃ کے ساتھ مَرْقَب (Margat) کے محاصرے اور تسخیر میں شریک تھا (۶۸۴ھ/ ۱۲۸۵ء)۔ صلیبیوں کے خلاف اس نے بعد کے معرکوں میں بھی شرکت کی۔ ۶۹۸ھ/ ۱۲۹۹ء میں جب حماۃ کی ایوبی ریاست ختم کردی گئی تو ابوالفداء نے اس ریاست کے مملوک عمّال کی ملازمت اختیار کرلی اور اس کے ساتھ ہی مملوک بادشاہ الملک الناصر [رک بآن] محمد بن قلاؤن کی خوشنودی حاصل کرنے میں بھی ساعی رہا۔ حماۃ کی حکومت کے حصول میں متعدد ناکام کوششوں کے بعد بالآخر ۱۸ جمادی الاولٰی ۷۱۰ھ/ ۱۴ اکتوبر ۱۳۱۰ء کو ''امیر العرب'' مُہنّا، شیخِ آلِ فضل، کے کہنے پر اسے حماۃ کا عامل مقرر کیا گیا اور پھر ۷۱۲ھ/ ۱۳۱۲ء میں اس کی یہ حکومت تاحینِ حیات ایک ریاست میں تبدیل کردی گئی؛ لیکن اس واقعے کے دو سال بعد اُسے دوسرے والیوں کے ساتھ براہِ راست نائب السلطنت شام تنکِز (Tankiz) کے ماتحت کردیا گیا، جس سے اس کے تعلقات کچھ دنوں تک کشیدہ رہے۔ آگے چل کر، بالخصوص ان موقعوں پر جب مصر کا سفر درپیش ہوا، بسبب فیاضانہ داد و دہش اور عطیات کے اس نے اپنی حیثیت مستحکم کرلی۔ ۷۱۹ھ/ ۱۳۱۹-۱۳۲۰ء میں اس نے سلطان محمد کی معیت میں حج بیت اللہ کی غرض سے مکۂ [معظّمہ] کا سفر کیا۔ جب یہ دونوں قاہرہ واپس آئے تو ۱۷ محرم ۷۲۰ھ/ ۲۸ فروری ۱۳۲۰ء کو اسے نشاناتِ سلطنت اور الملک المؤیّد کا لقب عطا کیا گیا، نیز شام کے سب حاکموں سے اس کا درجہ مقدم قرار پایا؛ چنانچہ اپنی تاریخِ وفات، یعنی ۲۳ محرم ۷۳۲ھ/ ۲۷ اکتوبر ۱۳۳۱ء تک جو حماۃ ہی میں واقع ہوئی، ابوالفداء نے اس شہرت کو برقرار رکھا جو اُسے ایک بہت بڑے مُربّیِ علم اور ادیب کی حیثیت سے حاصل تھی۔ اُس پر سلطان کی عنایات کا سلسلہ بھی تادمِ آخر جاری رہا۔ تنکِز (Tankiz) کی حمایت سے اس کا بیٹا الافضل محمد اس کا جانشین نامزد ہوا اور اُسے بھی نشاناتِ سلطنت مرحمت ہوئے۔ (ابوالفداء کے مزار کے لیے قب *ZDMG*، ۶۲: ۶۵۷-۶۶۰ و ۶۳: ۳۲۹-۳۳۰، ۸۵۳ ببعد؛ *Bull. d' Etudes Orient.*، ۱۹۳۱ء، ص ۱۴۹).

عربی کتبِ سیر میں ابوالفداء کے حالات میں اس کے منظوم کلام کے نمونے بھی دیے گئے ہیں، جن میں الماوردی [رک بآن] کی فقہی تصنیف الحاوی کی منظوم شکل بھی شامل ہے۔ دینی اور ادبی مباحث پر اس کی متعدد تصانیف تقریبًا سب کی سب تلف ہوچکی ہیں، لہٰذا اس کی شہرت کا دار و مدار دو تصنیفوں پر ہے، جن کا مواد زیادہ تر اَوروں سے لیا گیا ہے، گو اس نے انھیں از سرِ نو ترتیب دیا اور اُن میں اضافے بھی کیے۔ اس کی مختصر تاریخ البشر، جو ایک عمومی تاریخ ہے، عہدِ قبل از اسلام اور ۷۲۹ھ/ ۱۳۲۹ء تک کی اسلامی تاریخ پر مشتمل ہے۔

اس کے ابتدائی حصّے زیادہ تر ابن الاثیر سے ماخوذ ہیں۔ اس تاریخ کو اپنے زمانے میں جو مقبولیت حاصل تھی اس کا اندازہ ان ذیلوں سے ہوسکتا ہے جن کا اضافہ آگے چل کر ابن الوَرْدی [رک بآن]، ابن حبیب الدمشقی اور ابن الشِّحْنہ الحلبی [رک بآن] نے کیا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں یہ کتاب J. Gagnier کی طبع *De vita...Mohammedis*، (اوکسفرڈ ۱۷۲۳ء) اور J. J. Reiske و J. G. Chr. Adler کی طبع *Annales Moslemici*، (لائپزگ ۱۷۵۴ء وکوپن ہیگن ۱۷۸۹ - ۱۷۹۴ء) کے توسط سے خاور شناسی کا سب سے اہم مآخذ تھی۔ اس کا مکمل متن پہلی بار استانبول سے دو جلدوں میں ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ - ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا۔

تقویم البلدان وصفی جغرافیے کی کتاب ہے، جس میں طبیعی اور ریاضی معلومات کا اضافہ جدولوں کی شکل میں کیا گیا ہے (جو زیادہ تر بطلمیوس کے عربی ترجمے، دسویں صدی کی کتاب الاَطْوال، البیرونی اور ابن سعید المغربی [رک بآنہا] سے ماخوذ ہے اور اس میں ان مآخذ کے اختلافات کا ذکر کردیا گیا ہے)۔ یہ کتاب ۷۲۱ھ/ ۱۳۲۱ء میں اِتمام کو پہنچی اور بڑی حد تک اس نے پہلے کی سب جغرافیائی تصنیفات کی جگہ لے لی۔

القلقشندی [رک بآن] نے اس کتاب کا بڑی کثرت سے حوالہ دیا ہے۔ بعد میں اس کے متعدد مُلخّص بھی تیار کیے گئے، جن میں محمد بن علی سپاہی زادہ (م ۹۹۷ھ/ ۱۵۸۹ء) کا ترکی ملخّص بھی شامل ہے۔ یورپ کے علما نے اس کے بعض منفرد اجزا کی طبع اور ترجمے کا کام سترھویں صدی میں شروع کیا (John Greaves، لنڈن ۱۶۵۰ء؛ J. B. Koehler، لائپزگ ۱۷۶۶ء؛ وغیرہ)۔ J. T. Reinaud اور MacGuckin de Slane، نے مل کر پوری کتاب کو طبع کیا (پیرس ۱۸۴۰ء)؛ اور Reinaud (پیرس ۱۸۴۸ء) اور Stanislas Guyard (پیرس ۱۸۸۳ء) نے اس کا ترجمہ کیا۔ اس ترجمے کی پہلی جلد ایک بلند پایہ تبصرے، بعنوان *Introduction générale á la géographie des Orientaux*، پر مشتمل ہے۔ ابوالفداء کی اس جغرافیائی تصنیف کے متعلق علما کی رائیں ایک دوسرے سے بڑی مختلف ہیں۔ اگر ایک طرف اسے ''پہلے کے مآخذ پر مبنی ایک ناقص سی تالیف'' ٹھیرایا گیا ہے (I. H. Kramers، در *Legacy of Islam*، اوکسفرڈ ۱۹۳۱ء، ص ۹۱؛ قب C. E. Dubler: *Abū Ḥāmid el Granadino*، میڈرڈ ۱۹۵۳ء، ص ۱۸۲) تو دوسری جانب سارٹن (G. Sarton) (دیکھیے مآخذ) کی رائے ہے کہ ابوالفداء ''اپنے زمانے کا سب سے بڑا جغرافیہ دان'' تھا، نیز رک بہ مادّۂ جغرافیہ۔

مآخذ: (۱) خودنوشت سیرت (مقتبس از [مختصر تاریخ البشر])، ترجمۂ دیسلان (de Slane)، در *Recueil des Historiens des Croisades, Orientaux*، ۱: ۱۶۶ - ۱۸۶ (دیکھیے نیز *Appendice*، ص ۷۴۴ - ۷۵۱)؛ (۲) الذہبی: تاریخ الاسلام، تکملہ، مخطوطۂ لائڈن، ورق ۷۶۵؛ (۳) الکُتبی: فوات (قاہرہ ۱۹۵۱ء)، ۱: ۷۰؛ (۴) ابن حجر: الدُّرر الکامنۃ، حیدرآباد ۱۳۴۸ھ، ۱: ۳۷۱ - ۳۷۳؛ (۵) السُّبکی: طبقات الشافعیۃ، ۶: ۸۴ - ۸۵؛ (۶) ابن تغری بِردی، مطبوعۂ قاہرہ، ۹: ۱۶، ۲۳، ۲۴، ۳۹، ۵۸ - ۶۲، ۷۴، ۹۳ - ۱۰۰، ۲۹۲ - ۲۹۴ (بیشتر منقول در المقریزی: سلوک، قاہرہ ۱۹۴۱ء، ۱: ۸۷، ۸۹، ۹۰، ۱۳۷، ۱۴۲، ۱۶۶، ۱۹۶، ۲۰۲، ۲۳۸)؛ (۷) وہی مصنف: *Les Biographies du Manhal Ṣāfī* (طبع G. Wiet، قاہرہ ۱۹۳۲ء)، شمارہ ۴۳۲؛ (۸) وسٹنفلڈ (F. Wüstenfeld): *Geschichtsschreiber der Araber*، ۱۸۸۱ء، ص ۱۶۱ - ۱۶۶؛ (۹) Brockelmann، ۲: ۴۴ - ۴۶ و تکملہ، ۲: ۴۴؛ (۱۰) M. Hartmann: *Das Muwaššah*، ویمر (Weimar) ۱۸۹۶ء، ص ۱۰؛ (۱۱) Carra de Vaux: *Les Penseurs de l' lslam*، مطبوعۂ پیرس، ۱: ۱۳۹ - ۱۴۶؛ (۱۲) سارٹن (G. Sarton): *Introduction to the History of Science*، بالٹی مور ۱۹۴۷ء، ص ۲۰۰، ۳۰۸، ۷۹۳ - ۷۹۹؛ (۱۳) احمد آتش، در *Oriens*، ۱۹۵۲ء، ص ۴۴.

(H. A. R. GIBB گب)

ابوفُدَیک: عبداللہ بن ثَور، بنوقیس بن ثَعْلَبہ کا ایک خارجی شورش پسند، جو * ابتدا میں نافع بن الازرق [رک بآن] کا رفیق تھا اور جسے چھوڑ کر وہ نَجْدہ بن عامر [رک بآن] سے جاملا، گو بعد میں چند نظریاتی اختلافات کی بنا پر، جو اُس کے اور نَجْدہ کے درمیان رونما ہوے، اس نے اسے قتل کرنے میں بھی تأمّل نہیں کیا۔ اس کے بعد وہ بحرین پر مسلّط ہوگیا (۷۲ھ/ ۶۹۱ء) حتّٰی کہ عبدالملک نے جب اُس کے خلاف بصرے سے ایک فوج بھیجی تو اس نے اس کا مقابلہ کامیابی سے کیا؛ لیکن اس کے کچھ دنوں بعد ۷۳ھ/ ۶۹۳ء میں دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک دوسری فوج بصرے سے عمر بن عُبید اللہ ابن مَعْمَر کی قیادت میں بھیجی گئی جو اُسے شکست دینے اور قتل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

مآخذ: (۱) العَجّاج، قصیدہ ۱۱؛ (۲) المبرّد: الکامل، ص ۶۶۲؛ (۳) البلاذری: انساب، ۵: ۳۴۶ و ۱۱ (= *Anonyme arab. Chronik*، طبع اہلوارٹ (Ahlwardt): ۱۴۳ ببعد؛ (۴) الطبری، ۱: ۸۲۹، ۸۵۲ ببعد؛ (۵) الاشعری، مقالات، ص ۱۰۱؛ (۶) الشہرستانی، (برحاشیۂ ابن حزم: الفِصل)، ۱: ۱۶۲ - ۱۶۷؛ (۷) R. Brünnow: *Die Charidschiten*، ص ۴۷ ببعد؛ (۸) J. Wellhausen: *Die religiös-politischen Opposition pareien*، ص ۳۲ نیز رک بہ مادّہ خوارج۔

(M. TH. HOUTSMA ہوتسما)

ابوفِراس الحَمْدانی: الحارث بن ابی الاعلٰی سعید بن حَمدان التغلبی کا شاعرانہ * نام؛ عرب شاعر، جو ۳۲۰ھ/ ۹۳۲ء میں غالباً عراق میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ

سعید، جوخود بھی شاعر تھا، موصل پر قبضہ کرنے کی کوشش میں اپنے بھتیجے ناصر الدولہ حسن کے ہاتھوں ۳۲۳ھ/ ۹۳۵ء میں قتل ہوگیا۔ ۳۳۳ھ/۹۴۴ء میں جب شاعر کے چچازاد بھائی سیف الدولہ نے حلب پر قبضہ کیا تو ابوفراس کی ماں، جو ایک یونانی کنیز اور امّ ولد تھی، اپنے بیٹے کو لے کر حلب چلی آئی اور یہیں سیف الدولہ کی نگرانی میں ابوفراس کی تربیت ہوئی، جس نے اس کی بہن سے عقد بھی کرلیا۔ ۳۳۶ھ/ ۹۴۷-۹۴۸ء میں ابوفراس مَنبِج کا حاکم مقرر ہوا (بعد میں حرّان کا بھی)، جہاں اپنی کمسنی کے باوجود اس نے دیارِ مُضَر اور صحرائے شام کے نزاری قبائل کے خلاف لشکر آرائی میں امتیاز حاصل کیا۔ وہ سیف الدولہ کی بوزنطی مہموں میں بھی اکثر اس کے ہمرکاب رہا اور ۳۴۸ھ/ ۹۵۹ء میں قید ہوگیا، لیکن وہ خَرشَنہ سے، جہاں وہ قید کردیا گیا، گھوڑے پر سوار ہوکر دریاے فرات میں کود پڑا اور یوں بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ ۳۵۱ھ/ ۹۶۲ء میں وہ پھر مَنبِج میں اسیر ہوگیا، یعنی اس وقت جب رومی حلب کے محاصرے کے پیش نظر جنگی اقدامات میں مصروف تھے۔ وہ ان کے ہاتھوں گرفتار ہوکر قسطنطینیہ پہنچا، جہاں سیف الدولہ کی بار بار درخواستوں کے باوجود اسے ۳۵۵ھ/ ۹۶۶ء میں اسیرانِ جنگ کے مبادلۂ عام تک محبوس رہنا پڑا۔ بعدازاں اسے حِمص کا حاکم مقرر کیا گیا، لیکن سیف الدولہ کے انتقال پر اس نے اس کے بیٹے اور جانشین ابوالمعالی کے خلاف، جو ابوفراس کا اپنا بھانجا تھا، بغاوت کی کوشش کی، لیکن اسے شکست ہوئی، ۲ جمادی الاولی ۳۵۷ھ/ ۱۴ اپریل ۹۶۸ء کو ابوالمعالی کے قائدِ جیش قَرغَوَیہ نے اسے پکڑ کر ہلاک کردیا۔

ابوفراس کی شہرت بڑی حد تک اس کی ذاتی صفات کی رہینِ منّت ہے۔ وہ خوبرو، شریف النسب، شجاع اور فیاض تھا۔ اس کے معاصرین نے اس کی تعریف کرتے ہوے اسے ''ہر قسم کی فضیلت میں فائق اور ممتاز'' ٹھیرایا ہے [انّہ برع فی کل فضل — التنوخی] (اگرچہ وہ خود پسند اور بری طرح جاہ طلب تھا)۔ اس کی زندگی عربی مروّت کے اس تخیّل کے مطابق تھی جس کا اظہار وہ اپنی شاعری میں کرتا رہا۔ شاید یہی خیال ہے کہ جو ابن عبّاد کے اس جملے میں مضمر ہے جس کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے کہ ''شاعری کی ابتدا بھی ایک بادشاہ (امرؤالقیس) سے ہوئی اور ایک بادشاہ (یعنی ابوفراس) ہی پر اس کی انتہا بھی'' [بُدِئَ الشعر بملک وخُتِم بملک]۔ اس کا ابتدائی کلام قدیم انداز کے قصائد پر مشتمل ہے، جس میں اس نے اپنے گھرانے کی شرافت اور جنگی کارناموں کے گن گائے ہیں (اس سلسلے میں ۲۲۵ اشعار کا ایک قصیدۂ رائیہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جس میں حمدانیوں کی تاریخ مذکور ہے) یا خودستائی سے کام لیا ہے؛ علاوہ ازیں عراقی طرز کی چھوٹی چھوٹی غنائی نظمیں ہیں، جن کا موضوع عشق (نسیب) اور دوستی ہے۔ ابوفراس کے قصائد باعتبارِ صداقت وخلوص، بے ساختگی اور فطری زورِ بیان کے بڑے ممتاز ہیں اور ان میں تشبیہات واستعارات کا وہ تکلف نہیں جو سیف الدولہ کے دربار میں اس کے عظیم مدِمقابل المُتنبّی کے قصائد میں پایا جاتا ہے۔ غنائی نظمیں اگرچہ رنگین ہیں، لیکن غیر اہم، رسمی اور جدت سے معرّا۔ اس کے وہ قصائد بھی جن میں شیعی رجحانات کا نہایت واضح طور پر اظہار ہوتا ہے قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں اس نے عباسیوں کی ہجو کی ہے؛ لیکن اس کی شہرت کی بنیاد بالخصوص اس کے زمانۂ قید کی نظموں پر ہے جو رومیّات کے نام سے مشہور ہیں۔ ان میں ابوفراس نے بڑے مؤثّر اور بلیغ انداز میں اس احساس اور تڑپ [فرطِ حنین] کا اظہار کیا ہے جو ایک قیدی کے دل میں اپنے اہل وعیال اور احباب کے لیے ہوسکتی ہے؛ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی خود ستائی کے علاوہ زرِفدیہ کی ادائگی میں تاخیر کی بنا پر سیف الدولہ کی مذمت اور اپنی کس مپرسی کی تلخ شکایت بھی کرتا ہے۔

اس کی موت کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس کا دیوان اس کے استاد اور دوست ابن خالویہ نحوی (م ۳۷۰ھ/ ۹۸۰ء) نے ترتیب دیا اور اس میں ایک شرح کا اضافہ بھی کیا (جو بیشتر ابوفراس ہی سے ماخوذ تھی)۔ بایں ہمہ اس کے قلمی نسخوں میں متن اور ترتیب کے اتنے اختلافات موجود ہیں کہ بعض دوسری روایات پر مبنی کچھ دوسرے نسخے بھی ضرور متداول ہوں گے جن میں غالباً الببّغاء (م ۳۹۸ھ/ ۱۰۰۸ء) کی روایت بھی شامل ہوگی۔ پچھلے سب ناقص نسخوں کی جگہ (بیروت ۱۸۷۳ء، ۱۹۰۰ء، ۱۹۱۰ء) دہّان (S. Dahhan) کے تنقیدی نسخے نے لے لی ہے جو ۱۹۴۴ء میں مآخذ کی مکمل فہرست کے ساتھ بیروت سے شائع ہوا۔

مآخذ: (۱) التنوخی: نشوار المحاضرة، لنڈن ۱۹۲۱ء، ۱: ۱۱۰-۱۱۲؛ (۲) الثعالبی: یتیمة، ۱: ۲۲-۶۲ (مطبوعۂ قاہرہ، ۱: ۲۷-۷۱)؛ (۳) نیز طبع مع مقدمہ از R. Dvořak: *Abū Firās, ein arab. Dichter und Held*، لائڈن ۱۸۹۵ء؛ (۴) ابن خلّکان، عدد ۱۴۶؛ (۵) براکلمان، ۱: ۸۸ و تکملہ، ۱: ۱۴۲-۱۴۴؛ (۶) M. Canard: *Sayf al-Daula* (recueil de textes)، الجزائر- پیرس ۱۹۳۴ء، اشاریہ؛ (۷) وہی مصنف: *Hist. de la Dynastie des Ḥamdānides*، الجزائر ۱۹۵۱ء، ۱: ۳۷۹، ۳۹۵، ۵۹۶ ببعد، ۷۶۳، ۷۷۲، ۷۹۶، ۸۱۰، ۸۲۴؛ (۸) H. Ritter، در *Oriens*، ۱۹۴۸ء، ص ۳۷۷-۳۸۵؛ (۹) صدرالدّین: *Saif al-Daula and his Court Circle*].

(H. A. R. Gibb گِبّ)

ابوالفرج: رک بہ (۱) الببّغا؛ (۲) ابن الجوزی؛ (۳) ابن العبری؛ (۴) ابن الندیم. *

ابوالفرج الاِصبَہانی: (یا الاِصفَہانی) علی بن الحسین بن محمد بن احمد القُرَشی، عرب مؤرّخ، ادیب اور شاعر، ۲۸۴ھ/ ۸۹۷ء میں اصفہان (ایران) میں پیدا ہوا (اور اسی نسبت سے وہ اصفہانی کہلاتا ہے)، لیکن نسلاً وہ خالص عرب اور قریش میں سے تھا (زیادہ صحیح طور پر بنی اُمیّہ کی مروانی شاخ سے)، گو اس کے باوجود وہ مذہباً شیعہ تھا [اس کے شیعی زیدی ہونے کے متعلق رک بہ خوانساری: روضات *

الجنّات، ص ۴۷۸]۔ اس نے بغداد میں تعلیم حاصل کی اور اپنی عمر کا زیادہ تر حصہ وہیں گزارا۔ اسے آل بویہ (بالخصوص ان کے وزیر المُہلّبی کی [جس کا وہ ندیم تھا]) سرپرستی حاصل تھی۔ حلب میں سیف الدولہ حَمدانی کے دربار میں بھی اس کی بڑی آؤ بھگت رہی۔ اس نے ۱۴ ذوالحجہ ۳۵۶ھ/ ۲۰ نومبر ۹۶۷ء کو بغداد میں وفات پائی۔ [مرنے سے پہلے وہ دیوانگی میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اس کے استادوں اور شاگردوں کی فہرست الأغانی، طبع سوم، دیباچہ، ص ۱۵ - ۱۷ پر دیکھیے۔ التنوخی کا بیان ہے کہ اس کے ذہن میں مختلف علوم مستحضر رہتے اور کئی ایسی چیزیں بھی جو ایک ندیم کے لیے کارآمد ہوتی ہیں۔ وہ شعر بھی لطیف اور استادانہ کہتا تھا۔ بعض مصنفین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسے جسم اور لباس کی صفائی کا مطلق خیال نہ تھا۔] اس کا شاہکار جس پر اس کے اپنے بیان کے مطابق اس نے اپنی زندگی کے پورے پچاس سال صرف کیے، کتاب الأغانی، (''نغموں کی کتاب'') ہے جس میں اس نے وہ سب اصوات یا نغمے یکجا کر دیے ہیں جو معروف مغنّیوں ابراہیم الموصلی، اسمٰعیل بن جامع اور فُلَیح بن العوراء نے خلیفہ ہارون الرشید کے حکم سے منتخب کیے اور جن پر آگے چل کر اسحٰق بن ابراہیم الموصلی نے نظر ثانی کی تھی۔ ابوالفرج نے اس مجموعے میں مَعبَد اور ابن سُرَیج اور کئی اور گویّوں کے علاوہ خلفا اور ان کے جانشینوں کے نغموں کا بھی اضافہ کیا اور پھر ہر نغمے کے ساتھ ساتھ اس کی دھن بھی بتائی؛ لیکن یہ سب باتیں اس کتاب کا وہ حصّہ ہیں جس کی اہمیت نہایت کم ہے۔ برعکس اس کے ابوالفرج نے ان شاعروں کے متعلق جن کے نغمے اس مجموعے میں شامل ہیں بڑی سیر حاصل معلومات مہیّا کی ہیں اور ان کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ان کے کلام کا بہت سا نمونہ دیا ہے؛ اسی طرح مؤلفین نغمہ (Composers) کے حالات بھی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ وہ اس میں قدیم عرب قبائل، ان کے ایام، ان کی معاشرت، بنواُمیّہ کے درباری طور طریقے، خلفاے عباسیہ کے دور، بالخصوص ہارون الرشید کے زمانے کے معاشرے اور موسیقی دانوں اور موسیقاروں کے ماحول کا ذکر بھی تفصیل سے کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ الأغانی کا مطالعہ کیجیے تو دورِ جاہلیت سے لے کر تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی تک پوری عربی ثقافت [کے ایک پہلو] کی تاریخ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مصنف نے ایک اور جہت سے بھی ہماری خدمت کی ہے اور وہ یہ کہ عرب مصنّفین کا اتّباع کرتے ہوے وہ ان قدیم مصنفوں کی تصنیفات سے بڑے طویل اقتباسات بھی دے دیتا ہے جو ہم تک نہیں پہنچیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب عربی اسلوب نگارش کی گوناگوں تبدیلیوں کی تاریخ کے متعلق بھی ہمارا ایک عمدہ ماخذ ہے۔

الأغانی کا پہلا ایڈیشن بولاق سے ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸-۱۸۶۹ء میں بیس جلدوں میں شائع ہوا تھا، جس میں برونو (R. Brünnow) کی شائع کی ہوئی اکیسویں جلد کا اضافہ کر لینا چاہیے (*The Twenty-first Volume of the Kitāb al-Aghānī*، لائڈن ۱۸۸۸ء)۔ کتاب کے ایک خلا (lacuna) کے لیے دیکھیے ویلہاؤزن (J. Wellhausen): *ZDMG*، ۱۸۹۶ء، ص ۱۴۵-۱۵۱، کتاب کے فہارس (Tables) گویڈی (I. Guidi) نے مرتب کیے (طبع لائڈن ۱۸۹۵-۱۹۰۰ء)۔ ایک دوسرے ایڈیشن، یعنی بولاق والے ایڈیشن کی دوسری طباعت میں اکیسویں جلد نیز گویڈی (I. Guidi) کے فہارس بھی شامل ہیں [مگر بحذفِ زیادات و تصحیحات، و باسقاط اعراب ہاے قوافی و حرکات اعلام]؛ طبع قاہرہ ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵-۱۹۰۶ء؛ قب نیز محمد محمود الشِّنقیطی: تصحیح، قاہرہ ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۵-۱۹۱۶ء؛ الأغانی کی ایک تیسری، اور پہلی دو طباعتوں سے بہت بہتر، طباعت کی اشاعت قاہرہ میں ۱۹۲۷ء میں شروع ہوئی؛ [نیز بیروت ۱۹۵۶ و ۱۹۵۷ء].

ابوالفرج کی دوسری کتاب، جو ہم تک پہنچی ہے، مقاتل الطالبیین و اخبارھم ہے۔ یہ ایک تاریخی کتاب ہے، جو ۳۱۳ھ/ ۹۲۵ء میں شروع ہوئی اور اس میں آل ابی طالب میں سے ان صالح افراد کے سوانح درج ہیں [جو اپنے اسلاف کے مذہب پر قائم تھے، مگر سیاسی وجوہ کی بنا پر قتل یا زہر خورانی یا بحالت قید یا روپوشی ہلاک ہوگئے]۔ مصنف نے اس کی ابتدا [حضرت] جعفرؓ بن ابی طالب کے ذکر سے کی ہے اور ان اٹھاسی سے زیادہ افراد کے حالات پر ختم کیا ہے جنھوں نے المقتدر باللہ (۲۹۵-۳۲۰ھ/ ۹۰۷-۹۳۲ء) کے عہد میں دنیا سے کوچ کیا۔ کتاب مذکور بمقام تہران لیتھو میں (۱۳۰۷ھ) اور بمقام نجف ٹائپ میں (۱۳۵۳ھ) طبع ہوئی [اور ۱۳۶۸ھ/ ۱۹۴۹ء میں السیّد احمد صَقر کی شرح و تحقیق کے ساتھ قاہرہ میں]؛ طبع بمبئی (۱۳۱۱ھ)، جو فخر الدین النّجفی کی کتاب منتخب فی المراثی والخطب کے حاشیے پر ہے، اس کے محض نصف اوّل پر مشتمل ہے۔

ابوالفرج کی جو کتابیں ناپید مگر قابلِ ذکر ہیں، ان میں بعض انساب سے متعلق تھیں اور ایک کا عنوان تھا ایام العرب، جس میں سترہ سو معرکوں (ایام) کا ذکر کیا گیا تھا۔ اس نے ابوتمام، البحتری اور ابونواس کے دواوین بھی مرتب کیے۔

مآخذ: (۱) ابن خلّکان، عدد ۳۵۱، [طبع قاہرہ، ۱: ۲۳۴]؛ (۲) یاقوت: ارشاد، ۵: ۱۴۹-۱۶۸؛ (۳) ابن الخطیب البغدادی: تأریخ بغداد، ۱۱: ۳۹۸-۴۰۰؛ (۴) براکلمان (Brockelmann)، ۱: ۱۴۶ و تکملہ، ۱: ۲۲۵، ۲۲۶؛ (۵) ابوالفرج کا ایک عمدہ تذکرۂ احوال، جس میں اس کے شعر کے اقتباسات اور الأغانی کے متعلق معلومات دی گئی ہیں، الأغانی، طبع ثالث، کے مقدمے (۱: ۱۵ - ۲۷) میں موجود ہے (المہذب کے متعلق جو معلومات درج ہیں وہ تصحیح طلب ہیں)؛ (۶) الأغانی کے مخطوطات کے متعلق دیکھیے رِٹّر (H. Ritter)، در *Oriens*، ۱۹۴۹ء، ص ۲۷۶ ببعد۔ [ابن منظور الانصاری، صاحب لسان العرب، نے مختار الأغانی مرتب کی، جس میں شعرا کے تراجم الأغانی سے لے کر بترتیب تہجی درج کیے؛ ابن منظور کا خود نگاشت ناتمام نسخہ چار جلدوں میں کتاب خانۂ کوپرولو استانبول میں موجود ہے (شمارہ ۱۳۸۲-۱۳۸۵)، مگر جز ۱، ۵، ۶ اور ۱۸ جزاے مابعد (بشرطیکہ وہ تھے بھی) کی جلدیں موجود نہیں ہیں؛ خط عالمانہ ہے، مگر نقطے کم؛ بعض کلمات پر حرکات دے دی گئی ہیں؛ سب جلدوں کے ورق دائیں سے بائیں نہیں، بلکہ نیچے سے اوپر الٹے جاتے ہیں؛ الحسن

بن ہانئ کا ترجمہ، چونکہ الاصبہانی نے مرتب نہیں کیا، ابن منظور نے خود لکھا ہے اور پوری جلد سوم میں یہی ترجمہ ہے۔ مختار الأغانی کی جلد اوّل قاہرہ میں ۱۹۲۷ء میں طبع ہوئی۔] الأغانی کے نسخے کی تصویروں کے متعلق دیکھیے D. S. Rice : *Burlington Magazine*، بابت ۱۹۵۳ء، ص ۱۲۸۰ ببعد؛ [(۷) مفتاح السعادۃ، ۱:۱۸۴].

(M. NALLINO)

⊗ **ابوالفرج رونی:** (ابن مسعود)، غزنوی، لاہور کا اور دوسرے لفظوں میں برصغیر پاکستان و ہند کا سب سے پہلا ممتاز شاعر، جسے فارسی زبان کے اساتذۂ سخن میں شمار کیا جاتا ہے، اگرچہ وہ خود اپنے وطن میں قریب قریب گمنام ہو چکا ہے۔ وہ اپنی کنیت بطورِ تخلّص اور تخفیفاً ''بلفرج'' لکھتا ہے (دیوان، ص ۱۲۴، ع: ''بلفرج را درین بنا کہ درآن — الخ''، ص ۱۳۹، رباعی: ''یارب تو کنی عید کہ گرداند عید - بربلفرج رونی منصور سعید — الخ'')، اس کا نوجوان معاصر اور ہم وطن مسعود سعد (دیوان مسعود، طبع یاسمی، ص ۱۰۴، ۲۸۷) اور استاد انوری (ع: ''از متانت خیل اقبالت چو شعر بلفرج'' منقولۂ لباب الالباب، ۲:۲۴۱) بھی اسے اسی کنیت سے یاد کرتے ہیں۔ اس کے وطن کے نام کی املا ''رون''، ''رونہ''، ''روئن'' میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن یہ مسلّم ہے کہ غزنوی دور میں یہ لاہور کی ایک مضافاتی بستی یا محض بیرونی محلّے کا نام تھا، چنانچہ قریب العصر صاحبِ لباب الالباب، رونی کے ترجمے میں ''مولد و منشاے او خطّۂ لاہور'' (۲: ۲۴۱) لکھنے پر اکتفا کرتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی وقت — مثلاً مغلوں کی تاراجی لاہور (۶۳۹ھ/اواخر ۱۲۴۱ء) کے سلسلے میں — یہ بستی ایسی برباد ہوئی کہ عہدِ اکبری میں صاحب منتخب التواریخ (طبع کلکتہ، ۱:۷۳؛ طبع نولکشور، ص ۱۲) کو اس کا نام و نشان تک نہ مل سکا۔ واضح رہے کہ ہندوستان کی متداول فارسی تاریخوں میں یہی فاضل مؤرّخ رونی کے کلام اور زمانے کا واقفیت کے ساتھ ذکر کرتا ہے، بخلاف ابوالقاسم فرشتہ کے، جس نے اپنی تاریخ (طبع برگز (Briggs)، ۱:۸۵، طبع؛ نولکشور، ۱:۴۹) میں رونی کے متعلق بظاہر سماعی اور بعض بے تکی باتیں لکھ دی ہیں۔ شاعر کے گم شدہ وطن کو اتنی اہمیت اس لیے حاصل ہوئی کہ دسویں۔ گیارھویں صدی ہجری کے ایرانی تذکرہ نویسوں نے ''رون'' یا ''رونہ'' کو ایران و توران میں ڈھونڈنا شروع کیا۔ صاحب مجمع الفصحاء نے نیشاپور کے نواح میں اس کی نشان دہی کی، حالانکہ اسی زمانے کی فارسی کتب لغت میں ''رون'' یا ''روئن'' کو ہندوستان میں اور صراحتہً استاد ابوالفرج کا مولد لکھا ہے (جیسے برہان قاطع، فرہنگ رشیدی، منتخب اللغات، تحتِ مادّہ)۔ یہ لغات ممالک ہند میں تالیف ہوئیں، لیکن ایرانی اہلِ علم و قلم کا ان سے بے خبر رہنا باعثِ حیرت ہے اور مزید تاسف اس پر ہے کہ شعر و شعرا کا تذکرہ لکھنے والوں نے کلامِ رونی کا بالاستیعاب مطالعہ ہی نہیں کیا، ورنہ ضرور دیکھ لیتے کہ یہ کلام سرتاپا غزنہ و لاہور کے ملوک و امرا کی مدح پر مشتمل ہے، بیرونی مشاہیر سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ بایں ہمہ تذکروں کی غلط روایت زمانۂ دراز تک نقل ہوتی رہی۔ عہدِ حاضر میں ایران پرست مرزا محمد قزوینی کو دو تین بار اس کی تردید کرنا پڑی (لباب الالباب، حواشیِ جلد دوم؛ چہار مقالہ، ص ۱۰۴؛ قب راحۃ الصدور، طبع محمد اقبال، ص ۵۷، حاشیہ)۔

مولد معدوم ہو گیا، لیکن اپنے سخن ور مولود کی بدولت اس کا نام زندہ ہے، تاہم سنین ولادت و وفات کے متعلق ہمیں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ محمد علی ناصح، جس نے دیوانِ رونی (طبع چاپکین، تہران) کی تصحیح و تحشیہ کی خدمت سرانجام دی ہے، خاتمۂ کتاب پر شاعر کے مختصر حالات فراہم کرتا ہے۔ اس نے مختلف قرائن سے رونی کی عمر چونسٹھ سال اور سالِ وفات ۴۹۰ھ/۱۰۹۷ء تخمین کیا ہے۔ اس حساب سے اس کی پیدائش ۴۲۶ھ/۱۰۳۵ء میں ہوئی۔ یہاں یہ یاد دلانا مناسب ہوگا کہ گو لاہور کا سلطنت غزنین سے مستقل الحاق سلطان محمود کے آخر عہد میں ہو چکا تھا (تقریباً ۴۱۳ھ/۱۰۲۴ء)، لیکن ''این روے سندھ و ولایت ہند'' کا صحیح معنی میں دارالامارت یہ شہر سلطان مسعود اوّل (''شہید'') کے عہدِ حکومت میں بنایا گیا، یعنی جب شہزادۂ مجدود کے ساتھ ابوالنجم ایاز بطورِ اتالیق اور شاعر مسعود کا باپ سعد سلیمان لاہور بھیجے گئے (ذوالقعدہ ۴۲۷ھ/اگست ۱۰۳۶ء؛ حسبِ تحریر البیہقی، ص ۳۹۷) اور وہ جدید تعمیر و توسیع سے مسلمانوں کا شمالی ہند میں ملّی اور تہذیبی مرکز بننا شروع ہوا۔ تاہم بالکل ممکن ہے کہ رونی کا خاندان سالِ مذکور سے بھی کچھ پہلے نواحِ لاہور میں سکونت اختیار کر چکا ہو، اگرچہ ہم باپ کے نام کے سوا اس کے احوال و اشغال سے ناواقف ہیں۔

بہرحال استاد رونی کے فروغ کا زمانہ بیش تر سلطان ابراہیم ابن مسعود (۴۵۱-۴۹۲ھ/۱۰۵۹-۱۰۹۹ء) کے دور میں واقع ہے، جس میں لاہور کی مسندِ امارت پر نجم الدین زَیر شیبانی اور کچھ وقفے کے بعد سلطان کے دو فرزند، سیف الدولہ محمود اور علاء الدولہ مسعود، متمکّن رہے (دیکھیے ضمیمۂ مآثر لاہور، جلد اوّل)۔ رونی کے قصائدِ فائقہ زیادہ تر سلطان موصوف اور انھیں نائبانِ سلطنت کی مدح میں نظم ہوے ہیں۔ ان عالی مقام حکمرانوں کے علاوہ بہت سے قصائد و قطعات دوسرے عمائد و اراکینِ دولت سے منتسب ہیں، جن میں سے ان چند کا ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا: (۱) دربارِ غزنین کے شہرۂ آفاق میمندی خاندان کے تین افراد، عبدالحمید، بہروز احمد اور منصور بن سعد، جن میں سے پہلا ۲۸ برس تک ابراہیم اور اس کے جانشین فرزند مسعود ثانی (۴۹۲-۵۰۸ھ/۱۰۹۹-۱۱۱۴ء) کا وزیرِ سلطنت رہا اور ابتداءً لاہور میں غالباً صدرِ دیوان تھا۔ رونی کے دو (شمارہ ۲۰ و ۴۷) اور مسعود سعد کے بھی کم سے کم دو قصیدے (دیوان، طبع یاسمی، ص ۴۱ و ۵۳) اس کی مدح میں محفوظ ہیں۔ رونی کا یہ برجستہ مطلع فرشتہ تک بعد کی تاریخوں میں نقل ہوتا رہا ہے: ''ترتیبِ ملک و قاعدۂ علم و رسمِ داد - عبدالحمید احمد عبدالصمد نہاد''۔ اس کے عم زاد بہروز احمد کی توصیف میں استاد نے مثالی

وزارت کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ دنیا کی آسودگی کے لیے تھی اپنی ذاتی آسودگی کے لیے نہ تھی۔ (۲) منصور بن سعید بن احمد، جو بظاہر اوّل الذکر کا بھتیجا تھا اور بہت دن لاہور میں عہدۂ صدارت پر فائز رہا، تین قصائد (۵ و ۷ و ۱ و ۴) کا ممدوح ہے۔ (۳) ایک بزرگ صفت جوان امیر ثقۃ الملک ظاہر ابن علی کہ وہ بھی اسی عہدے پر لاہور بھیجا گیا تھا اور سلطان محمود کے نامور دبیر ابوالنصر مشکان کا بھتیجا تھا (مقدمۂ دیوان مسعود سعد، طبع یاسمی؛ سہیلی خوانساری: حصار نای، ص ۶۳)، جس کے ورود نے ''لوہاوور'' کو مصر سے بڑھ کر مصر بنا دیا (قصیدہ، شمارہ ۶۵)۔ اسی کے نام ایک قصیدۂ لامیہ (شمارہ ۴۴) میں استاد نے اپنی پریشان حالی کی فریاد صیغۂ واحد غائب میں کرتے ہوئے یہ بلیغ و پُراثر شعر کہا ہے: ''صید اوبہ نوا چو صید حرم ــ کسب او کم بہا چو کسب حلال''۔ (۴) ابوسعد بابو، خاص لاہوری امیر، ''دیوانِ رسائل'' کے عہدے پر مامور تھا (مآثر لاہور، ۱:۱۱۰ و ۲:۱۲۱ ببعد)۔ اس کی شان میں تین قصیدے ہیں۔ (۵) ابو الحسن علی کوی لاہوری، سپہ سالار، جو جالندھر سے آگے ایک جنگی مہم لے گیا تھا (قصیدہ ۷؛ قب وہی کتاب، ۱:۱۱۳، حاشیہ)؛ مگر جالندھر کی ایک بڑی لڑائی کا فاتح مسعود سعد کا سرپرست ابوالنصر ہبۃ اللہ گزرا ہے، جس کی علم پروری اور اعمالِ خیر کے قصّے عوفی کے زمانے تک زبان زد تھے (لباب الالباب، ۱:۲۷، ۴۷)۔ وہ سلطان مسعود ثانی کے نوجوان فرزند شہزادہ شیرزاد کے زمانۂ امارتِ لاہور (۴۹۳ھ/ ۱۰۹۹ء) میں کدخدا، یعنی مختار کار، بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اس کی مدح میں رونی کا صرف ایک قصیدہ شاملِ دیوان ہے اور یہ بھی شاید اس امیر کے لاہور آنے سے پہلے لکھا گیا تھا۔ (۶) ابوالرُشد رشید محتاج سلطان ابراہیم کا ندیم خاص تھا، جو لاہور میں صدرِ دیوان کے عہدے پر فائز اور پھر بظاہر یہیں متوطن ہو گیا تھا اور جس کا فرزند شہاب الدین محمد بہت زمانے تک ''افاضلِ لاہور'' میں شمار ہوا (لباب الالباب، ۱:۱۰۲)۔ رشید محتاج کی مدح میں دو قصیدوں (شمارہ ۴۰ و ۲۷) میں سے آخری اس کے نوتعمیر لاہوری محل کی تحسین و تہنیت میں نظم کیا گیا تھا اور جدّت و حسنِ بیان کے اعتبار سے ادبی جواہر پارہ ہے۔ اس میں شروع سے خود عمارت کو مخاطب کیا گیا ہے: (مطلع) ''اے ہمایوں بنائے آہن پاے ـ آہو ے نانہادہ در تو خداے''، محل کی وسعت و ارتفاع اور منقش دیواروں کے بیان کے ساتھ ایک شعر میں در کھلنے کی آواز کو صداے خیر مقدم سے تشبیہ دی ہے: ''گفت باز از ان صریر درت ـ مرحبا مرحبا درآیے درآیے''۔ اسی نادر مضمون کا سرقہ کرنے کا انوری جیسے بادشاہِ سخن پر الزام لگایا گیا تھا۔ فاضل نقّاد شمس الدین رازی دونوں شعر نقل کر کے لکھتا ہے (المعجم فی معاییر اشعار العجم، ص ۴۰۴) کہ جب کوئی شاعر اپنے پیش رو کے مضمون کو لے اور اس میں کوئی مزید خوبی نہ پیدا کر سکے تو یہ محض چوری سمجھی جائے گی۔ اسی طرح رونی کا ایک اور شعر (جو مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں) صاحبِ المعجم نے نقل کیا ہے اور ظہیر فاریابی کا ہم مضمون شعر لکھ کر دکھایا ہے کہ لاہوری استاد سے بعد کا ایرانی سخن طراز بازی نہیں لے جا سکا۔

نئی تعمیرات کی مبارک بادوں میں ایک قطعہ وہ ہے جو استاد نے اپنے نوخیز ہم وطن مسعود سعد کے نیا محل بنوانے پر لکھا (شمارہ ۷۷) اور مسعود نے اس پر اظہارِ فخر اور مؤدبانہ شکریہ ادا کیا تھا (دیوانِ مسعود، ص ۷۲۸)۔ وہ اور بھی دو تین مقام پر رونی کی فضیلت اور اپنی شاگردی کا اعتراف کرتا ہے (وہی کتاب، ص ۱۰۴، ۴۲۰ وغیرہ)، لیکن جیسا کہ آگے آتا ہے یہ دوستانہ تعلقات ان میں آخر تک قائم نہ رہ سکے۔

استاد کے کلام پر مختصر تبصرہ کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ اس کی زندگی کے متعلق جو کچھ قلیل معلومات فراہم ہو سکی ہیں انھیں چند سطروں میں دہرا دیا جائے۔ وہ کسی ذی وجاہت خاندان کا فرد نہ تھا اور اس اعتبار سے بھی کہ اسلامی لاہور کی بالکل ابتدائی آبادکاری کے وقت یہاں سکونت پذیر ہوا، اس کا علم و فضل تحسین و تعجب کے قابل ہے۔ ممکن ہے نوجوانی میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے غزنین گیا ہو اور وہیں شعراے محمودی کے آوازۂ شہرت نے اسے شعرگوئی کا شوق دلایا ہو۔ متعدد قصائد سلطان ابراہیم غزنوی اور اس کے درباریوں کی مدح میں اس دور کی یادگار مانے جا سکتے ہیں۔ بایں ہمہ معلوم ہوتا ہے کہ معاشی اعتبار سے وہ کبھی خوش حال نہیں رہا اور کسی اونچے منصب اور اعزاز سے بہرہ مند نہ ہو سکا۔ ایک قصیدے (شمارہ ۴۳) میں سلطان ابراہیم کی مدح و ثنا کے بعد اپنے مصائب اور کسی عہدے سے معزول ہونے کی شکایت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ معزولی کا یہ حکم اس طرح اچانک آیا جس طرح کسی ''بے گناہ قندیل پر پتھر آ کر لگے''۔ طاہر ابن علی کے نام قصیدے (شمارہ ۴۴) میں، جس کا اوپر حوالہ اور ایک شعر نقل ہوا، بے تابانہ آرزو کرتا ہے کہ شاید ممدوح کی توجہ سے اسے کوئی کام مل جائے اور اس کی اندھیری رات بھی دن ہو جائے، ایک قصیدے (۶۴) میں شہزادہ سیف الدولہ محمود، نائب السلطنت لاہور (م ۴۶۹-۴۸۰ھ/ ۱۰۷۷-۱۰۸۸ء)، سے بادشاہ کی جناب میں سفارش کی التجا کی ہے کہ وہ تنخواہ جو ''مسعودی'' کو دی جاتی تھی میرے نام کرا دی جائے، جس سے بلاشبہہ مسعود سعد ہی مراد ہوگا، جو اس شہزادے کا ندیم اور درباری شاعر تھا اور کم سے کم دو مرتبہ معتوب ہو کر لاہور سے نکال دیا گیا تھا (مآثر لاہور، ۲:۱۰۵-۱۱۱)۔ پہلی فریاد و فغاں اور بعد کی التجا کے نتیجے سے ہمیں آگاہی نہیں ہو سکی، لیکن آگے چل کر مسعود سعد کو بدظنی بلکہ شاید یقین ہو گیا کہ استاد رونی بھی اس کے (اور اس کے آقا کے؟) خلاف سازش میں شریک تھا، جو مسعود کے قید میں ڈالے جانے کا باعث ہوئی۔ اس پر مسعود نے بگڑ کر وہ قطعہ لکھا (دیوان، ص ۶۳۵) جس میں ابوالفرج کا نام لے کر اس کی احسان فراموشی پر نفرین کی اور آخر میں تنبیہ کی ہے کہ جو بیج تو نے بویا ہے بہت جلد اس کا پھل تو خود چکھ لے گا۔ اس بات کے ثبوت میں کہ یہاں اس کا مخاطب رونی تھا آخر الذکر کا ایک ہجویہ قطعہ (ص ۱۳۴) پیش کیا جاتا ہے، جس میں وہ مسعود کی دھمکیوں کے جواب میں لکھتا ہے کہ تو مجھے حقیر سمجھتا ہے، مگر تیرے اور بہت سے قوی دشمن موجود ہیں۔ ان میں سے کسی چیتے کا پنجہ لگ گیا تو اسی زخم پر مجھ جیسا چوہا بھی ناخن مار کر

تجھے ہلاک کرسکتا ہے۔ اس تمام قضیّے کے چند پہلو غیر واضح ہیں (تفصیل کے لیے دیکھیے مآثر لاہور، ۲:۹۲ ببعد)؛ لیکن یہاں بھی رونی کی دنیوی کہتری اور ناکامی ہی کی شہادت ملتی ہے۔ غرض مجموعی طور پر ہمارا شاعر اپنی زندگی سے ناخوش اور مایوس رہا۔ ایسی فریاد، جس کی نوک دل میں چبھتی محسوس ہوتی ہے، محض شاعرانہ خیال آفرینی نہیں ہوسکتی: رباعی

”ہر تیر کہ در جعبۂ افلاک بود
آماج گہش این دل غم ناک بود
تا چرخ چنین ظالم و بے باک بود
آسودہ کسے بود کہ در خاک بود“

(دیوانِ رونی، ص ۱۴۲).

فارسی شاعری پر ساتویں/تیرھویں صدی کی دو معتبر کتابوں، یعنی تذکرہ لباب الالبابِ عوفی اور المعجم فی معاییر اشعار العجم، کے مطالعے سے عیاں ہوتا ہے کہ استاد ابوالفرج رونی کا کلام اس کے دوسو برس بعد تک مقبول و متداول رہا۔ انوری جیسا اوّل درجے کا قصیدہ نگار بھی ”ہمیشہ اس کے کلام کا تتبّع کرتا تھا اور اس کا دیوان برابر دیکھتا رہتا تھا“ (لباب، ۲:۲۴۱)۔ اہلِ ذوق اس کے انتخابات محفوظ رکھتے تھے۔ صنائع بدائع کی نظیر میں رونی کے اشعار بہ کثرت لائے جاتے تھے۔ اس کی شہرت اور وقعت کسی ایرانی سخنور سے کم نہ تھی۔ اسی کی صدائے بازگشت بعد کے تذکروں (مثلاً مجمع الفصحاء، آتش کدہ، وغیرہ) میں سنی جاسکتی ہے؛ لیکن گزشتہ دوصدی سے یہ کلام رفتہ رفتہ غیر معروف اور ہندوستان میں تقریباً کمیاب ہوگیا ہے، پھر بھی کوئی چالیس برس قبل ایک روسی قدرشناس چایکین، مترجم سفارت خانۂ روس شوروی، نے اسے طبع کرانا چاہا تو صرف تہران میں سات قلمی نسخے دستیاب ہوگئے، اگرچہ سب اغلاط سے پُر تھے۔ تصحیح کرنے والا فاضل محمد علی ناصح غزنوی لاہور کی دھندلی تاریخ سے چنداں واقف نہ تھا۔ بہرحال ان صاحبوں کا احسان ہے کہ کلام رونی جیسا اور جتنا کچھ بھی مل سکا مجلّۂ ارمغان، تہران کا ضمیمہ بنا کے ۱۳۰۵ فصلی/۱۳۴۵ء میں ٹائپ میں طبع کرادیا۔ اس میں ۱۳۴ قصائد و قطعات، ۵۷ رباعیاں اور صرف تین غزلیں ہیں جو سب ملا کر ۱۴۵ صفحات پر محتوی ہیں؛ لیکن، جیسا کہ مصحح اور کچھ عرصے بعد آقاے رشید یاسمی نے دیوان مسعود سعد کے مقدمے میں واضح کیا، رونی کے کلام کا ایک حصّہ تلف یا دوسرے شعرا کے مجموعوں میں مخلوط ہوگیا ہے۔ عوفی نے اپنے انتخاب میں دو شعر جن قصیدوں سے نقل کیے ہیں وہ اب دیوان میں موجود نہیں، یعنی (۱) ع: ”نعل اسپ تو ہلال است و ستامش کوکب است.....“ اور (۲) ”مال دادن جزبہ حق اسراف دان.....“ اسی طرح المعجم میں دو بیت اور تین شعر کا ایک معمّا منقول ہیں (ص ۴۰۱)، جن میں سے کوئی ہمارے مطبوعۂ ذخیرہ میں نہیں۔ انھیں میں ایک وہ شعر ہے جس کا مضمون لینے پر ظہیر فاریابی مطعون ہوا:

از خواب گران فتنہ سبک برنہ کند سر
تادیدۂ حزم تو بود روشن و بیدار

دوسرے تذکروں اور عروض ولغت کی کتابوں میں چھان بین کی جائے تو عجب نہیں رونی کے کچھ اور گم شدہ اشعار مل جائیں۔ ہم نے اس غرض سے فرہنگ جہانگیری از حسین انجو پر ایک نظر دوڑائی۔ ٹھیٹ یا نامانوس قدیم فارسی الفاظ کی سند میں چالیس کے قریب استاد رونی کے ایسے اشعار ملے جن میں نصف سے زیادہ مطبوعہ دیوان میں نہیں آئے۔ ظاہر ہے کہ ہر شعر کسی تلف شدہ قطعۂ نظم یا قصیدے کا جزو ہوگا۔ اس طرح اندازا ہوتا ہے کہ استاد کا معتدبہ کلام ضائع ہوگیا۔

رونی کے شعر میں گہری معنویت اور بقولِ انوری بڑی متانت پائی جاتی ہے جو اس کے ہم وطن اور مشہور تر حریف معاصر مسعود سعد کے ہاں نہیں ملے گی۔ البتہ تنوّع، روانی، بلکہ طغیانی میں مسعود کے قصائد بڑھے چڑھے ہیں۔ رونی محدود میدان میں جولانی دکھاتا ہے۔ اس کی رباعیات اور گنتی کی تین غزلیں، جو مطبوعہ دیوان میں شامل ہیں، کوئی امتیازی خصوصیت نہیں رکھتیں۔ درحقیقت فارسی غزل کے اس بلند معیار کی جو عہدِ سعدی میں قائم ہوا قرونِ سابقہ میں توقّع کرنا بھی نہ چاہیے۔ بہرکیف ابوالفرج رونی مسلم لاہور کا پہلا ممتاز بزرگ شاعر تھا۔

مآخذ: (۱) دیوان ابوالفرج ابن مسعود رونی، طبع چایکین، تصحیح وخاتمہ از محمد علی ناصح، تہران ۱۳۰۴ فصلی؛ (۲) دیوان مسعود سعد، مع مقدمۂ آقاے رشید یاسمی، تہران ۱۳۱۸ فصلی؛ (۳) حصار نای، تالیف سہیلی خوانساری، تہران ۱۳۱۵ فصلی؛ (۴) عوفی: لباب الالباب، طبع وتحشیۂ براؤن وقزوینی، دوجلد، لنڈن ۱۹۰۳ء و ۱۹۰۶ء؛ (۵) شمس الدین رازی: المعجم فی معاییر اشعار العجم، طبع براؤن وقزوینی، لنڈن ۱۹۰۹ء؛ (۶) مجمع الفصحاء، تہران ۱۲۷۰ فصلی؛ (۷) چہار مقالہ، تہران ۱۳۴۴ فصلی؛ (۸) راحة الصدور، طبع محمد اقبال، لائڈن ۱۹۲۱ء؛ (۹) بدایونی: منتخب التواریخ، طبع کلکتہ ۱۸۸۰ء؛ نول کشور ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۸ء؛ (۱۰) تاریخ فرشتہ، طبع برگز (Briggs)، بمبئی ۱۸۳۰ء؛ نول کشور ۱۳۸۱ھ/۱۸۶۴ء؛ (۱۱) تاریخ بیہقی (عہد مسعود)، طبع ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ ۱۸۶۷ء؛ (۱۲) سید ہاشمی: مآثر لاہور، لاہور ۱۹۵۶ء؛ لغات: (۱۳) عبدالرشید: منتخب اللغات؛ (۱۴) برہان قاطع (طبع معین)؛ (۱۵) فرہنگ رشیدی؛ (۱۶) حسین انجو: فرہنگ جہانگیری، طبع ثمر ہند لکھنؤ.

(سیّد ہاشمی فرید آبادی)

ابوالفَضْل: رک بہ العَمِید. *

ابوالفَضْل بَیْہَقی: رک بہ بَیْہَقی، ابوالفضل. *

ابوالفَضْل علّامی: شیخ ابوالفضل، اپنے زمانے کے مشہور عالم شیخ مبارک ⊗

ناگوری (م ۱۰۰۱ھ/ ۱۵۶۳ء) کا دوسرا بیٹا اور شیخ فیضی [رک بآن] کا چھوٹا بھائی، ۶ محرم ۹۵۸ھ/ ۱۴ جنوری ۱۵۵۱ء کو آگرے میں پیدا ہوا، جہاں اس وقت اس کے والد ایک معلّمِ دینیات کی حیثیت سے مقیم تھے۔ اس نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور پندرہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گیا۔

مغل بادشاہ اکبر اعظم کے دربار میں ابوالفضل کی رسائی ۱۵۷۴ء میں اپنے بھائی فیضی کی وساطت سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ اسے اس قدر قربِ سلطانی نصیب ہوا کہ تمام اہلِ دربار کی بہ نسبت وہ بادشاہ کے بہت قریب تر ہو گیا۔ ابتدا میں اسے منشی گری کی خدمت سپرد ہوئی، لیکن پھر متصدیِ وزارت ہو گیا اور ترقی کرتا ہوا بالآخر صدر الصدور کے منصب کو پہنچ گیا۔

ابوالفضل نے اکبر کے مذہبی عقائد میں بھی اچھا خاصا دخل پیدا کیا، چنانچہ جب اکبر نے ۹۸۲ھ/ ۱۵۷۵ء میں فتح پور سیکری میں مذہبی علما کے مباحثے سننے کے لیے ''عبادت خانہ'' قائم کیا تو ابوالفضل علما کے ان باہمی مباحثوں میں شریک ہوتا اور ہمیشہ اکبر کے عقائد کی طرفداری کرتا، یہاں تک کہ اس نے اکبر کو یہ سمجھایا کہ مذہب کے متعلّق اس کے نظریات معاصر علما سے کہیں افضل و برتر ہیں اور ۱۵۷۹ء میں دربارِ شاہی سے ایک محضر جاری کیا جس کی رُو سے مذہبی علما کے اختلافات نبٹانے کے لیے آخری حَکَم اکبر کو بنا دیا گیا؛ ''عبادت خانے'' کے مناظروں کے دوران ہی میں اکبر کو ایک نیا مذہب ایجاد کرنے کا شوق چرّایا اور اس نے ۱۵۸۲ء میں ''دینِ الٰہی'' کی بنیاد رکھی، جسے ابوالفضل نے بھی قبول کیا [رک بہ مادّۂ دینِ الٰہی]۔

دربارِ اکبری میں ابوالفضل کا اثر و نفوذ اس قدر بڑھا کہ معاصر درباری اس سے حسد کرنے لگے اور امرا کے تقاضے سے ۱۵۹۹ء میں اسے دکن بھیج دیا گیا۔ وہاں اس نے ایک حاکم اور سپہ سالار کی حیثیت سے بہت عمدہ کام کیا اور اس کام کے صلے میں ۱۶۰۰ء میں اسے چار ہزاری اور دو سال بعد پانچ ہزاری کا منصب عطا کیا گیا۔ ۱۶۰۲ء میں جب [شہزادہ سلیم نے سرکشی اختیار کی اور] ابوالفضل کو دارالسلطنت میں واپس بلایا گیا تو راستے میں بُندیلہ [راجپوت] سردار راجہ بیر سنگھ دیو نے گوالیار سے تین کوس کے فاصلے پر قصبۂ انتری میں اس پر حملہ آور ہو کر اسے ۴ ربیع الاوّل ۱۰۱۱ھ/ ۲۲ اگست ۱۶۰۲ء کو قتل کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ کام شہزادہ سلیم کے ایما سے کیا گیا۔ راجہ بیر سنگھ دیو سلیم کا حامی تھا، چنانچہ راجہ نے ابوالفضل کا سر کاٹ کر شہزادہ سلیم کے پاس الہ آباد بھیج دیا اور باقی لاش قصبۂ انتری ہی میں دفن کر دی۔ [اکبر کو اس واقعے سے سخت صدمہ پہنچا اور اس کے دل میں شہزادہ سلیم کی طرف سے ہمیشہ کدورت باقی رہی۔ ابوالفضل کا ایک بیٹا عبدالرحمٰن خان (م ۱۶۱۳ء) اس کے انتقال کے بعد زندہ رہا اور صوبۂ بہار کا حاکم مقرر ہو گیا]۔

تصنیفات: ۱- اکبر نامہ: ابوالفضل کی سب سے اہم تصنیف اکبر نامہ ہے، جو اکبر کے بزرگوں کی مختصر اور عہدِ اکبری کی مبسوط تاریخ ہے اور واقعات کو اکبر کے چھیالیسویں سالِ حکومت تک لاتی ہے۔ اس کے دو دفتر یا جلدیں ہیں۔ پہلا دفتر اکبر کے اکتالیسویں سالِ حکومت، یعنی شعبان ۱۰۰۴ھ/ ۱۵۹۶ء، میں مکمل ہوا تھا۔ اس کے دو حصّے ہیں: پہلے حصّے میں تیموریوں کا شجرۂ نسب اور بابر اور ہمایوں کے عہد کے حالات درج ہیں؛ دوسرے حصّے میں اکبر کے پہلے سالِ حکومت سے لے کر سترھویں سال کے وسط تک کے حالات درج ہیں۔ دوسرے دفتر میں سترھویں سال کے نصف آخر سے چھیالیسویں سال تک کے واقعات کا ذکر ہے۔

۲- آئین اکبری: بعض لوگ اسے اکبر نامہ کا تیسرا دفتر قرار دیتے ہیں، لیکن یہ تالیف ایک الگ کتاب ہے، جس میں سلطنت کے نظم و نسق اور اعداد و شمار کا ذکر ہے۔ اس کتاب کے پانچ دفتر ہیں، جن میں مندرجۂ ذیل موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں: (۱) دربار اور حرم سرا؛ (۲) متوسلین و متعلّقین دربار؛ (۳) سال الٰہی، مالیات اور آمار صوبہ جات؛ (۴) ہنود، ان کا ادب، ان کے ادارے، ہندوستان پر خارجی حملہ آور، سیاح اور مسلمان صوفیہ؛ (۵) ملفوظات اکبر، جو ابوالفضل نے جمع کیے ہیں۔

۳- عیار دانش: انوار سہیلی کا اختصار ہے؛ تاریخ تکمیل ۹۹۶ھ۔

۴- دیباچۂ رزم نامہ: مہابھارت کے فارسی ترجمے کا دیباچہ ہے؛ تاریخ تالیف ۹۹۵ھ/ ۱۵۸۷ء۔

۵- انجیل: ''بائبل'' کا فارسی ترجمہ ہے؛ تاریخ ترجمہ ۹۸۶ھ۔

۶- مناجات: ایک طویل نظم جو ۹۹۳ھ/ ۱۵۸۵ء میں لکھی گئی (یہ *Medieval India Quarterly*، علی گڑھ، جلد اوّل، شمارۂ سوم، میں شائع ہو چکی ہے)۔

۷- انشاے ابوالفضل یا مکاتبات ابوالفضل: ابوالفضل کے بھانجے عبدالصمد نے ابوالفضل کی وفات سے کچھ ہی عرصے بعد ۱۰۱۱ھ/ ۱۶۰۲ء میں ابوالفضل کے خطوط کا مجموعہ چار دفاتر میں جمع کرنا شروع کیا اور ۱۰۱۵ھ/ ۱۶۰۶-۱۶۰۷ء میں یہ کام ختم کیا۔ تاریخی نام مکاتبات علامی (۱۰۱۵ھ) ہے۔ دفتر اوّل میں وہ مراسلات ہیں جو ابوالفضل نے اکبر کی طرف سے بادشاہوں اور امرا کو لکھے ہیں۔ دفتر دوم میں وہ مراسلات ہیں جو ابوالفضل نے اپنی طرف سے بادشاہوں اور امرا کو لکھے ہیں۔ تیسرے دفتر میں بعض کتابوں کے دیباچے، اقتباسات اور نثر کے غیر مربوط ٹکڑے درج ہیں۔ چوتھے دفتر میں باون خطوط ہیں، جن میں سے پہلا اکبر کی طرف سے عبداللہ خان اوزبک کے نام لکھا ہے اور باقی ابوالفضل نے اپنی طرف سے اَور لوگوں کو لکھے ہیں۔ چوتھا دفتر بہت کمیاب ہے؛ اس کا ایک نسخہ کتاب خانۂ بانکی پور میں موجود ہے (فہرست، ۸۶۹:۹)۔

۸- رقعات ابوالفضل: ابوالفضل کے نجی خطوط کا مجموعہ، جو اس کے بھتیجے نورالدّین محمد نے ترتیب دیا ہے۔

۹- دیباچۂ تاریخ الفی: روایت ہے کہ ابوالفضل نے تاریخ الفی کا

دیباچہ لکھا تھا، لیکن یہ دیباچہ ناپید ہے اور کسی کتاب خانے میں محفوظ نہیں.

[ابوالفضل فارسی کا ایک بلند پایہ اور صاحبِ اسلوب انشا پرداز تھا۔ اس کے مخصوص اسلوبِ نگارش کی نقل کرنے کی کوشش بہت سے لوگوں نے کی ہے، لیکن کسی کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی.]

مآخذ: (۱) ابوالفضل: آئین اکبری، دہلی ۱۲۷۲ھ؛ (۲) نظام الدین احمد بخشی: طبقات اکبری، کلکتہ ۱۹۱۳ء؛ (۳) شاہنواز خان: مآثر الامراء، کلکتہ ۱۳۰۹ھ؛ (۴) ایلیٹ و ڈاؤسن (Elliot and Dowson): *History of India*، ج ۶، لنڈن ۱۸۷۳ء؛ (۵) عبدالقادر بدایونی: منتخب التواریخ، ج دوم (انگریزی ترجمہ از Lowe)، کلکتہ ۱۹۲۴ء؛ (۶) محمد علی مدرّس تبریزی: ریحانۃ الادب، ج ۲، تہران ۱۳۶۹ فصلی؛ (۷) سٹوری (Storey): *Persian Literature*، ج ۱، جز ۲ و ۳، لنڈن ۱۹۳۹ء؛ [(۸) محمد حسین آزاد: دربار اکبری].

(محمد باقر)

---

* **ابوالفَضْل عیاض:** رک بہ عِیاض.

---

* **ابوفُطْرُس:** (Antipatris) رک بہ نہرابی فُطرس.

---

* **ابوالقاسم:** ایک چرب زبان مفت خورے (طفیلی) کا نام، جسے ابوالمطہّر محمد بن احمد الاَزْدی نے اپنی حکایۃ ابی القاسم البغدادی میں ایک بغدادی نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ کتاب غالباً پانچویں صدی کے نصف اوّل میں لکھی گئی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ اس بطل (hero) کی زندگی کے ایک دن کا حال بے کم و کاست بیان کر دیا جائے۔ ابوالقاسم ایک ضیافت میں لوگوں کے مجمع کو اپنی واعظانہ خوش بیانی کے ذریعے اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے، مہمانوں اور میزبان کو جلی کٹی سناتا ہے اور بغداد و اصفہان کی خوبیاں ایک دوسرے کے مقابلے میں تفصیل سے پیش کرنے میں اپنی لسانی مہارت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جیسے جیسے کھانے کے متعدّد دور چلتے ہیں، وہ ہر بار کوئی نہ کوئی چٹکلا چھوڑ دیتا ہے۔ جب اسے شراب کا نشہ چڑھ جاتا ہے تو لوگوں کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور بدتمیزی کرنے لگتا ہے۔ لوگ اسے اَور زیادہ شراب پینے پر مجبور کرتے ہیں، یہاں تک کہ آخرکار وہ سو جاتا ہے اور جب نشہ دور ہو جاتا ہے تو وہ پھر ایک متّقی مومن کا کردار ادا کرتا ہے۔ مصنّف نے اس خاکے میں اپنے لسانیاتی میلانات کا تتبع کرتے ہوئے عربی ادب، مختلف پیشوں کی اصطلاحات اور عریاں شاعری — اس نے ابن الحجاج کے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں — کے متعلّق اپنی وسیع معلومات کو اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ قصّے کی اصل حقیقت اور وحدت میں بڑی حد تک فرق آ گیا ہے.

مآخذ: (۱) ابوالمطہّر الازدی: حکایۃ ابی القاسم، طبع A. Mez، ہائڈل برگ ۱۹۰۲ء؛ (۲) دخویہ (J. M. de Goeje) در *GGA*، ۱۹۰۲ء، ص ۷۲۳؛ (۳) براکلمان (C. Brockelmann)، در *Literarisches Centralblatt*، ۱۹۰۲ء، ص ۱۵۶۸ ببعد.

(J. HOROVITZ)

---

* **ابوالقاسم:** رک بہ الزہراوی [در آ].

---

* **ابوالقاسم بابُر:** رک بہ تیمور (بنو).

---

* **ابوقُبَیس:** مکۂ معظّمہ کے مشرقی کنارے پر وہ پہاڑ جو مسجد حرام سے چند سو میٹر کے فاصلے پر سطحِ وادی سے یک بیک اس طرح بلند ہو گیا ہے کہ اس سے ساری مسجد نظر آ جاتی ہے؛ چنانچہ خانۂ کعبہ کے رکن الاسود کا رخ ابوقبیس ہی کی جانب ہے اور المسعٰی کے جنوبی کنارے میں کوہ صفا بھی اسی کے دامن میں واقع ہے۔ ابوقبیس کو اب ہر طرف سے عمارتوں نے گھیر رکھا ہے۔ دراصل مکۂ معظّمہ ابوقبیس اور قُعَیْقِعَان کے درمیان آباد ہوا۔ جبلِ قُعَیْقِعان مغرب میں ہے اور ابوقبیس مشرق میں۔ ابوقبیس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں بہت سی روایات منقول ہیں (یاقوت بذیل مادّہ؛ الازرقی، ص ۴۷۷-۴۷۸)۔ بظاہر یہ قبس النار کا اسم تصغیر ہے (یاقوت بذیل مادّہ)۔ ۶۴ھ/۶۸۳ء میں خانۂ کعبہ پر جس منجنیق سے آگ برسائی گئی تھی وہ ابوقبیس ہی پر نصب تھی۔ ازمنۂ متوسطہ میں اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک قلعہ بھی بنا ہوا تھا، گو اب یہاں ایسے کوئی استحکامات موجود نہیں۔ سنوسی سلسلے کا پہلا زاویہ ۱۲۵۲-۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء میں ابوقبیس ہی پر تعمیر ہوا تھا۔ سنوک ہرخرونیہ (Snouck Hurgronje) کے زمانے میں اس کی ڈھلانوں پر ایک نقشبندی ادارہ بھی موجود تھا (*Mekka*، ۲: ۲۸۵؛ نیز دیکھیے النووی: تہذیب، ۲: ۱۰۸-۱۱۰).

(G. RENTZ [و ادارہ])

---

* **ابوقُرّہ:** تھیوڈور (Theodore)، حرّان کے عیسائی ملکی (Melkite) فرقے کا اسقف، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اوّلیں نامور عیسائی ادیب ہے جس نے عربی زبان میں کچھ کتابیں تصنیف کیں۔ وہ ۷۴۰ء کے قریب الرُّھا (اورفہ، Edessa) میں پیدا ہوا اور فوت یقیناً ۸۲۰ء کے قریب ہوا ہوگا۔ وہ اپنی تصنیفات میں اپنے آپ کو یوحنّا [یحییٰ] الدمشقی (م ۷۴۹ء) کا شاگرد ظاہر کرتا ہے، لیکن اس امر کے باوجود کہ اس نے نوعمری میں فلسطین کی خانقاہ سینٹ سبا (St. Saba) ہی میں تعلیم حاصل کی تھی یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ فی الواقع یوحنّا دمشقی کا شاگرد تھا، تاہم یوحنّا کی طرح اس کا نام بھی ان شروع کے عیسائی مصنّفوں میں شامل ہے جنھوں نے کوشش کی کہ اپنی تصنیفات میں اسلام کے مقابلے میں عیسائیت کی حمایت کریں... ۔ اس نے اپنی مادری زبان سریانی

کے علاوہ یونانی اور عربی میں بھی قلم اٹھایا۔ اس کی تصنیفات کی حیثیت زیادہ تر مناظرانہ ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں حرّان کا شہر زبردست علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز تھا، جن میں اصنام پرست، مانی کے پیرو، یہودی، مسلمان، اور راسخ العقیدہ اور غیر راسخ العقیدہ عیسائی، سب ہی حصّہ لیتے تھے۔ اس کے جو رسالے موجود ہیں ان میں وہ جملہ مخالفانہ تعلیمات کے مقابلے میں اپنے قدیم مسیحی عقائد کی حمایت کرتا ہے۔ اس کے یونانی رسائل کی تدوین Migne نے کی ہے (*Patr. Gr.*، ج ۹۷) اور عربی رسائل کو Constantine Bacha نے مرتّب کیا ہے (*Oeuvres arabes de Théodore Aboucara, éve-que de Haran*، بیروت، بدون تاریخ)، اگرچہ جو رسائل ان سب مجموعوں میں شامل کیے گئے ہیں ان کے معتبر ہونے میں کلام ہے (دیکھیے Peeters، در *Acta Bollandiana*، ۱۹۳۰ء، ص ۹۴ و H. Beck، در *Orientalia christiana analecta*، ۱۹۳۷ء، ص ۴۰ ـ ۴۳).

مآخذ: (۱) Michael Syrus: *Chronique*، ۳: ۲۹ ـ ۳۴؛ (۲) C. Bacha، در مشرق، ۱۹۰۳ء، ص ۶۳۳ ـ ۶۳۶؛ (۳) G. Graf: *Gesch. d. christl. arab. Lit.*، ۲: ۷ ـ ۲۶؛ (۴) وہی مصنّف: *Die arabischen Schriften des Theodor Abu Qurra*، Paderborn ۱۹۱۰ء؛ مسلمانوں کے خلاف مذہبی مباحثوں میں اس نے جو حصّہ لیا اس کا تذکرہ ذیل کی کتابوں میں آیا ہے: (۶) A. Palmieri: *Die Polemik des Islam*، ص ۱۸ بعد؛ (۷) G. Güterbock: *Der Islam im Licht der byzantinischen polemik*، ۱۹۱۲ء، ص ۱۵ بعد؛ (۸) I. Kratschkovsky، در *Khristianskij Vostok*، ۱۹۱۶ء، ص ۳۰۱ ـ ۳۰۹؛ (۹) A. Guillaume، در صد سالہ ضمیمۂ *JRAS*، ۱۹۲۴ء، ص ۲۳۳ ـ ۲۴۴؛ (۱۰) C. H. Becker: *Islamstudien*، ۱: ۴۳۴ بعد؛ (۱۱) W. Eichner، در *Isl.*، ۱۹۳۶ء، ص ۱۳۶ بعد.

(A. JEFFERY جیفری)

---

* **ابو قَلَمَّس:** رکّ بہ قَلَمَّس.

---

* **ابو قَلَمُون:** اصل میں اس کے معنی ایک ایسے کپڑے کے ہیں جس میں ایک مخصوص چمک ہوتی تھی؛ اس کے بعد ایک قیمتی پتھر کے معنی ہوئے، پھر ایک پرندے کے اور پھر ایک گھونگھے کے۔ اس لفظ کی اصل یقینی طور پر معلوم نہیں۔ عرب ماہرین کا بالاتفاق یہ کہنا کہ ابوقلمون بوزنطی مصنوعات میں سے تھا ظاہر کرتا ہے کہ یہ کسی یونانی لفظ سے مشتق ہے۔ کتاب التَّبَصُّر بالتجارۃ (*MMIA*، ۱۹۳۲ء، ص ۳۳۷؛ *Arabica*، ۱۹۵۴ء، ص ۱۵۸، ۱۶۲) میں ابوقلمون کو ایک قیمتی بوزنطی کپڑا بتایا گیا ہے۔ H. L. Fleischer (*De Glossis Hab-ichtianis*، لائپزگ ۱۸۳۶ء، ص ۱۰۶) کے کہنے کے مطابق، جس کا تتبع ڈوزی (Dozy) نے بھی کیا ہے (*Suppl.*، ۱: ۸۵،۶) یہ یونانی لفظ ὑποηάλαμον سے مشتق ہے، جس کے معنی دھاری دار کپڑے کے کیے جاتے ہیں۔ دساسی (S. de. Sacy) نے یہ تجویز کیا ہے کہ یہ لفظ یونانی χαμαιλέων سے ماخوذ ہے، جس کے معنی گرگٹ کے ہیں اور جو رنگ بدلنے میں ضرب المثل ہو گیا ہے (*Chrest. arabe*، ۳: ۲۶۸)؛ لیکن نہ تو لغت کی کتابوں میں سے کوئی کتاب اور نہ الجاحظ اور الدّمیری اس سے واقف معلوم ہوتے ہیں کہ ابوقلمون گرگٹ کا نام ہے (اگرچہ برہان قاطع کے مطابق یہ لفظ فارسی میں یہ معنی رکھتا ہے)۔ ضرب المثل: ''ابوقلمون سے زیادہ بدلنے والا'' [اَحْوَلُ مِن ابوقلمون]، یا ''ابو براقش سے زیادہ بدلنے والا [اَحْوَلُ من ابی براقش] (مثلاً فرایتاغ (Freytag): *Proverbia*، ۱: ۴۰۹؛ الہمذانی: مقامات، بیروت ۱۹۲۴ء، ص ۸۶؛ ابن حزم: طوق، ص ۶۹؛ قب *And.*، ۱۹۵۰ء، ص ۳۵۳) میں گرگٹ یا وہ رنگ بدلنے والا پرندہ، جسے ابو براقش کہتے ہیں، دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں (قب القزوینی: طبع وسٹنفلٹ، ۱: ۴۰۶)۔ اس کے علاوہ المقدسی کے کہنے کے مطابق (ص ۲۴۰ ـ ۲۴۱؛ طبع و ترجمہ از Pellat، ص ۵۳ و عدد ۱۴۳) ابوقلمون سے مراد ایک گھونگھا (Pinna) ہے، جس کی ''داڑھی'' (byssus) ایک چمک دار کپڑا بنانے کے کام آتی تھی۔ اس کپڑے کو صُوف البَحر بھی کہتے ہیں (قب ڈوزی: *Suppl.*، بذیل مادّہ)۔ P. Kraus (*Jābir Ibn Ḥayyān*، ۲: ۱۱۰) یونانی لفظ χαμαιλέων کی بابت کہتا ہے کہ وہ پارس پتھر (Philosopher's Stone) کا نام ہے اور یہ نام قدیم علم الکیمیا میں مستعمل تھا (قب Lippmann: *Entstehung.... Alchemie*، ۱: ۲۹۸)۔ اس استعمال سے اس کا سبب واضح ہو جاتا ہے کہ جابر نے اپنی ایک کتاب کا نام، جس میں اس نے سات دھاتوں (اجساد) کے مختلف رنگوں سے بحث کی ہے، کتاب ابی قلمون کیوں رکھا (P. Kraus: کتاب مذکور، ۱: ۲۴؛ قب Ruska، در *Isl.*، ۱۹۲۵ء، ص ۱۰۲ حاشیہ).

مآخذ: متن مقالہ میں جو حوالہ جات دیے گئے ہیں ان کے علاوہ (۱) الاِصْطَخْری، ص ۴۲؛ (۲) G. Jacob: *Studien in arab. Geog.*، ۲: ۶۱؛ اور وہ حوالے جو (۳) P. Kraus: *Jābir ibn Ḥayyān*، ۲: ۱۰۹، عدد ۴، میں دیے ہوئے ہیں.

(A. J. W. HUISMAN)

---

* **ابو قِیر:** یا بُوقِیر، بحیرۂ روم کے ساحل پر ایک چھوٹا سا قصبہ، جو اسکندریہ سے رشید (Rosette) جانے والی ریلوے لائن پر اسکندریہ سے ۱۵ میل مشرق میں واقع ہے۔ الادریسی اوّلین عرب جغرافیہ نویس تھا جس نے ابوقیر کا محلِ وقوع بیان کیا ہے، لیکن اس سے پہلے مصرِ قدیم کے متعلّق عربی میں جو کتابیں تصنیف ہوئیں ان میں اس مقام پر روشنی کے ایک منار کی تعمیر کا ذکر آتا ہے۔ یورپ کے

سیاحوں نے اس قسم کے برجوں کا ذکر کیا ہے جو اس راستے میں جگہ جگہ قائم تھے اور مسافروں کی رہنمائی کرتے تھے۔ سعید بن البطریق (Eutychius) نے اس بحری بیڑے کا ذکر بھی کیا ہے جو فاطمیوں کے خلاف مصر کی حفاظت کے لیے طَرسُوس سے بطور کمک ابو قیر روانہ کیا گیا تھا۔ علی پاشا مبارک نے بھی ایک مآخذ کے حوالے سے، جس کا پتا نہیں چل سکا، لکھا ہے کہ ۲۷ شعبان ۷۶۴ھ/ ۱۱ جون ۱۳۶۳ء کو یورپ کے بحری قزاقوں نے ابو قیر پر حملہ کیا اور ساٹھ باشندوں کو پکڑ کر لے گئے، جنھیں انھوں نے صَیدا میں بیچ دیا۔ ابو قیر کی شہرت [نپولین] بونا پارٹ کی مہم سے وابستہ ہے؛ ایک تو اس فتح کے باعث جو انگریز امیر البحر نیلسن (Nelson) نے یکم اگست ۱۷۹۸ء کی بحری جنگ میں حاصل کی اور دوسرے اس لیے کہ ۲۵ جولائی ۱۷۹۹ء کو ساری کی ساری ترکی فوج تباہ ہوگئی۔ ابو قیر ہی میں ۸ مارچ ۱۸۰۱ء کو وہ انگریزی فوج اتاری گئی جس نے مصر میں فرانسیسی قبضے کا خاتمہ کیا۔ مارچ ۱۸۰۷ء میں ابو قیر پھر انگریزی افواج کے اقدامات کا مرکز بنا۔ اس وقت ابو قیر میں جہازوں کی لنگر اندازی کا نہایت عمدہ موقع تھا اور ٹھیرنے کے لیے بھی یہ جگہ محفوظ تھی، لیکن خود قصبہ بڑی خراب اور خستہ حالت میں تھا۔

امیلینو (Amélineau) کا غلطی سے یہ خیال تھا کہ اس نے [الیعقوبی کی کتاب الاسباق] *Jacobite Synaxary* میں ابو قیر کا نام دیکھا ہے؛ لیکن اس کتاب میں جس چیز کا ذکر ہے وہ قدیم قاہرہ کا ایک گرجا تھا، جسے اپا کیروس (Apa Kyros) کی نذر کیا گیا تھا۔

کوم (Étienne Combe) نے اسکندریہ سے رشید جانے والی شاہراہ اور ساحلی جھیلوں کا بھی تفصیلی مطالعہ کیا ہے اور عرب مصنّفوں اور مغربی سیاحوں کی لکھی ہوئی کتابوں کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ اس کی تصنیف میں ابو قیر کا نام مختلف شکلوں میں ملتا ہے اور اس کے دشوار گزار سفر کا روکھا پھیکا بیان بھی، یعنی مسافر کو ایک بے آب و گیاہ اور غیر آباد ریگستانی علاقے سے گزرنا پڑتا تھا، جس میں کہیں کہیں کھجوروں کے کچھ پیڑ دیکھ کر طبیعت میں بشاشت پیدا ہوجاتی ہے۔ مغرب سے مشرق آتے ہوئے جو تین جھیلیں راستے میں پڑتی ہیں ان کے نام علی الترتیب مَرْیُوط، ابوقیر، اور اِدْکُو تھے۔ ابو قیر کی جھیل کا واحد بیان، جو ذرا مفصل ہے، القلقشندی کی کتاب صبح الاعشٰی میں آیا ہے، لیکن وہ اس علاقے کی خوشحالی کا ذکر محض ایک قصۂ پارینہ کے طور پر کرتا ہے۔ جھیل کے کنارے کچھ پرندوں نے اپنا مسکن بنا رکھا تھا اور اس کے پانی کے اندر مچھلیاں بھری پڑی تھیں۔ لوگ یہاں بُوری مچھلی (mullet) پکڑتے اور اسکندریہ لے جاتے تھے، جو گویا اسکندریہ کی غذا کا ایک جُز تھی۔ کناروں پر نمک سازی کے کچھ بڑے بڑے قطعات تھے، جن کی پیداوار یورپ کو بھیجی جاتی تھی۔

جھیل ابو قیر اور جھیل مریُوط کے درمیان ایک مضبوط سنگ بستہ راستہ حائل تھا؛ محمودیہ کے شہر اور قاہرہ سے اسکندریہ جانے والی ریلوے لائن اسی راستے کے ساتھ ساتھ تعمیر ہوئی۔ ۱۸۸۷ء سے جھیل ابو قیر کا پانی خشک کر دیا گیا اور زمین پر کاشت ہونے لگی۔

مآخذ: ابن عبدالحکم (طبع ٹوری Torrey) ص ۴۰؛ (۲) سعید بن البطریق (Eutychius)، ۲:۸۱؛ (۳) المَقْرِیزی: خِطَط، *MIFAO*، ۴۶: ۸۲؛ (۴) Amélineau: *Synaxaire, Pátrologia orientalis*، ۳: ۴۰۴؛ (۵) Amélineau: *Géographie*، ص ۶، ۵۷۹، ۵۸۱؛ (۶) U. Monneret de Villard، در *Bulletin de la société de géographie d' Égypte*، ۱۳: ۷۴، ۷۶؛ (۷) E. Combe: *Alexandrie musulmane*، در *Bulletin de la société géographie d' Égypte*، ۱۵: ۲۰۱، ۲۳۸ و ۱۶: ۱۱۱ – ۱۷۱، ۲۶۹ – ۲۹۲؛ (۸) Dehérain: *L' Égypte turque, Hist. de la nation-égyptienne*، ۵: ۲۷۵، ۲۷۷، ۲۸۱ – ۲۸۵، ۳۳۳، ۴۴۰، ۴۴۵، ۵۱۸ – ۵۱۹، لوحہ ۱۱؛ (۹) Durand و Viel: *Les campagnes navales de Mohammed Aly*، ۱: ۴۹، ۶۳، ۶۵، لوحہ ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۹۔

مصر میں بعض دوسرے غیر اہم مقامات کا نام بھی ابو قیر ہے، تاہم ان میں جبل الطَّیر (''پرندوں کا پہاڑ'') کا تنگ درّہ (بُوقیران، بُوقیرات) قابلِ ذکر ہے، جو وسطی مصر میں مِنیَہ کے شمال میں واقع ہے۔ عرب مصنّف اس مقام کے بارے میں ایک تعجب خیز کہانی بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ سال کے ایک مقررہ دن اس پہاڑ پر بُوقیر نام کے پرندے اکٹھے ہوا کرتے تھے اور اپنے اپنے سر اس پہاڑ کی ایک درز میں ڈال دیتے، جو آپ ہی آپ کسی ایک پر بند ہوجاتی۔ یوں وہ پرندہ وہیں لٹکا رہ جاتا اور آخر کار مر جاتا [یاقوت: معجم، ۲: ۲۱ – ۲۳]۔

مآخذ: (۱) J. Maspero و Wiet: *Matériaux pour servir á la géographie de l' Égypte*، در *MIFAO*، ۳۶: ۶۴ – ۶۶۔

(G. WIET)

ابو کالِیجار: المَرْزُبان بن سلطان الدولہ، بُوَیہی خاندان [رکّ بآن] کا ایک شاہزادہ، جو شوّال ۴۰۰ھ/ مئی - جون ۱۰۰۹ء میں بصرے میں پیدا ہوا۔ ۴۱۲ھ/۱۰۲۱ء میں جب امیر مشرّف الدولہ کی دَیلمی فوج نے اس کے وزیر کو الاہواز کے مقام پر قتل کر ڈالا اور مشرّف الدولہ کے بھائی سلطان الدولہ کی امارت کا اعلان کر دیا تو سلطان الدولہ کی، جسے مشرّف الدولہ نے ایک سال پہلے عراق کی حکومت سے نکال دیا تھا، ہمت بندھ گئی اور اس نے اپنے بیٹے ابو کالیجار کو، باوجودیکہ اس کی عمر اس وقت صرف بارہ برس تھی، ان کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ اس کے نام پر شہر کو اپنے قبضے میں لے لے؛ لیکن اگلے سال مشرّف الدولہ اور سلطان الدولہ میں سمجھوتا ہوگیا۔ مشرّف الدّولہ نے صرف عراق پر اپنا قبضہ رکھا اور فارس اور خوزستان سلطان الدّولہ کے ہاتھ آ گئے؛ سلطان الدولہ نے شوال ۴۱۵ھ/ دسمبر ۱۰۲۳ء - جنوری ۱۰۲۴ء میں وفات پائی، جس پر آئندہ دو سال تک ان صوبوں کی حکومت ابو کالیجار (جس کی عمر اس وقت سولہ سال سے بھی متجاوز

نہ تھی) اور اس کے ایک دوسرے چچا ابوالفوارس حاکم کرمان کے درمیان بنائے مخاصمت بنی رہی۔ بالآخر فتح ابوکالیجار کی ہوئی، گو جہاں تک ابوالفوارس کو کرمان سے خارج کرنے کا تعلّق تھا وہ اس میں ناکام رہا؛ لہٰذا ۴۱۸ھ/۱۰۲۷ء میں جب ان میں باہم صلح ہوگئی تو اسے مجبوراً ابوالفوارس کو ۲۰,۰۰۰ درہم سالانہ بطورِ خراج ادا کرنا پڑے۔

یہ مصروفیتیں تھیں جن کی وجہ سے ابوکالیجار لشکرِ بغداد کی اس دعوت کو قبول نہ کرسکا تھا کہ اپنے تیسرے چچا جلال الدولہ [رکن بآن] کو، جو مشرّف الدّولہ کی وفات (ربیع الثانی ۴۱۶ھ/جون ۱۰۲۵ء) پر دارالسلطنت میں حاضر ہونے سے قاصر رہا تھا، بغداد سے نکال دے اور خود امیر الامراء بن جائے، بایں ہمہ اٹھارہ ماہ تک (شوال ۴۱۶ھ/دسمبر ۱۰۲۵ء تا جمادی الاولٰی ۴۱۸ھ/جون۔جولائی ۱۰۲۷ء) بغداد میں اسی کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا رہا۔ ۴۱۷ھ/۱۰۲۶ء میں کوفے میں بھی اس کا نام خطبے میں شامل ہوگیا۔ اگلے سال اس نے اپنے وزیر ابن بابشاذ کو عراق بھیجا کہ فرات کے دلدلی علاقوں پر اس کی حکومت قائم کردے، لیکن اس اقدام کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہ ہوا کہ مقامی باشندے وزیر مذکور کی دست درازیوں سے تنگ آگئے اور انھوں نے بغاوت کردی۔ ۴۱۹ھ/۱۰۲۸ء میں ابوکالیجار نے دیلمیوں اور جلال الدولہ کی محافظِ قلعہ ترکی فوج کی باہم کشمکش میں بروقت مداخلت سے بصرے پر قبضہ کرلیا۔ پھر جب ابوالفوارس فوت ہوگیا تو اس نے کرمان کو بھی اپنی مملکت میں شامل کرلیا؛ البتہ ۴۲۰ھ/۱۰۲۷ء میں جب اس نے واسط پر قبضہ کیا تو جلال الدولہ نے انتقام کے طور پر الاہواز کو تاخت وتاراج کرڈالا اور پھر ربیع الاوّل ۴۲۱ھ/اپریل ۱۰۳۰ء میں تین دن کی لڑائی کے بعد جب ابوکالیجار کو شکست فاش ہوئی تو جلال الدولہ نے ازسرِنو واسط اور دلدلی علاقے بھی واپس لے لیے بلکہ کچھ دنوں کے لیے اس کی فوجیں بصرے پر بھی قابض رہیں، گو ابوکالیجار کی فوج نے اسے جلد ہی واپس لے لیا اور پھر اسی سال شوال/اکتوبر میں اس نے المَذار کے مقام پر جلال الدولہ کو جوابی شکست دی۔

آئندہ پانچ سال کے دوران میں جلال الدولہ کو اپنے ترکی سپاہیوں کی پے درپے بغاوتوں کے باعث کئی بار بغداد سے بھاگ جانا پڑا، چنانچہ اس قسم کے دو موقعوں پر (۴۲۳ھ/۱۰۳۲ء اور ۴۲۸ھ/۱۰۳۷ء) میں ان کے ایما پر دارالسلطنت میں بجائے جلال الدولہ کے ابوکالیجار ہی کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ ان میں سے دوسرے موقع پر ابوکالیجار نے ترکی سپہ سالار اِعلٰی کی مدد کے لیے اپنی فوج کا ایک دستہ بھی بھیجا، جس نے واسط کو پھر سے فتح کیا اور چند مہینے اس پر قابض بھی رہا۔ دوسری جانب ۴۲۴ھ/۱۰۳۳ء کے بیشتر حصّے میں بصرے پر جلال الدولہ ہی کی فوجیں قابض تھیں، جہاں اسی کے نام کا خطبہ بھی پڑھا جاتا رہا، لیکن اس قسم کے جارحانہ اقدامات سے چونکہ کسی فریق کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، لہٰذا ۴۲۸ھ/۱۰۳۷ء میں جب جلال الدولہ نے واسط دوبارہ فتح کیا تو چچا اور بھتیجے میں باقاعدہ صلح ہوگئی اور انھوں نے عہد کیا کہ آئندہ ایک دوسرے کے درپے آزار نہیں ہوں گے۔

۴۳۱ھ/۱۰۳۹ء میں ابوکالیجار والیِ بصرہ کی سرکوبی میں مشغول رہا؛ ابن مُکْرَم والیِ عمان بھی، جسے والی مذکور نے تنگ کر رکھا تھا، اس کا شریک تھا۔ اسی سال کے آخر میں اور پھر ۴۳۳ھ/۱۰۴۱-۱۰۴۲ء میں ابوکالیجار مجبور ہوگیا کہ عُمان پر لشکر کشی کرے تاکہ ان فتنوں کا سدِّ باب ہوسکے جو مُکرم کی موت کے بعد رونما ہوگئے تھے۔ ۴۳۳ھ میں جب ابوکالیجار نے اس نزاع میں جو کاکُوَیہ (کاکُوَیہ) خاندان کے حکمران علاء الدولہ کے بیٹوں کے درمیان رونما تھا دخل دینے کی کوشش کی تو اس میں اسے کامیابی نہیں ہوئی، البتہ ۴۳۴ھ/۱۰۴۲-۱۰۴۳ء میں وہ کرمان پر سلجوقوں کا اولیں حملہ روکنے میں کامیاب رہا۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد ۴۳۵ھ/۱۰۴۴ء میں جلال الدولہ کا انتقال ہوگیا۔ ابتدا میں اگرچہ بغداد کی قلعہ نشین فوج نے اس کے بیٹے الملک العزیز [رکن بآن] کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا، لیکن ابوکالیجار کی طرف سے بیش قرار انعام واکرام کے وعدے پر یہ فوج اس کی طرفدار ہوگئی، چنانچہ صفر ۴۳۶ھ/ستمبر ۱۰۴۴ء میں وہ بغداد ہی میں نہیں بلکہ حُلوان، فرات کے علاقوں اور دیاربکر میں بھی امیر تسلیم کرلیا گیا، جہاں اب اسی کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ ابوکالیجار اب واحد بویہی حکمران تھا اور خلیفہ کی طرف سے اسے محی الدین کا لقب عطا ہوا۔

آئندہ چار سال ابوکالیجار کی توجہ زیادہ تر اس پر رہی کہ سلجوق ترکوں کی یورشوں کے خلاف اپنی طاقت برقرار رکھے، جس کے پیشِ نظر اس نے پہلے ہی سے دارالخلافہ شیراز کے اردگرد پہلی مرتبہ ایک فصیل کی تعمیر شروع کردی تھی؛ ۴۳۷ھ/۱۰۴۵-۱۰۴۶ء میں البتہ وہ جنوب مغربی جبال میں سلجوقی حملے کا سدِّ باب کرنے سے محض اس لیے قاصر رہا کہ اس کے گھوڑے وبا کی نذر ہوگئے تھے؛ لیکن اس سے دو سال بعد اس نے سلاجقہ سے اتحاد کا فیصلہ کرلیا، جس پر طغرل [رکن بآن] بھی رضامند تھا؛ لہٰذا باہم ایک معاہدہ ہوا اور اس کی توثیق یوں کردی گئی کہ طغرل کی شادی ابوکالیجار کی بیٹی سے اور ابوکالیجار کے دوسرے بیٹے کی طغرل کی بھتیجی سے ہوگئی۔ اس اتحاد سے ابوکالیجار کے شمال مغربی مقبوضات سلجوقوں کے مزید حملوں سے محفوظ ہوگئے، لیکن ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء میں پھر ایک سلجوقی فوج نے کرمان پر حملہ کردیا جہاں ابوکالیجار کا صوبہ دار بجائے مدافعت کے حملہ آوروں سے مل گیا؛ لہٰذا ابوکالیجار کو اپنی حکومت بحال کرنے کی غرض سے خود کرمان کا رخ کرنا پڑا، لیکن ابھی وہ منزل مقصود پر نہیں پہنچا تھا کہ جمادی الاولٰی ۴۴۱ھ/اکتوبر ۱۰۴۸ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔

ابوکالیجار نے کم از کم نو بیٹے چھوڑے، جن میں سے سب سے بڑا، جس کا لقب الملک الرحیم [رکن بآن] تھا، بطور امیر الامراء اس کا جانشین ہوا۔ وہ اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا، جس نے بغداد اور عراق پر حکومت کی؛ دوسرا بیٹا فولاد سلطان فارس میں اس کا جانشین ہوا، لیکن ۴۵۴ھ/۱۰۶۲ء میں ایک باغی کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔

۴۲۹ھ میں جب ابوکالیجار شیراز میں تھا تو اس نے اور اس کی دیلمی فوج کے کئی دستوں نے فاطمی داعی المؤیّد فی الدین [رکّ بآن] کی کوشش سے اسمٰعیلی مذہب اختیار کرلیا تھا، مگر اس کے چار سال بعد اس خیال سے کہ عباسی خلیفہ القائم سے اس کے تعلّقات خوشگوار ہونا چاہییں اس نے داعی مذکور کو اپنے علاقے سے نکال دیا؛ تاہم ان واقعات کے باوجود جو مؤخر الذکر کی سیرۃ (طبع کامل حسین، قاہرہ ۱۹۴۹ء، ص ۷۷) میں مذکور ہیں، ظاہر ہوتا ہے کہ ذاتی طور پر وہ فاطمی دعوت کا معتقد رہا۔ ابوکالیجار اور المؤید کی باہمی راہ و رسم کا ذکر ابن البلخی نے بھی فارس نامہ میں کیا ہے۔

مآخذ: (۱) ابن الأثیر، بہ اِمداد اشاریہ؛ (۲) ابن الجوزی: المُنتَظم، ۷: ۱۷، ۲۱، ۳۰، ۳۷، ۵۶ـ۶۹، ۷۲ـ۷۳، ۱۱۹، ۱۲۸، ۱۳۶، ۱۳۹؛ (۳) سبط ابن الجوزی: مرآۃ الزمان (مخطوطۂ پیرس، شمارہ ۱۵۰۶، ورق ۲ب، ۷۴ب، ۸۷ب) [مطبوعۂ حیدرآباد ۱۹۵۱ء]؛ (۴) حمد اللہ مستوفی: تاریخ گزیدہ، ص ۹۲؛ (۵) ابن خلدون، ۴: ۴۷۲ ببعد؛ (۶) میرخواند: روضۃ الصفا (اقتباس مطبوعۂ Wilken، بعنوان *Mirchonds Geschichte der Sultane aus dem Geschlechte Bujeh*، برلن ۱۸۳۵ء، ص ۴۵ـ۷۴)؛ (۷) خواندامیر: حبیب السِّیَر (اقتباس شائع کردۂ Ranking)، بعنوان *A History of the Minor Dynasties of Persia*، ۱۹۱۰ء، ص ۱۱۸ـ۱۲۰؛ (۸) H. Bowen: *The Last Buwayhids*، در *JRAS*، ۱۹۲۹ء، ص ۲۲۶ ببعد.

(H. BOWEN)

* **ابوکامل شُجاع**: بن اَسلَم بن محمد بن شجاع الحاسب المصری، محمد بن موسٰی الخوارزمی [رکّ بآن] کے بعد جبر و مقابلہ کا دوسرا قدیم ترین مسلمان عالم، جس کی تصنیفات میں سے کچھ باقی ہیں اور جن کی بنا پر اسے اسلامی [لہٰذا سارے] قرون وسطٰی کے عظیم ترین ریاضی دانوں میں جگہ دی جا سکتی ہے (اسلامی جبر و مقابلہ کے نشو و نما کے لیے رکّ بہ مادّۂ الجبر والمقابلہ)۔ پیزا (Pisa) کے لیونارڈ (Leonard) اور اس کے متّبعین کے ذریعے اس سے یورپ میں جبر و مقابلہ کے نشو و نما نے اچھا خاصا اثر قبول کیا۔ اس کی ہندسی (geometrical) تصنیفات (مسائل ہندسہ کا حل جبر و مقابلہ کے ذریعے) کا اثر بھی مغربی علم الہندسہ پر کچھ کم نہیں۔ اس کے سوانح حیات بہت کم معلوم ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا زمانہ الخوارزمی (م حدود ۸۵۰ء) سے متأخّر اور علی بن احمد العمرانی (م ۳۴۴ھ/ ۹۵۵ـ۹۵۶ء) سے متقدم ہے، جس نے اس کے جبر و مقابلہ کی شرح لکھی [یعنی دسویں صدی کا آغاز۔ اس کا وطن مالوف مصر ہے].

الفہرست، ص ۲۸۱، میں علم نجوم اور علم ریاضی پر، نیز بعض دوسرے موضوعات مثلاً پروازِ طیور وغیرہ پر بھی اس کی متعدد کتابوں کی فہرست موجود ہے۔ ان میں سے دو، یعنی کتاب فی الجمع والتفریق (الفہرست میں اسی عنوان کی ایک تصنیف الخوارزمی سے منسوب ہے) اور کتاب الخَطَئَین (''دو غلطیاں'')، اس وقت سے طول طویل بحث کا موضوع بنی رہی ہیں جب سے کہ F. Woepcke (در *JA*، ۱۸۶۳ء، ص ۵۱۴) نے الجمع والتفریق اور لاطینی *Liber augmenti et diminutionis* کو جو *augmentum et diminutio*، طبع لبری (Libri)، در *Histoire des sciences mathématiques en Italie*، پیرس ۱۸۳۸ء، ص ۲۵۳ـ۲۹۷؛ طبع دوم، ۱۸۶۵ء، ص ۳۰۴ـ۳۶۹، کو ایک ہی چیز ثابت کرنے کی کوشش کی؛ قبّ زُوتر (H. Suter) در *Bibl. Math.*، ۱۹۰۲ء، ص ۳۵۰ـ۳۵۴ و J. Ruska: *Zur ältesten arab. Algebra und Rechenkunst*، در *SBAK*، ہائڈل برگ ۱۹۱۷ء/ ۲، ص ۱۴ـ۲۳.

الفہرست میں جن تصنیفات کا ذکر ہے ان کا کوئی عربی نسخہ نہیں ملتا، البتہ اس کی ایک اور تصنیف الطوائف [فی الحساب] کی عربی اصل محفوظ ہے (مخطوطۂ لائڈن، عدد ۱۰۰۱، ورق ۵۰ب ـ ۵۸ب)، ترجمہ و حواشی از H. Suter: *Das Buch der Seltenheiten der Rechenkunst von Abū Kāmil al-Miṣrī*، در *Bibl. Math*، ۱۹۱۰ـ۱۹۱۱ء، ص ۱۰۰ـ۱۲۰۔ اس کا موضوع ہے غیر مقطع مساواتوں (equations) کے تکملی حل (integral solutions)؛ (جدید اصطلاح میں ''Diophantine analysis''، مگر یہ اصطلاح تاریخی لحاظ سے غلط ہے۔ ڈیوفانٹوس (Dio-phantus) کو، جس کا زمانہ تیسری صدی عیسوی ہے اور جسے، جہاں تک یونانی دنیا کا تعلّق ہے، غیر مقطع تحلیل کا موجد ٹھیرانا پڑے گا، دلچسپی تھی تو اپنے مسائل کے ناطقی (rational) نہ کہ تکملی (integral) حل سے)۔ الطرائف کا ایک عبرانی ترجمہ بھی موجود ہے (میونخ ۲۲۵، ۴)، جو مانتوا (Mantua) کے Mordekhai Finzi (حدود ۱۴۶۰ء) نے کیا تھا۔ وہ جبر و مقابلہ میں ابو کامل کے رسائل کا مترجم بھی ہے (میونخ ۲۲۵، ۳)۔ جیسا کہ ساکردوتے (G. Sacerdote): *Il trattato del pentagono e del decagono di Abu Kámil*، در *Festschrift Steinschneider*، لائپزگ ۱۸۹۶ء، ص ۱۶۹ـ۱۹۴، کا خیال ہے، اور زُوتر (Suter): *Die Abhandlung des Abū Kāmil Shoğā b. Aslam über das Fünfeck und Zehneck*، در *Bibl. Math.*، ۱۹۰۹ـ۱۹۱۰ء، ص ۱۵ـ۴۲، نے ثابت کیا ہے کہ یہ ترجمے عربی یا لاطینی کے بجائے ہسپانوی سے کیے گئے ہیں۔ بقول زُوتر (Suter) عین ممکن ہے کہ مخطوطۂ پیرس، ۷۳۷۷ الف، عدد ۶، الطرائف کا لاطینی ترجمہ ہو۔ (اسی مخطوطے میں ابو کامل کے جبر و مقابلہ اور پنج اضلاع (pentagon) اور دہ اضلاع (decagon) اشکال پر اس کے رسالوں کے لاطینی ترجمے شامل ہیں)۔ جہاں تک غیر مقطع مساوات اور ان کے تکملی حل کا تعلّق ہے ہندوستان میں ان کی پوری ارتقا یافتہ

صورت ۱۱۵۰ء کے قریب ہی بھاسکر کی وِیجگنیتا (Vījaganita) میں ہمارے سامنے آجاتی ہے (قب Colebrooke: *Algebra with arithmetic and mensuration*، لنڈن ۱۸۱۷ء، ص ۲۳۳ - ۲۳۵)، مگر آریہ بھٹ (پیدائش ۴۷۶ء) تو اس سے پہلے بھی اس مسئلے کی طرف اشارہ کر چکا تھا، بلکہ اس نے اس کے حل کے لیے کسور جاریہ (continued fractions) کے قاعدے کا بھی تصوّر قائم کر لیا تھا۔ بھاسکر نے اس کے لیے کُٹّکا (dispersion) کی اصطلاح استعمال کی ہے (قب M. Cantor: *Gesch. d. Math.*، طبع دوم، ۵۸۸ ببعد)۔ ابو کامل کے طریق میں نسبۃً کم باقاعدگی ہے اور اس لیے وہ ہندوستانی طریق سے ادنٰی ہے، کیونکہ ابو کامل اپنے حل زیادہ تر بطریقِ آزمائش معلوم کرتا ہے، گو اس طرح جو دشواریاں پیش آتی ہیں وہ ان پر غالب آنے میں خاصی مہارت ظاہر کرتا ہے، البتہ یہ طے کرنا دشوار ہے کہ آیا اسے ''کُٹّکا'' طریقے کا علم تھا یا نہیں۔ بہرکیف یقینی بات یہ ہے کہ الطرائف کی ایک شرح کا گمنام مصنّف، جس کا صرف ایک ٹکڑا لائڈن کے مخطوطے میں موجود ہے (ورق ۱۰۱ - ۱۰۲)، طریق مذکور سے واقف تھا، کیونکہ وہ صاف طور پر تکملی حل معلوم کرنے کے ایک قاعدے کے ثبوت کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے اور یہ مشکل ہی سے کُٹّکا قاعدے سے مختلف ہو سکتا ہے۔

پھر ایک اَور جزئی مگر عجیب بات، جس سے ابو کامل اور اہلِ ہند کے باہمی تعلّق کا اظہار ہوتا ہے، یہ ہے کہ دونوں اپنے مسائل میں پرندوں کی ایک ہی یا کم از کم ملتی جلتی انواع کی مثالوں سے رجوع کرتے ہیں، چنانچہ یورپ میں بھی جب غیر مقطع مساوات ہمارے سامنے آتی ہیں (پیزا (Pisa) کے لیونارڈ (Leonard) کی *Liber abaci*، مخطوطہ عدد ۱۲۰۲؛ طبع Boncompagni، روم ۱۸۵۷ - ۱۸۶۲ء، جلد ۱) تو یہاں بھی پرندوں کا حوالہ ملتا ہے۔ یہاں اس مسئلے کا علم اوّل اوّل اس مخطوطے کے ذریعے ہوا جسے سنہ ۱۰۰۰ عیسوی کے قریب Reichenau کی خانقاہ میں تالیف کیا گیا تھا۔ متأخّر جبر و مقابلہ دان، خصوصًا جرمن ''Cossists'' (Adam Riese، وغیرہ) پرندوں کے بجائے عمومًا مردوں، عورتوں یا کنواریوں کی مثالیں پیش کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس قسم کے مسائل کے اظہار کے لیے "regula virginum" (یا ''r. potatorum'' یا ''r. coeci'' یا ''r. coeti'') کی اصطلاح اختیار کی ہے (قب *Bibl. Math.*، ۱۹۰۵ء، ص ۱۱۲)۔

ابو کامل کا جبر و مقابلہ لاطینی (مخطوطۂ پیرس، ۷۳۷۷ الف، ورق ۷۱ب - ۹۳ب) اور عبرانی (پیرس ۱۰۲۹، ۷، اور میونخ ۲۲۵، ۵) ترجموں ہی میں محفوظ ہے۔ براکلمان (Brockelmann) نے اصل عربی میں جن دو مخطوطوں کا ذکر کیا ہے ان کی ابھی تک جانچ پڑتال نہیں کی گئی ہے۔ ابو کامل کی شہرت کا انحصار سب سے بڑھ کر اسی تصنیف پر تھا۔ پھر الِاصْطَخْری اور العِمرانی نے اس کی شرحیں لکھی ہیں، لیکن وہ بھی ناپید ہیں۔ L. C. Karpinski کی مفصل تصنیف *The Algebra of Abu Kamil Shoja' ben Aslam*، در *Bibl. Math.*، ۱۹۱۱ - ۱۹۱۲ء، ص ۴۰ - ۵۵، لاطینی کے مخطوطۂ پیرس پر مبنی ہے۔ اس تصنیف کے تاریخی پسِ منظر کے لیے حسبِ ذیل کتابیں ملاحظہ ہوں: O. Neugebauer: *Zur geometrischen Algebra, Quellen und Studien z. Gesch. d. Math., B(Studien)*، ۱۹۳۶ء، ص ۲۴۵ - ۲۵۹ اور S. Gandz: *The Mishnat ha-Middot and the Geometry of Muh. b. Mūsā al-khowārizmī*، وہی کتاب، *A(Quellen)*، ۱۹۳۲ء، خصوصًا ص ۳۷، ۶۸، ۸۳۔ ابو کامل ''جَذْر'' (*radix*، root)، ''مال'' (*census*، capital) اور ''عددِ مفرد'' (*numerus*، absolute number) کی تعریف میں الخوارزمی کی پابندی سے تتبع کرتا ہے، لیکن بعض صورتوں میں وہ اپنے پیشرو سے بہت آگے بھی نکل جاتا ہے، چنانچہ وہ جذور (square roots) کی جمع اور تفریق کو، جن میں صرف مقادیر اصمّ سے سابقہ پڑتا ہے، ان متناسبات کے ذریعے عمل میں لاتا ہے جو ہمارے جدید قاعدے کے مطابق ہیں: $\sqrt{\text{ا}} + \sqrt{\text{ب}} = \sqrt{\text{ا} + \text{ب} + ۲\sqrt{\text{اب}}}$؛ مثلاً ۸ کے جذر کو ۱۸ کے جذر سے تفریق کرنے کا قاعدہ وہ یہ بتاتا ہے: ''۲۴ کو ۲۶ میں سے تفریق کیجیے تو ۲ باقی بچتے ہیں۔ اس کا جذر ۱۸ سے تفریق شدہ ۸ کا جذر ہے''۔ بالکل یہی مثال الکَرَجی [رک بآن] (م حدود ۱۰۲۹ء) کے جبر و مقابلہ پر رسالے، موسومہ الفخری، میں پائی جاتی ہے (دیکھیے F. Woepcke: *Extrait du Fakhri*، پیرس ۱۸۵۳ء، ص ۵۷ - ۵۹)، جب کہ پیزا (Pisa) کا لیونارڈ (Leonard) (*Scritti*، ۱: ۳۶۳ - ۳۶۵) اس قاعدے کی مثال کے ذریعے تشریح کرتے ہوئے ۲۸ اور ۳۲ کے ہندسے استعمال کرتا ہے۔ مکعب جذور کے لیے اسی قسم کا عمل، جیسا کہ الکَرَجی نے دیا ہے، ابو کامل کے ہاں ابھی تک نہیں ملا۔

''پنج اضلاع اور دہ اضلاع اشکال'' پر رسالہ، لاطینی ترجمہ، مخطوطہ پیرس A؛ جرمن ترجمہ از زُوتر (Suter)، قب سطور بالا؛ (عبرانی ترجمہ، میونخ ۲۲۵، ۳؛ اطالوی ترجمہ از Sacerdote، قب سطور بالا)۔ اس رسالے میں جو مسائل بھی آئے ہیں انھیں جبر و مقابلہ کے قاعدوں کو علمِ ہندسہ پر منطبق کرتے ہوئے صاف اور آسان پیرائے میں حل کیا گیا ہے۔ مفروضہ کمیّت کے لیے ابو کامل اپنے سارے رسالے میں خاص مقادیر منتخب کرتا ہے ــــ بیشتر مسائل میں یہ مقدار ۱۰ ہے ــــ اس کے بجائے کہ اسے کسی حرف کے ذریعے ظاہر کرے یا ایک (۱) ہی کے مساوی قرار دے۔ اس باب میں اس نے اپنے آپ کو الخوارزمی کے قاعدے سے آزاد تو نہیں کیا، لیکن مسئلے کے حل میں جو طریقہ اختیار کیا ہے اس میں وہ اپنے پیشرو سے آگے نکل گیا ہے؛ لہٰذا اس کی تصنیف جبر و مقابلہ کے نشوونما میں قطعی طور پر ایک اہم مرحلہ ہے [اس نے گویا اس علم میں الخوارزمی کے کام کی تکمیل کی]۔ ساکردوتے (Sacerdote) نے ثابت کیا ہے کہ پیزا (Pisa) کا لیونارڈ (Leonard) اس رسالے سے واقف تھا اور اس نے اپنی *Practica geo-*

metriae(Scritti، ج ۲) میں اس سے بہت زیادہ کام لیا ہے.

مآخذ: (۱) زُوتر (Suter)، ص ۴۳؛ (۲) براکلمان: تکملہ، ۱: ۳۹۰؛ (۳)M. Steinschneider: *Hebräische Übersetzungen*، ص ۵۸۴-۵۸۸.

(W. Hartner ھارٹنر)

---

* **ابوکَبِیر الہُذَلی:** عرب کا ایک قدیم شاعر اور ابو ذُؤَیب کے بعد قبیلۂ ہُذیل [رکّ بآن] کا سب سے بڑا شاعر۔ وہ بنوسَعْد یا بقول بعض بنوجُریب سے تھا۔ اس کا اصل نام عامر (یا عُوَیمِر) بن الحُلَیس (بغیر الف لام کے بھی) تھا۔ بعض کے نزدیک اس کا نام عامر بن جَمْرہ ہے، لیکن وہ مشہور اپنی کنیت ہی سے ہوا۔ بعض شارحین کا خیال ہے (قبّ التبریزی، در شرح الحماسة) کہ ابوکبیر نے مشہور شاعر تأبّط شرًّا [رکّ بآن] کی ماں سے شادی کر لی تھی، لیکن تأبّط شرًّا کو یہ رشتہ پسند نہیں تھا، لہٰذا کہا جاتا ہے کہ اس کی ماں نے ابوکبیر کو مشورہ دیا کہ جب بھی موقع ملے تأبّط شرًّا کو قتل کر دے۔ یہ دوسری بات ہے کہ تأبّط شرًّا کی دلیری اور بےباکی کے آگے ابوکبیر کی کچھ پیش نہ چلی؛ لیکن اس کہانی کو مشکل ہی سے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ حکایت وضع ہوئی تو اس لیے کہ الحماسة میں مندرج ابوکبیر کے ان اشعار کی تاویل کی جائے جو زبان زدِ خاص و عام ہیں اور جن میں وہ ایک رفیقِ جنگ یا جیسا کہ عربوں کا تصوّر تھا ایک مثالی بطل کا وصف بیان کرتا ہے۔ پھر بعض روایتیں ایسی بھی ہیں جن میں ان کا کردار ادل بدل کر دیا گیا ہے (قبّ ابن قتیبہ: کتاب الشعر، ص ۴۲۲) اور وہ یوں کہ ابوکبیر نے نہیں بلکہ تأبّط شرًّا نے ابوکبیر کی ماں سے شادی کر لی تھی، الخ۔ اسی طرح وہ قصہ بھی جس میں تأبّط شرًّا اور ابوکبیر کو دائمی رفیق بتایا گیا ہے ناقابلِ اعتبار ہے، کیونکہ ابوکبیر کا قبیلہ [تأبّط شرًّا کے قبیلے] بنوفَہْم سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہتا تھا۔ ابوکبیر کا زمانہ چھٹی صدی عیسوی کا اختتام اور ساتویں صدی کا آغاز ہے، چنانچہ عزّالدّین ابن الأثیر (اُسْد الغابة، قاہرہ ۱۲۸۰ھ، ۶: ۲۷۲) اور ابن حجر العسقلانی (الإصابة، قاہرہ ۱۳۲۵ھ، ۷: ۱۶۲) نے تو اسے اصحابِ رسول [صلّی اللّٰہ علیہ وسلم] میں شمار کیا ہے.

بایں ہمہ، جہاں تک اس کی نظموں اور ان کے موضوع کا تعلّق ہے، ابوکبیر کا شمار قطعی طور پر شعراے جاہلیت میں ہوگا۔ اس کا دیوان، جسے پہلی مرتبہ F. Bajrakterević نے طبع و ترجمہ کیا، صرف چار طویل قصیدوں اور انیس مختصر قطعات پر مشتمل ہے، جن میں سے بیشتر غلطی سے اس سے منسوب کر دیے گئے ہیں لیکن جو کئی لحاظ سے بہت دلچسپ اور بیش قیمت ہیں۔ قصیدوں کی ایک ہی بحر (کامل) ہے۔ تمہید بھی سب کی، جیسا کہ ابن قتیبہ (الشعر، ص ۴۲۰) نے صراحۃً کہا ہے، یکساں ہے۔ پھر ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کے قصیدوں میں اونٹ کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ عرب نقّادانِ سخن نے ابوکبیر کو اکثر بہت اونچے درجے کا شاعر مانا ہے۔ المعرّی کے نزدیک اس کی نظر بڑی محدود ہے، بایں ہمہ وہ بھی اس کے بعض اشعار کا معترف ہے۔ رہا عَوف بن مُحَلّم (در یاقوت: ارشاد الأریب، ۶: ۹۷) سو اس نے اسے یہاں تک بڑھایا ہے کہ بقول اس کے وہ ہُذیلیوں کا سب سے بڑا شاعر ہے.

مآخذ: (۱) دیوان الهذليين، قاہرہ ۱۹۴۸ء، ۲: ۸۸-۱۱۵؛ (۲) الحماسة، طبع فرایتاغ (Freytag)، ۱: ۳۶ بعد؛ (۳) ابن قتیبہ: کتاب الشعر (طبع دخویہ de Goeje)، ص ۴۲۰-۴۲۵؛ (۴) ابو العلاء المعرّی: رسالة الغفران، قاہرہ ۱۳۲۱ھ، ص ۱۰۰-۱۰۱ (انگریزی ترجمہ از نکلسن)، در JRAS، ۱۹۰۰ء، ص ۴۰۸-۴۰۹؛ (۵) السیوطی: شرح شواهد المغنی، قاہرہ ۱۳۲۲ھ، ص ۸۱-۸۳؛ (۶) عبدالقادر البغدادی: خزانة الادب، بولاق ۱۲۷۷ھ، ۳: ۴۶۶-۴۷۳؛ ۴: ۱۶۵-۱۶۷، ۴۲۰-۴۲۱؛ (۷) العَینی: المقاصد النحوية (بر حاشیۂ خزانة الادب)، ۳: ۵۴-۵۷، ۳۶۱-۳۶۴، ۵۵۸-۵۶۰؛ (۸) اسکندر آغا ابکاریوس: روضة الادب فی طبقات شعراء العرب، بیروت ۱۸۵۸ء، ص ۱۹۲-۱۹۶؛ (۹) محمد باقر: جامع الشواهد، قُم ۱۳۰۸ھ، ص ۶۷-۶۸، ۱۶۷، ۲۷۸-۲۷۹؛ (۱۰) محمد عبدالقادر الفاسی: تکمیل المَرام بشرح شواهد ابن هشام، فاس ۱۳۱۰ھ، ص ۱۸ س ۸، ص ۲۴ س ۱-۳؛ (۱۱) F. Bajrakterevic: *La Lāmiyya d' Abū Kabīr al-Huḏalī, Publiée avec le commentaire d' as-Sukkarī, traduite et annotée*، در JA، ۱۹۲۳ء، ص ۵۹-۱۱۵؛ (۱۲) وہی مصنّف: *Le Dīwān d' Abū Kabīr al-Huḏalī, publié avec le commentaire d' as-Sukkarī, traduit et annoté*، در JA، ۱۹۲۷ء، ص ۵-۹۴؛ (۱۳) براکلمان: تکملہ، ۱: ۴۳.

(Fehim Bajraktarević)

---

* **ابوالکَسِیس:** (Abulcasis = ابوالقاسم): رکّ بہ الزّہراوی.

---

* **ابوکَلْب:** رکّ بہ سِکّہ.

---

* **ابو کَلِی:** (Abu klea) ابوطلیح کی محرّف شکل، جس کا یہ نام ببول (طلیح Acacia Seyal) کے ایک پیڑ کی وجہ سے ہوا۔ یہ کنووں کا ایک مرکز ہے اور اس شاہراہ پر واقع ہے جو دشت بَیُوضہ سے گزر کر دریاے نیل کے اس موڑ کو جو ابو حَمَد کے نام سے مشہور ہے ایک طرف چھوڑتے ہوے دنقلہ (Dangola) کے جنوب میں قُرتی (Korti) سے المَتَمّہ تک ۱۹۱ میل کا فاصلہ طے کر لیتی ہے۔ ابو کلی کی شہرت ۱۷ جنوری ۱۸۸۵ء کی اس جنگ کے باعث ہوئی جو یہاں محمد احمد [رکّ بآن] کے درویشوں اور ۱۸۰۰ سپاہیوں پر مشتمل ایک برطانوی ''صحرائی دستے'' کے درمیان ہوئی۔ یہ دستہ قرتی سے خرطوم جا رہا تھا تاکہ جنرل چارلس گورڈن

(Charles Gordon) اور مصری قلعہ نشین فوج کو پیروانِ مہدی نے جس حصار میں لے رکھا ہے، اسے توڑ دیا جائے۔ انگریزی فوج نے، جس کی کمان سر ہربرٹ سٹیوارٹ (Sir Herbert Stewart) کے ہاتھ میں تھی، یہ دیکھا کہ مہدویوں کے بہترین دستوں کا بہت بڑا حصّہ (تقریباً تین ہزار 'بقارہ' اور پانچ ہزار ''جَعْلِیّن'') کنوؤں پر قابض ہے تو اس نے مربع کردوس قائم کرتے ہوئے پیش قدمی کی۔ مہدویوں کا حملہ بڑے زور کا تھا۔ گھمسان کا رن پڑا اور پھر دست بدست لڑائی کے بعد مہدوی ایک ہزار مقتول چھوڑ کر پسپا ہو گئے۔ برطانوی فوج کے ۷۴ سپاہی کام آئے اور ۹۴ مجروح ہوئے۔ اب المَتَمَّہ تک راستہ صاف تھا۔ یہاں برطانوی فوجوں سے چار دریائی دخانی کشتیاں آملیں، جو گورڈن نے خرطوم سے روانہ کی تھیں، مگر پھر چند دنوں کی مہلک تاخیر کے باعث مہدویوں کو موقع مل گیا کہ وہ خرطوم پر دفعۃً ہلّہ بول کر قابض ہو جائیں (۱۶ جنوری)۔ یوں یہ فوج جو محاصرہ توڑنے آئی تھی ناکام و نامراد واپس چلی گئی۔

مآخذ: (۱) شُقَیر (N. Shoucair): تاریخ السودان، قاہرہ ۱۹۰۳ء؛ (۲) H. E. Colville: *History of the Soudan Campaign*، لنڈن ۱۸۸۹ء (سرکاری فوجی روئداد)؛ (۳) A. B. Theobald: *The Mahdiya*، لنڈن ۱۹۵۱ء؛ (۴) B. M. Allen: *Gordon and the Sudan*، لنڈن ۱۹۳۱ء۔

(S. HILLELSON)

⊗* **اَبُولَہَب:** عبدالمُطّلِب اور لُبْنَی بنت ہاجر الخُزاعیہ کا بیٹا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد کا سوتیلا بھائی تھا۔ اس کا نام عبدالعُزّی اور کنیت ابوعُتْبَہ تھی۔ ابولہب (''شعلے کا باپ'') اس کا لقب تھا، جو اس کے باپ نے اسے اس کی خوبصورتی کی بنا پر دیا تھا [لیکن ربیعہ بن عبادؓ کے بیان کے مطابق ابولہب بھینگا تھا اور اس کے پاؤں میں کجی تھی۔ ابن درید نے ''ابولہب'' کی ایک اور توجیہ کی طرف اشارہ کیا ہے، مگر اسے بیان کرنا پسند نہیں کیا (الاشتقاق، ۲۹)]۔ یہ نام، یعنی ''ابولہب''، قرآن [کریم] کی اللّھب (یا المسد) نام کی ایک سو گیارھویں سورۃ میں آیا ہے، جو اوائل دور مکی سے متعلّق ہے... [ابولہب کا نام مستہزِءون اور مؤذِون میں سرِ فہرست آتا ہے]۔

ایک زمانے میں — [شاید] اس سے پہلے کہ تبلیغ اسلام کی وجہ سے رسول اللہ [صلی اللہ علیہ وسلم] کی مخالفت شروع ہوئی — ابولہب کے تعلّقات آپ [صلی اللہ علیہ وسلم] سے خوشگوار تھے، چنانچہ اس کے بیٹوں عُتبہ اور عُتَیبَہ کا علی الترتیب آنحضرت [صلی اللہ علیہ وسلم] کی صاحبزادیوں رقیہؓ اور امّ کلثومؓ سے نکاح (یا شاید صرف منگنی) ہونا بتایا جاتا ہے۔ [رقیہؓ کا عتبہ سے نکاح ہونا ثابت ہے، اگرچہ عتبہ نے اپنے باپ ابولہب (یا بروایت دیگر اپنی ماں اُمّ جمیل) کے کہنے پر انھیں طلاق دے دی تھی، مگر عتیبہ کو رسول اللہ [صلی اللہ علیہ وسلم] کی پیش گوئی کے مطابق شیر نے مار ڈالا تھا۔ آپ [صلی اللہ علیہ وسلم] نے دعا کی تھی: اَللّٰھُمَّ سَلِّطْ عَلَیْهِ كلبًا من كِلَابِک: ابن حبیب، ص ۵۳؛ ابن قُتَیبہ: المعارف، ص ۵۵، ۶۲؛ ابن سعد، ۸: ۲۴)۔ امّ کلثومؓ کے عتیبہ سے نکاح کے متعلّق مؤرخین میں اختلاف ہے]۔

جس وقت [بنو] ہاشم اور [بنو عبد] المطلب کا قریش کے دوسرے قبائل نے معاشرتی مقاطعہ کیا [اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم شعبِ ابی طالب میں محصور ہو گئے] تو ابولہب نے بھی [بنو] ہاشم سے علیحدگی اختیار کر لی، غالبًا اس لیے کہ ابولہب کا تعلّق اپنی بیوی کے توسّط سے، جو حرب بن امیہ کی بیٹی تھی، عبدشمس [قبیلہ بنو امیّہ] سے تھا۔ ابوطالب کے انتقال پر، یعنی مقاطعے کے خاتمے کے [تقریبًا چھے ماہ] بعد، خاندان کی سیادت ابولہب کے حصّے میں آئی۔ ابتدا میں اس نے شاید کنبے کی عزّت و تحفّظ کی خاطر رسول اللہ [صلی اللہ علیہ وسلم] کی حفاظت کا وعدہ کیا، لیکن وہ آپ [صلی اللہ علیہ وسلم] کی حمایت سے اس وقت دستبردار ہو گیا جب ابوجہل اور عقبہ بن ابی معیط [یا غالبًا عبداللہ بن ابی امیّہ بن المغیرہ] نے اسے اس بات کا یقین دلا دیا کہ آنحضرت [صلی اللہ علیہ وسلم] نے عبدالمطلب جیسے متوفّی اجداد کے بارے میں کہا ہے کہ ان کے لیے جہنّم مقدّر ہو چکی ہے (قبّ قرآن مجید، ۹ [التوبۃ]: ۱۱۴؛ البخاری: جنائز، ۸۱؛ فضائل اصحاب النبی، ۴۰)۔ حفاظت و حمایت سے ابولہب کی دست کشی کے باعث [یا مشرکین مکّہ کے پیہم مظالم سے تنگ آ کر اور ان کی طرف سے مایوس ہو کر] آنحضرت [صلی اللہ علیہ وسلم] زیدؓ بن حارثہ کو اپنے ہمراہ لے کر بسلسلۂ تبلیغ طائف چلے گئے۔ اس کے بعد آنحضرت [صلی اللہ علیہ وسلم] کو مکّے میں داخل ہونے سے پہلے [مُطْعِم بن عدی بن نَوفل بن عبد مناف کا] جوار حاصل کرنا پڑا۔

ابولہب بدر کی جنگ کے بعد جلد ہی مر گیا، جس میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی جگہ ایک ایسے شخص کو بھیج دیا تھا جو اس کا مقروض تھا۔ بدر کی شکست کی خبر کا ابولہب پر جو ردِّ عمل ہوا اس کا ایک طولانی قصہ ہے۔ [ابولہب چیچک کے عارضے سے مرا اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی لاش کے پاس کوئی نہ جاتا تھا، چنانچہ جس کوٹھری میں وہ مرا وہی اس پر گرا دی گئی۔ اس کی بیوی کا، جسے اس لیے کہ وہ رسول اللہ [صلی اللہ علیہ وسلم] کے راستے میں بچھانے کے لیے کانٹے چن چن کر لایا کرتی تھی، سورۃ اللّھب (یا المسد) میں ''حمّالۃ الحطب'' کہا گیا ہے، کا انجام بھی ایسا ہی عبرت ناک ہوا، یعنی ایک روایت کے مطابق لکڑیوں کے گٹھے کی رسی سے اس کا گلا گھٹ گیا]۔

ابولہب کے بیٹے عتبہ اور معتّب ۸ھ/۶۳۰ء میں مشرّف باسلام ہوئے۔ اس کا پرپوتا الفضل ابن العباس بن عتبہ ایک شاعر [اور مغنّی] کی حیثیت سے معروف تھا (الأغانی، ۱۵: ۲-۱۱)۔

مآخذ: (۱) ابن ہشام، ص ۶۹، ۲۳۱، ۲۳۳-۲۳۳، ۲۴۴، ۴۳۰، ۴۶۱؛ (۲) ابن سعد، ۱/۱: ۵۷ و ۴/۱: ۴۱-۴۲؛ (۳) احمد بن حنبل: المسند، ۳: ۴۹۲ ببعد؛

(۴) مصعب الزبیری: نسب قریش، ص ۸۹ - ۹۰؛ (۵) البلاذُری: الانساب، قاہرہ ۱۹۵۹ء، ص ۱۲۳، ۴۰۱؛ (۶) ابن حبیب: المُحبّر، ص ۱۱، ۵۳، ۳۰۳؛ (۷) الواقدی، طبع ولہاؤزن (Wellhausen)، ص ۴۲، ۳۵۱؛ (۸) الطبری، بہ امداد اشاریہ؛ (۹) النووی: تہذیب الاسماء، قاہرہ، ۱: ۲۶۷؛ (۱۰) الاصابۃ، شمارہ ۵۴۱۳، ۸۱۲۰؛ (۱۱) مختلف تفاسیر، سورۃ ۱۱۱ [اللہب]؛ (۱۲) Caetani: *Annali*، ۱: ۳۰۸ - ۳۰۹، ۴۹۶؛ (۱۳) A. Fischer، در *Ber. u. d. verh. d. Sach. Ak. Wiss.*، ج ۸۹/ ۲.

(واٹ W. M. WATT [و احسان الٰہی رانا])

---

* **ابو اللّیث سمرقندی:** نَصر بن محمد بن احمد بن ابراہیم المعروف بہ امام الہدٰی، چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کا ایک حنفی عالم اور مفتی۔ اس کی وفات کی تاریخ بالاختلاف ۳۷۳ھ/۹۸۳ - ۹۸۴ء اور ۳۹۳ھ/ ۱۰۰۲ - ۱۰۰۳ء کے درمیان بتائی جاتی ہے۔ ابو اللّیث کو اس کے ہم عصر الحافظ السمرقندی سے ملتبس نہیں کرنا چاہیے، جو عمر میں اس سے کچھ بڑا تھا اور جس کا نام بھی ابو اللیث نَصر ہی تھا۔ سیرت نگاری کے قدیم ترین مصنّف عبدالقادر (م ۷۷۵ھ/ ۱۳۷۳ء) نے بعض اہم کتابوں کو، جو عام طور پر امام الہدٰی کی تصنیف ٹھیرائی جاتی ہیں، مؤخر الذکر ہی سے منسوب کیا ہے؛ لیکن معلوم ہوتا ہے یہ بات غلط ہے.

ابو اللّیث نے علوم اسلامیہ کی متعدّد شاخوں میں بڑی کامیابی سے قلم اٹھایا؛ چنانچہ اس کی تصنیفات کو مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک قبول عام حاصل ہوا، جن میں اہم یہ ہیں: (۱) ایک تفسیر، طبع قاہرہ ۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۲ - ۱۸۹۳ء، جس کا ابن عرب شاہ (م ۸۵۴ھ/ ۱۴۵۰ - ۱۴۵۱ء) نے قدیم عثمانلی ترکی زبان میں ترجمہ کیا اور اس کے معاصر ابو الفضل موسٰی الاِزنیقی نے انفس الجواہر کے نام سے اس ترجمے کی مزید شرح و بسط کی۔ ان ترکی تصنیفات کے مخطوطات عثمانلی ترکی کے ان قدیم ترین قلمی نسخوں میں شمار ہوتے ہیں جن پر ان کی تاریخ کتابت درج ہے؛ (۲) خزانۃ الفقہ، فقہ حنفی کا ایک مختصر رسالہ؛ (۳) مختلف الروایۃ، قدیم حنفی فقہا کے اختلافی عقائد کے بارے میں، اس کے تین نسخے ہیں؛ (۴) المقدمۃ فی الصلٰوۃ، فریضۂ نماز پر، جس کی متعدّد شرحیں لکھی گئیں؛ (۵) تنبیہ الغافلین اور (۶) بُستان العارفین یہ دونوں کتابیں اخلاق اور تقوٰی کے موضوع پر لکھی گئیں اور متعدّد بار چھپ چکی ہیں؛ (۷) عقیدۃ، سوال و جواب کی شکل میں (طبع A.W.T. Juynboll، در *BTLV*، ۱۸۸۱ء، ص ۲۱۵ بعد، ۲۶۷ بعد)، مع شرح از محمد بن عمر النَّوَوِی (م ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۸ء کے بعد)، بعنوان قَطْر الغَیث (براکلمان: تکملہ، ۲: ۸۱۴؛ C. H. Becker، در *Isl.*، ۱۹۱۱ء، ص ۲۳)۔ یہ کتاب کئی بار چھپی ہے اور اس کے ملائی اور جاوی زبانوں میں بین السطور ترجمے بھی موجود ہیں۔ یہ عقیدۃ مستند ہے (Juynboll، محل مذکور اور F. Kern، در *ZA*، ۱۹۱۲ء، ص ۱۷۰، کی رائے کے برعکس)۔ اس سے مذہب کے بارے میں مقبول حنفی خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے (Schacht، در *Studia Islamica*، ج ۱).

مآخذ: (۱) عبدالقادر القرشی: الجواہر المُضِیئَۃ، حیدرآباد ۱۳۳۲ھ، ۲: ۱۹۶، ۲۶۴ بعد؛ (۲) G. Flügel: *Die Krone der Lebensbeschreibungen*، لائپزگ ۱۸۶۲ء، ص ۵۸ بعد ۱۵۲ بعد؛ (۳) محمد عبدالحی لکھنوی: الفوائد البھیّۃ، قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ص ۲۲۰؛ [(۴) فقیر محمد الجِہلمی: حدائق الحنفیۃ، لکھنؤ ۱۳۲۴ھ، ص ۱۸۰ - ۱۸۱؛] (۵) براکلمان (Brockelmann)، ۱: ۲۱۰ بعد و تکملہ، ۱: ۳۴۷ بعد (شمارہ ۶ و ۷ میں ایک ہی تصنیف کا حوالہ ہے).

(شاخت J. SCHACHT)

⊗ **ابو المحاسن:** جمال الدّین یوسف بن تَغری بِردِی بن عبداللہ الظاہری الجوینی، رکّ بہ ابن تغری بردی.

---

* **ابو المحاسن یوسف بن محمد:** بن یوسف الفاسی، مراکش کا ایک عالمِ دین اور مشہور صوفی شیخ، جو ۹۳۸ھ/ ۱۵۳۱ - ۱۵۳۲ء میں پیدا ہوا۔ وہ فاسیُّون (مقامی زبان میں فاسیّین) کے اس خاندان کا جدِّ امجد تھا جس سے سولھویں صدی عیسوی میں پشت ہا پشت تک شہر فاس میں علما و فقہا کا ایک طویل سلسلہ جاری رہا.

ابو المحاسن الفاسی کا تعلّق قبیلۂ بنو الجَدّ کی فہری شاخ سے تھا۔ یہ قبیلہ ۸۸۰ھ/ ۱۴۷۵ء کے قریب اندلس کے شہر مالقہ (Malaga) سے نقلِ مکان کر کے مراکش چلا آیا تھا۔ وہ القصر الکبیر (ہسپانوی شکل =Alcázarquivir) میں پیدا ہوا، جہاں اس کے دادا یوسف نے فاس میں سات سال قیام کے بعد سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نسبت الفاسی ہوئی اور ایسے ہی اس کے اخلاف کی؛ لیکن یہ شمالی مراکش کا دارالحکومت تھا جہاں ابو المحاسن کو حصولِ تعلیم کے لیے جانا پڑا، حتّٰی کہ ۹۸۸ھ/ ۱۵۸۰ء کے بعد سے وہ وہیں آباد بھی ہو گیا اور پھر تھوڑے ہی دنوں میں علم و فضل اور زہد و تقوٰی میں غیر معمولی شہرت حاصل کر لی۔ اس نے ایک زاویہ بھی تعمیر کیا، جو اُسی زمانے سے مرجعِ انام بنا ہوا ہے۔ ۹۸۶ھ/ ۱۵۷۸ء میں اس نے پرتگیزوں کے خلاف وادی المَخازِن کی مشہور لڑائی میں حصّہ لیا (رکّ بہ مادّۂ سَعْد، بنو)۔ اس نے ۱۸ ربیع الاوّل ۱۰۱۳ھ/ ۱۴ اگست ۱۶۰۴ء کو وفات پائی۔ اس کے اخلاف میں جن علما نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی ان میں اس کے بیٹے محمد العربی الفاسی کا ذکر کر دینا ضروری ہے، جس نے ابو المحاسن پر ایک مخصوص کتاب مِرْآۃ المحاسن کے عنوان سے تصنیف کی (طبع سنگی، فاس ۱۳۲۴ھ)؛ ایسے ہی اس کے پوتے عبدالقادر بن علی [رکّ بآن] اور مؤخّر الذکر کے بیٹے عبدالرحمٰن [رکّ بآن] کا۔ خاندان فاسیُّون کا نسب نامہ *Hist. Chorfa* (تاریخ شرفاء)، ص ۲۴۲ پر ملے گا.

مآخذ: (۱) E. Lévi Provençal: *Hist. Chorfa*، ص ۲۴۰ -

۲۴۱]؛ نیز متعدّد حوالے اسی کتاب کے ص ۲۴۰، حاشیہ ۴ میں، جن میں سے یہاں صرف حسبِ ذیل درج کیے جاتے ہیں: (۲) الإِفْرانی: صَفوة مَن اِنْتَشر، فاس، بدونِ تاریخ، ص ۲۷؛ (۳) القادری: نشر المثانی، فاس ۱۳۱۰ھ، ۱: ۸۹؛ (۴) المُحِبّی: خلاصة الأثر، قاہرہ ۱۲۸۴ھ، ۴: ۵۰۷؛ (۵) الکتّانی: سَلوة الانفاس، فاس ۱۳۱۶ھ، ۲: ۳۰۶ ببعد؛ (۶) M. Bencheneb: *Étude sur les personnages mentionnés dans l'idjâza du cheikh Abd el-Qâdir el Fâsy*، در *Actes XVIe Cong. Int. Or.*، ج ۴، پیرس ۱۹۰۸ء، فصل ۱۹ مکرّر.

(E. LÉVI PROVENÇAL پراوِنسال)

✱ **ابو مِحْجَن**: عبداللہ (یا مالک یا عمرو) بن حبیب، بنوثقیف کا ایک عرب شاعر، جس کا شمار مُخَضْرَمُون میں ہوتا ہے۔ [وہ بڑا شجاع، مردِ میدان اور اعلٰی پایے کا شاعر تھا]۔ طائف کا محاصرہ ہوا تو شہر کی مدافعت میں وہ آنحضرت [صلی اللہ علیہ وسلم] کے خلاف لڑائی میں شریک تھا، بلکہ اس نے [حضرت] ابوبکرؓ کے فرزند عبداللہؓ کو تیر سے زخمی بھی کیا (۸ھ/ ۶۳۰ء)، لیکن اس کے بعد ۹ھ/ ۶۳۱ - ۶۳۲ء میں اسلام قبول کر لیا اور [آگے چل کر] القادسیّہ کی لڑائی میں حصّہ لیا۔ روایت ہے کہ اس لڑائی میں شامل ہونے کے لیے وہ اپنے پہریداروں کی نگرانی سے بھاگ نکلا (کیونکہ [حضرت] عمرؓ نے اسے جلاوطن کر کے حَضَوْضَہ بھیج دیا تھا، دیکھیے گولت تسیہر: *Abhandl.*، ج ۱)، مگر پھر جوں توں کر کے [حضرت] سعدؓ بن ابی وقاص [کے اس لشکر سے جا ملا، جس نے قادسیہ میں ایرانیوں پر فیصلہ کن فتح حاصل کی]۔ [حضرت] سعدؓ نے اسے شراب نوشی کی پاداش میں قید کر دیا تھا۔ [وہ بار بار یہ اشعار پڑھتا تھا:

كفى حَزنًا ان تردَى الخيل بالقنا
و اترک مشدودًا علیّ وثاقیا
اذا قمت عنّانی الحدید و اغلقت
مصاریع من دونی تُصمّ المنادیا]

[حضرت] سعدؓ کی حرم محترم کی بدولت اس نے عارضی رہائی حاصل کر لی اور [حضرت سعدؓ] میدان جنگ میں اس کی کارگزاری کو دیکھ کر اس قدر خوش ہوئے کہ انھوں نے اس کا قصور معاف کر دیا...... یہ بھی ممکن ہے کہ ابومحجن نے اُلَّیس (Vologasias) کی جنگ میں حصّہ لیا ہو، لیکن ۱۶ھ/ ۶۳۷ء میں [حضرت] عمرؓ نے اسے پھر جلاوطن کر دیا اور ناصع بھیج دیا، جہاں کچھ عرصے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا مزار آذربیجان یا جرجان کی سرحد پر موجود ہے۔

ابومحجن کی شاعری کے جو نمونے محفوظ ہیں ان سے کسی جدّت آفرینی کا ثبوت تو نہیں ملتا، تاہم شاعر کی حیثیت سے اس کی شہرت زیادہ تر اس کی خمریات پر مبنی ہے۔ مشہور شعر:

[اذا مُتُّ فادفِنِیَ الی جَنْبِ کَرْمةٍ
تُرَوِّیَ عظامی بَعْدَ مَوتی عُروْقها]

"میں مر جاؤں تو میری قبر انگور کی کسی بیل کے پہلو میں بنے" [ابن قتیبہ: کتاب الشعر، ص ۲۵۳ س ۵] اسی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ [الاصابة اور شاعر کے مطبوعہ دیوان میں یہ بیت اس کے بیٹے عبید بن ابی محجن کی طرف منسوب ہے]۔ اس کی چند نظمیں، جن میں اس نے قرآن پاک کے حکم تحریم خمر کے خلاف اظہارِ خیال کیا ہے، یقینًا قابل تأمّل و مؤاخذہ ہیں اور اس کی یہی روش تھی جس کی بنا پر [حضرت] عمرؓ نے اسے کئی دفعہ جلاوطنی کی سزا دی.

ابومحجن کو اس کے ہم نام ابومحجن [بلکہ ابو الجنا — ابن قتیبہ: کتاب الشعر، ص ۲۴۲] نُصَیْب بن رَبَاح سے ملتبس نہ کرنا چاہیے، جس کے لیے رکّ بہ مادّۂ نُصَیْب.

مآخذ: (۱) ابومحجن کا دیوان C. Landberg نے *Primeurs arabes*، ج ۱، لائڈن ۱۸۸۶ء، میں طبع کیا (ایک اور طباعت قاہرہ کی بلا تاریخ ہے، جس میں العَسْکَری کی شرح بھی شامل ہے)؛ اسے A. Bel نے بھی (سوانح حیات اور لاطینی ترجمے کے ساتھ) طبع کیا ہے، لائڈن ۱۸۸۷ء؛ حالات کے لیے دیکھیے: (۱) الجُمَحی: طبقات الشعراء (مطبوعۂ قاہرہ)، ص ۱۰۵-۱۰۶؛ (۲) ابن درید: الاشتقاق، ص ۱۸۵؛ (۳) الآمدی: المؤتلف، ص ۹۵-۹۶؛ [(۴) ابن قتیبہ: الشعر والشعراء، ص ۲۵۱-۲۵۳؛] (۵) الطبری: تأریخ؛ [(۶) المسعودی: مروج الذهب، ۴: ۲۱۳-۲۱۹؛] (۷) الأغانی، طبع اوّل، ۱۱: ۱۳۷-۱۴۳ و ۲۱: ۲۱۰-۲۲۴؛ (۸) ابن حجر: الاصابة، ج ۴، شمارہ ۱۰۱۷؛ [(۹) العَینی: شواہد، ۴: ۳۸۱-۳۸۲؛] (۱۰) البغدادی: خزانة الادب (مطبوعۂ بولاق)، ۳: ۵۵۰-۵۵۶؛ (۱۱) Caetani: *Annali*، ۵: ۲۲۴ ببعد؛ (۱۲) براکلمان، ۱: ۴۰ و تکملہ، ۱: ۷۰؛ (۱۳) O. Rescher: *Abriss*، ۱: ۱۰۵-۱۰۷؛ (۱۴) Nallino: *Scritti*، ۶: ۴۲؛ [(۱۵) سرکیس: معجم المطبوعات، قاہرہ ۱۹۲۵ھ].

(CH. PELLAT و N. RHODOKANAKIS)

✱ **ابومحمد صالح**: بن یَنْصارَن بن غَفِیّان الدُکّالی الماجِری، چھٹی، ساتویں صدی ہجری کے مشہور مراکشی صوفی بزرگ اور شہر آسفی [رکّ بآن]، یعنی آج کل کے سَفی، کے "محافظ ولی"، ۵۵۰ھ/ ۱۱۵۵ء میں پیدا ہوے۔ ان کے اصل مرشد تلمسان کے "محافظ ولی" مشہور و معروف [صوفی بزرگ] ابو مَدْیَن [رکّ بآن] الغوث تھے۔ وہ فریضۂ حج کی ادائگی کے لیے مکۂ [معظّمہ] گئے تو خیال یہ ہے کہ بیس برس اسکندریہ میں گزارے تا کہ صوفی عبدالرزّاق الجزُولی کی تعلیمات کی پیروی کریں، جو خود بھی مراکشی الاصل تھے۔ مراکش واپس آ کر وہ اپنے اہل ملک کو طلبِ علم کے لیے مشرق جانے کی تلقین کرتے رہے اور خود آسفی کی رِباط میں گوشہ

نشین ہوگئے۔ یہیں ۲۵ ذوالحجہ ۶۳۱ھ/۲۲ ستمبر ۱۲۳۴ء کو انھوں نے وفات پائی۔ ان کے پر پوتے احمد بن ابراہیم بن احمد بن ابی محمد صالح نے ان کے حالات میں ایک مخصوص رسالہ بعنوان المِنْہاج الواضح فی تحقیق کرامۃ ابی محمّد صالح لکھا ہے۔

مآخذ: (۱) ابن فَرحُون: دِیباج، قاہرہ ۱۳۲۹ھ، ص ۱۳۲؛ (۲) البادِسی: مقصد، ترجمہ از G. S. Colin، در *AM*، ۱۹۲۶ء، ص ۹۲، ۱۹۵ (حاشیہ ۲۹۵)؛ (۳) الکتّانی: سلوۃ الأنفاس، فاس ۱۳۱۶ھ، ۲: ۴۳-۴۴؛ (۴) Lévi-Provençal: *Fragments historiques sur les Berbéres au Moyen Age*، رباط ۱۹۳۴ء، ص ۷۷-۷۸؛ (۵) وہی مصنف: *Hist. Chorfa*، ص ۲۲۱ و حاشیہ ۳.

(لیوی پراوِنسال E. LÉVI-PROVENÇAL)

---

* **ابومحمد عبداللہ:** بن محمد بَرَکۃ العُمانی، عام طور پر ابن بَرَکہ کے نام سے معروف ہے، عُمان کے قصبۂ بَہْلی کا ایک اباضی مصنّف تھا، جس کی زندگی کے متعلّق صحیح صحیح تاریخیں تو معلوم نہیں، البتہ عُمان کے ایک اباضی مصنّف ابن مُداد کے نزدیک وہ امام سعید بن عبداللہ بن محبوب کا مُرید اور حامی تھا۔ امام مذکور ۳۲۸ھ/۹۳۹-۹۴۰ء میں قتل ہوا۔ عُمان کی سیاسی زندگی میں ابومحمد نے بہت بڑا حصّہ لیا اور متعدد تاریخی اور فقہی کتابیں تالیف کیں، جن میں صرف حسبِ ذیل باقی ہیں: (۱) الجامع، اصول فقہ پر؛ (۲) الموازَنۃ، امام الصَّلْت بن مالک کے عہد میں عمان کی حالت پر، جس میں بعض اُصولی مسائل اور ان کے فقہی حل بھی دیے گئے ہیں؛ (۳) التبِیْرۃ، مقدم الذکر کی طرز ہی کی ایک کتاب؛ (۴) مدح العلم، علم اور طالبان علم کی تعریف میں؛ (۵) التقیید؛ (۶) التعارُف؛ (۷) الشرح لجامع ابن جعفر، بلاشبہ الجامع کی شرح، جو ابو جابر محمد بن جعفر الاَزْکَوی العُمانی کی تصنیف ہے اور جس میں فقہی اصول کے اطلاق سے بحث کی گئی ہے۔

مآخذ: (۱) السالمی: تحفۃ الاعیان فی سیرۃ اھل عُمَان، قاہرہ ۱۳۳۲ھ، ۱: ۱۵۳، ۱۶۶، ۱۶۷؛ (۲) وہی مصنّف: اللُّمْعَۃ (چھے اباضی کتابوں کے مجموعے، مطبوعۂ الجزائر ۱۳۲۶ھ، میں شامل ہے)، ص ۲۱۰-۲۱۱؛ (۳) السیر العمانیۃ، مخطوطۂ Lwow، ورق ۱۸۳ب تا ۱۹۸ب، ۲۷۱ا؛ (۴) E. Masqueray: *Chronique d' Abou Zakaria*، الجزائر ۱۸۷۸ء، ص ۱۳۹، حاشیہ؛ (۵) A. de Motylinski: *Bibliographie du Mzab*، در *Bull. de Corr. Afr.*، الجزائر ۱۸۸۵ء، ص ۱۹ و ۲۰.

(T. LEWICKI)

---

* **ابومِخْنَف:** لُوط بن یحیٰی بن سعید بن مِخْنَف الاَزْدِی، دورِ اوّل کے عرب محدّثین اور مؤرّخین میں سے ایک (م ۱۵۷ھ/۷۷۴ء)۔ الفہرست میں عربوں کی تاریخ کے مختلف واقعات پر، جو زیادہ تر عراق سے متعلّق ہیں، بتیس جداگانہ رسائل اس سے منسوب ہیں، جن کے مضامین کا بہت سا حصّہ البلاذُری اور الطبری کی تواریخ میں محفوظ ہو گیا ہے۔ جداگانہ تصنیفات، جو ابومخنف کے نام سے ہم تک پہنچی ہیں، بعد کی ہیں اور جعلی طور پر اس کے نام سے لکھ دی گئیں۔ اس کا پردادا مخنف گو حامیانِ علیؓ کی صف میں عراق کے اَزْدِیوں کا سردار تھا (اس کے حالات کے لیے دیکھیے ابن سَعْد، ۶: ۲۲؛ ونَصر بن مُزاحم: وَقْعَۃ صِفّین، قاہرہ ۱۳۶۵ھ، اشاریہ)، لیکن ابومخنف نے اپنے تاریخی بیانات میں خالص شیعی نقطۂ نظر کی جگہ زیادہ تر عراقی یا کوفی نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ بحیثیتِ محدّث اس کا شمار ضعیف اور غیر ثقہ راویوں میں ہوتا ہے۔

مآخذ: (۱) الفہرست، ص ۹۳؛ (۲) طُوسی: الفہرست، شمارہ ۵۷۵؛ (۳) الکُتُبی: فوات الوفیات، ۲: ۱۷۵ (طبع قاہرہ ۱۹۵۱ء، شمارہ ۳۶۰)؛ (۴) براکلمان (Brockelmann)، ۱: ۶۵ و تکملہ، ۱: ۱۰۱-۱۰۲؛ (۵) Storey، ۲: ۲۲۹؛ (۶) J. Wellhausen: *Ar. Reich*، دیباچہ، ص ۳-۵ (جہاں اس کے مواد اور نہج کی خصوصیات بالاختصار بیان کی گئی ہیں)؛ (۷) وُسْٹَنْفِلْٹ (F. Wüstenfeld): *Der Tod Husains und die Rache* (*AGGW* ۱۸۸۳ء)؛ (۸) بارٹولڈ (Barthold)، در *Zapiski Vostoch. otd. imper. arkheol. obshch.*، ۱۷: ۱۴۷ ببعد؛ (۹) R. E. Brünnow: *Die Charidschiten*، لائڈن ۱۸۸۴ء.

(گِبّ H. A. R. GIBB)

ابومِدْفَع: رَکّ بہ سکّہ۔ *

---

* **ابومَدْیَن شُعَیب:** بن الحسین الاَنْدلُسی، اندلس کے مشہور صوفی ۵۲۰ھ/۱۱۲۶ء میں قَطْنِیانہ (Contillana) میں پیدا ہوئے، جو اشبیلیہ سے شمال مشرق کی جانب بیس میل کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ ان کا خاندان معمولی حیثیت کا تھا، چنانچہ ابتدا میں انھوں نے کپڑا بننے (بافندگی) کا پیشہ اختیار کیا، لیکن علم کے بے پناہ شوق میں انھوں نے اوّل قرآن پاک پڑھا اور پھر جیسے ہی موقع ملا تکمیلِ علم کے لیے شمالی افریقہ چلے گئے۔ فاس میں انھیں ان مشہور و معروف اساتذہ سے تلمذ حاصل رہا جن کی شہرت کا انحصار بجائے الٰہیات میں علم و فضل کے زیادہ تر ان کے زہد و تقوٰی اور درویشانہ زندگی پر تھا، مثلاً ابو یَعْزّٰی الہَزْمِیری، علی بن حِرْزِہِم اور الدقّاق۔ مؤخّر الذّکر نے انھیں خرقہ عطا کیا اور یہ گویا علامت تھی صوفیانہ زندگی میں ان کے باقاعدہ قدم رکھنے کی، گو معلوم ہوتا ہے کہ انھیں مسائل تصوف سے روشناس کرانے کا سہرا ابو یعزّٰی کے سر ہے۔ شیخ موصوف ہی کی اجازت سے ابومَدْیَن نے مشرق کا سفر کیا اور الغزالیؒ اور دوسرے بڑے بڑے صوفیہ کی روایات کو اخذ و جذب کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ممکن ہے کہ مکۂ معظّمہ میں انھوں نے مشہور [بزرگ] شیخ عبدالقادر الجیلانیؒ

(م ۵۶۱ھ/ ۱۱۶۶ء) سے بھی ملاقات کی ہو۔ المغرب واپس آ کر انھوں نے بجایہ (Bougie) میں سکونت اختیار کی اور اپنے رشد و ہدایت اور مثالی زندگی کی وجہ سے خوب خوب شہرت پائی۔ بنو مؤمن [یعنی الموحّدون] کے حکمران ابو یوسف یعقوب المنصور کے کانوں تک ان کا شہرہ پہنچا تو اس نے انھیں مراکش میں اپنے دربار میں بلا بھیجا، جس کی وجہ بلا شبہہ اس کا یہ خوف تھا کہ فرقہ الموحدون کے باہر کسی شخص کو مذہبًا احترام کی نظر سے نہ دیکھا جائے؛ مگر عین اس وقت جب تلمسان کا شہر ان کے سامنے تھا، ابو مدین کو بیماری نے آ لیا اور اسی حالت میں ان کا انتقال ہو گیا (۵۹۴ھ/ ۱۱۹۷ء)۔ [شذرات الذھب میں ان کے حالات ۵۹۰ھ کے تحت مذکور ہیں۔ شیخ اکبر ابن عربی نے انھیں شیخ الشیوخ کہا ہے۔ بڑے بڑے علما و فضلا، مثلاً ابو عبداللہ القرشی، نے ان سے استفادہ کیا۔] انھیں العُبّاد میں، جو تلمسان کے نواح میں ایک گاؤں ہے، دفن کیا گیا، جیسا کہ واضح طور پر ان کی وصیّت تھی۔ بظاہر یہ مقام شروع ہی سے زُہّاد اور فقرا کا مرجع رہا تھا، لیکن ابو مدین کے مدفن کی حیثیت سے اب اسے خاص شرف حاصل ہونے والا تھا۔

شیخِ موصوف کو مسلمانوں کی ممتاز ترین شخصیتوں میں جو مقام حاصل ہے اس کی وجہ صحیح معنوں میں ان کی تصنیفات نہیں، کیونکہ ان میں سے بقول A. Bel، ''چند صوفیانہ نظمیں، ایک وصیة اور ایک عقیدۃ ہی باقی ہے۔ ان کی قدر و منزلت کی بنا اس یاد پر ہے جو ان کے مریدوں کے دل میں اب تک چلی آتی ہے؛ علٰی ہذا وہ اقوال جو ان سے منسوب ہیں اور جنھیں دیکھتے ہوئے انھیں قطب، غوث اور ولی اللہ ٹھیرایا گیا۔ وہ اپنے اقوال میں زہد و ریاضت، ترک دنیا، عجز و انکسار اور اللہ پر کامل توکل کی فضلیت پر زور دیتے ہیں۔ ان کا قول تھا کہ ''عمل میں غرور کا ذرا سا شائبہ بھی ہے تو یہ بے کار ہے؛ بعینہٖ ایسی بے عملی جس میں عجز شامل ہو کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی''۔ وہ کہتے تھے: ''جو شخص غور و فکر اور 'اختیار' کو ترک کر دیتا ہے بہتر زندگی گزارتا ہے''... [وہ صاحبِ عمل اور صاحبِ اجتہاد تھے، طبیعت پر زہد و تقشّف کا غلبہ تھا، چنانچہ اشعار میں بھی یہی رنگ ہے:

یا من علا فرآی ما فی الغیوب وما
تحت الثری و ظلام اللیل منسدل
انت الغیاث لمن ضاقت مذاھبه
انت الدلیل لمن جارت به الحیل
انّا قصدناک و الآمال واثقة
والکل یدعوک ملھوف و مبتھل
فان عفوت فذو فضل و ذوکرم
و ان سطوت فانت الحاکم العدل]

دراصل تصوف کے بارے میں ان کے تصورات میں کوئی ایسی بات نہیں جو انوکھی ہو، لیکن ان کی تعلیم کی کامیابی اور اس کے دیرپا اثر کا راز مختلف رجحانات سے ان کی رواداری اور اس معاشرے کی حالت میں مل سکتا ہے جو اس تعلیم کا مخاطب تھا۔ ''ان کی اصل خوبی اور عظیم الشّان کامیابی کی وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی واردات کو مجموعی طور پر ایک ایسی شکل دی جو ان کے سامعین خوب سمجھ سکتے تھے۔ وہ معتدل تصوف جس کی بنا الغزالی[رح] نے ڈالی تھی اور جو دراصل بعض منتخب اور مُتّقی ہستیوں کی خاطر اسلام کے صحیح عقائد کا جزو تسلیم کر لیا گیا تھا، اب شمالی افریقہ اور مسلمانوں کے مزاج کے مطابق ڈھل رہا تھا، خواہ وہ عوام سے ہوں یا تعلیم یافتہ... یوں ابو مدین.... ہی تھے جنھوں نے شمالی افریقہ کے تصوف کی مخصوص نوعیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے متعیّن کر دیا'' (R. Brunschvig).

اولیاء اللہ کی سیرت کی کتابوں میں ان سے کئی ایک کرامتیں بھی منسوب ہیں۔ شہر تلمسان نے تو، جہاں وہ فوت ہوئے تھے، انھیں اپنا ''سرپرست اور محافظ ولی'' بنا لیا ہے۔ ان کا مزار، جو فنِ تعمیر کے گونا گوں نمونوں کا مرکز بن گیا ہے (العبّاد کی مسجد: ۷۳۷ھ/ [۱۳۳۶ء]، مدرسہ: ۷۴۷ھ/ ۱۳۴۷ء اور ایک چھوٹا سا قصر اور حمام) اور جسے زیادہ تر فاس کے مرینی خاندان کے بادشاہ ابوالحسن والیِ تلمسان نے تعمیر کرایا تھا، اب تک صوبۂ وہران (Oran) اور مشرقی مراکش کے دیہاتیوں کی زیارت گاہ ہے۔

مآخذ: (۱) ابن مریم: البُستان، طبع محمد بن شِنِب، الجزائر ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء؛ ترجمہ از پرووِنزالی (Provenzali)، الجزائر ۱۹۱۰ء، ص ۱۱۵ بعد؛ (۲) الغُبرینی: عنوان الدّرایة (طبع محمد بن شِنِب)، الجزائر ۱۹۱۰ء؛ (۳) ابن خلدون (یحیٰی): تأریخ بنی عبدالواد (*Hist. des b. 'Abd al-Wād*)، ترجمہ از A. Bel، الجزائر ۱۹۰۴ء، ۱: ۸۰-۸۳؛ (۴) احمد بابا: نیل الابتھاج، فاس ۱۹۱۷ء، ص ۱۰۷-۱۱۲؛ (۵) J. J. J. Bargés: *Vie du célèbre marabout Cidi Abou Medien*، پیرس ۱۸۸۴ء؛ (۶) Brosselard: *Les inscriptions arabes de Tlemcen*، در *RAfr.*، ۱۸۵۹ء؛ (۷) A. Bel: *La religion musulmane en Berbérie*، ج ۱، پیرس ۱۹۳۸ء؛ (۸) وہی مصنّف: *Sidi Bou Medyan et son maître Ed-Daqqâq*، در *Mélanges*، پیرس ۱۹۲۳ء، ۱: ۳۱-۶۸؛ (۹) R. Brunschvig: *La Berbérie orientale sous les Hafsides*، ج ۲، پیرس ۱۹۴۷ء: ص ۳۱۷-۳۱۹؛ (۱۰) M. Asin Palacios: *El mistico murciano Abenarabi*، میڈرڈ ۱۹۲۵ء، ص ۳۲؛ [(۱۱) شذرات الذھب، مصر ۱۳۰۵ھ، ۵: ۳۰۳].

(G. MARÇAIS)

ابُو مَرْوان (Abumeron): رک بہ ابن زُہر. *

ابُو مُسْلِم: خراسان میں عباسیوں کی انقلابی تحریک کا رہنما، جس کے ابتدائی * حالات تاریکی میں ہیں۔ وہ غالبًا ایرانی النسل غلام تھا اور کوفے میں بنو عِجل کے یہاں ملازم، جہاں اس نے فرقۂ شیعہ سے تعلّقات پیدا کیے؛ چنانچہ ۱۱۹ھ/

۷۳۷ء میں وہ غالی شیعہ المُغِیرہ بن سعید کے پیرووں میں شامل تھا۔ ۱۲۴ھ/ ۷۴۱-۷۴۲ء میں عباسیوں کے خراسانی نُقَبا نے، جو مکۂ معظّمہ جا رہے تھے، اُسے زنداں میں محبوس پایا۔ انھوں نے اسے رہائی دلائی اور امام ابراہیم بن محمد کے پاس لے گئے۔ امام موصوف نے ۱۲۸ھ/ ۷۴۶ء میں اسے ضروری ہدایات کے بعد خراسان بھیج دیا تا کہ اس صوبے میں باغیانہ تحریک کی رہنمائی کرے۔

خراسان پہنچ کر اُسے ابتدا میں تحریک کے مقامی سرداروں (بالخصوص سلیمان بن کثیر) کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اس نے اس پر قابو پایا اور پھر بڑی مستعدی اور سرگرمی سے اس امر میں کامیاب ہو گیا کہ عباسیّوں کی اس دعوت کے ثمرات سے بہرہ ور ہو سکے جو مدت سے جاری تھی؛ چنانچہ یکم شوال ۱۲۹ھ/ ۱۵ جون ۷۴۷ء کو اس نے بغاوت کا سیاہ عَلَم برسرِ عام بلند کر دیا۔ اموی لشکر کے اندرونی اختلافات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ابومُسلم نے یمنی گروہ کی تائید حاصل کر لی اور ربیع الثانی یا جمادی الاولٰی ۱۳۰ھ/ دسمبر ۷۴۷ء یا جنوری ۷۴۸ء میں اس نے مرو پر قبضہ کر لیا اور یہیں سے اس کے فوجی سرداروں نے گرد و نواح کے تمام علاقوں میں لشکر کشی شروع کر دی۔ ان میں سے ایک قَحْطَبہ بن شبیب [رَکَ بآن] نے مغرب کی طرف پسپا ہوتی ہوئی اموی افواج کا تعاقب اپنے ذمے لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انجام کار بنوامیّہ کا خاتمہ ہو گیا۔

السَّفّاح کی خلافت کا اعلان ہوا تو ابومسلم بدستور اندرونِ ملک میں والی کی حیثیت سے برقرار رہا۔ اس نے اندرونِ ملک میں امن و امان قائم کیا، بخارا میں شیعی باغیوں کی سرکوبی کی (۱۳۳ھ/ ۷۵۰-۷۵۱ء) اور اس کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف اسلامی فتوحات کو وسعت دی (ابوداؤد کی مہم اسی سال پیش آئی)؛ بایں ہمہ نئے حکمران خاندان سے، جس کی کامیابی بہت کچھ اسی کی مرہونِ منّت تھی، اس کے تعلّقات روز بروز کشیدہ ہوتے گئے۔ بظاہر اس کی طرف سے بغاوت کا کوئی منصوبہ تیار نہیں ہو رہا تھا، ایسے ہی ان مصنّفین کا جنھوں نے ملاحدہ پر قلم اٹھایا یہ دعوٰی، جسے عصرِ حاضر کے علما نے بھی تسلیم کیا ہے، صداقت سے خالی نظر آتا ہے کہ ابومسلم اسلام میں کسی بڑے الحاد کی داغ بیل ڈال رہا تھا؛ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کا ذاتی وقار اور اقتدار اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ بجائے خود بنوعباس اس سے خائف تھے، چنانچہ ۱۳۶ھ/ ۷۵۳ء میں المنصور تخت نشین ہوا تو صورت حالات اور نازک ہو گئی۔ المنصور نے پہلے تو اپنے چچا عبداللہ بن علی [رَکَ بآن] کے خلاف اس سے کام لیا اور پھر اسے دربار میں حاضری کے لیے بلا بھیجا۔ ابومسلم کے دل میں خطرات اور شبہات تو تھے، لیکن اسے آنے والی اُفتاد کا خیال تک نہ تھا۔ بایں ہمہ کچھ دنوں کے تردد اور تامّل کے بعد اس نے تعمیلِ حکم کا فیصلہ کیا اور انجام کار دھوکے سے قتل کر دیا گیا [۱۳۷ھ/ ۷۵۴-۷۵۵ء]۔ مشرقی صوبوں نے اس کی یاد دیر تک قائم رکھی اور اس طرح المُقَنَّع [رَکَ بآن] کی تحریک سے جس سیاسی اور مذہبی شورش کی ابتدا ہوئی وہ سالہا سال تک قائم رہی۔

مآخذ: (۱) الدِینَوَری: الاخبار الطوال (طبع Guirgass)؛ (۲) الیعقوبی اور (۳) الطبری، اشاریات؛ (۴) الأغانی، جداول (Tables)؛ (۵) G. van Vloten: *De Opkomst der Abbasiden in Chorasan*، لائڈن ۱۸۹۰ء، ص ۷۰-۱۳۱؛ (۶) J. Wellhausen: *Das arabische Reich und sein Sturz*، ص ۳۲۳-۳۵۲؛ (۷) R. N. Frye: *The role of Abū Muslim in the ʿAbbāsid Revolt*، در *MW*، ۱۹۴۷ء، ص ۲۸-۳۲؛ (۸) S. Moscati: *Studi su Abu Muslim*، ج ۱-۳، در *Rend. Linc.*، ۱۹۴۹ء، ص ۳۲۳-۳۳۵، ۴۷۴-۴۹۵؛ ۱۹۵۰ء، ص ۸۹-۱۰۵.

(S. MOSCATI)

ابوالمَعالی عبدالملک: رَکَ بہ الجُوَینی. *

---

* **ابوالمَعالی محمد بن عبیداللہ:** ایک ایرانی مصنّف، جن کے چھٹے مورثِ اعلٰی [امام زین العابدینؑ] کے بیٹے حسین الاصغر المحدّث تھے۔ ان کا خاندان مدتوں بَلْخ میں مقیم رہا۔ وہ ناصر خسرو کے معاصر اور اس سے متعارف بھی تھے، اس لیے کہ ناصر خسرو کے متعلّق قدیم ترین معلومات ہمیں انھیں کی وساطت سے ملی ہیں۔ ان کی ایک ہی تصنیف ہے، جس کی دو عبارتوں سے شیفر (Ch. Schefer) نے یہ رائے قائم کی ہے کہ جب انھوں نے بیان الادیان (مؤرخہ ۴۸۵ھ/ ۱۰۹۲ء) تصنیف کی تو وہ اس وقت سلطان مسعود غزنوی سوم کے دربار میں موجود تھے۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلّق ہے یہ اوّلین کتاب ہے جو فارسی زبان میں مذاہب کے بارے میں لکھی گئی۔ اس کے پہلے دو باب ان مذاہب کے لیے مخصوص ہیں جو اسلام سے پہلے موجود تھے، لیکن ان میں بعض الحادات کا ذکر بھی آ گیا ہے؛ تیسرا اور چوتھا باب سنّی اور شیعی عقائد کی وضاحت نیز اسلامی فرقوں (بالخصوص اسمٰعیلیہ) کے بیان کے لیے وقف ہیں؛ پانچواں باب، جو غُلات اور انتہا پسندوں کے بارے میں تھا (اور جو اس وجہ سے شائد بڑا اہم ہو) ناپید ہے۔ انھوں نے اپنے بڑے بڑے مآخذ کا ذکر کر دیا ہے۔ یہ کتاب اتنی ضخیم نہیں ہے جتنی شریف مرتضٰی (بارھویں صدی کے نصف آخر کے مصنّف) کی تبصرۃ العوام، لیکن صحت و وضاحت اور زورِ بیان کے اعتبار سے بہت قابلِ تعریف ہے۔ اس کا شمار ان بہترین تصنیفات میں ہوتا ہے جو غزنوی عہد میں فارسی نثر میں لکھی گئیں۔ طبعات از Ch. Schefer (در *Chrestomathie persane*، ۱: ۱۳۱-۱۷۱) اور عباس اقبال، تہران ۱۳۱۲ھ/ ۱۹۳۴ء (دیباچے میں ابوالمعالی کا مفصل نسب نامہ ملے گا)؛ ترجمہ از H. Massé، در *RHR*، ۱۹۲۶ء، ص ۱۷-۷۵.

(H. MASSE)

ابوالمَعالی ہِبَۃ اللہ: بن محمد بن المُطَّلِب، رَکَ بہ ہِبَۃ اللہ. *

---

* **ابومَعْشَر جَعْفر بن محمد بن عُمَر البَلْخی**: ایک ماہر علم ہیئت و نجوم، جو مغربی یورپ میں عام طور پر Albumasar کے نام سے مشہور ہے، مشرقی خراسان کے شہر بلخ میں پیدا ہوا اور بغداد میں تعلیم حاصل کی۔ وہ مشہور فلسفی الکِندی [حدود ۲۴۷ھ/ ۸۶۲ء] کا ہم عصر تھا۔ اسلامی اخبار و روایات کے مطالعے کے بعد اس نے ہیئت اور نجوم پر بالخصوص توجّہ کی؛ چنانچہ اس کی شہرت زیادہ تر علمِ نجوم ہی کی وجہ سے ہے۔ علمِ ہیئت کی تحقیقات اس وقت بغداد میں بڑے عروج پر تھی، جس سے اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ لیکن وہ ہیئت پر یقیناً نجوم کو ترجیح دیتا تھا۔ بہر کیف علمِ نجوم پر اس کی متعدد تصانیف سے علمِ ہیئت کے وہ اصول و قوانین بآسانی اخذ کیے جاسکتے ہیں جو اس نے معاصر علما سے حاصل کیے۔ اس نے تقریباً سو سال کی عمر پاکر ۲۷۲ھ/ ۸۸۶ء میں بمقام واسِط وفات پائی۔ [ابن القِفطی اس کی عمر سو سے زیادہ بتاتا ہے، ص ۱۰۳]۔

ابومعشر کی تصنیفات میں وہ سب اثرات نمایاں ہیں جو (بزبان پہلوی) ایران اور زیادہ بالواسطہ ہند کی ثقافتی تحریکات سے عربی علم و فضل پر مترتب ہو رہے تھے؛ لیکن ابومعشر نے اپنے معاصرین کے علم و فضل سے محض استفادہ ہی نہیں کیا؛ وہ اپنے زمانے میں بھی چور مصنّف مشہور تھا، چنانچہ صاحب الفہرست نے ابن المُقَفّی کی سند پر بیان کیا ہے کہ ابومعشر نے متعدّد مصنّفوں، خصوصاً سند بن علی سے سرقہ کیا۔ عصرِ حاضر کی تنقیدات سے بھی ان الزامات کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس کی متعدّد تصانیف میں حسبِ ذیل قابلِ ذکر ہیں:-

(۱) علمِ ہیئت کے فلکی جداول کا ایک مجموعہ (زیجات)، جو بدقسمتی سے ضائع ہو چکا ہے۔ اس میں گنگدِز (پہلوی گنگ دِز) کے دائرہ نصف النہار کے پیش نظر، علی ہذا اہلِ ہند کے نظریۂ ادوارِ ہزار سالہ کے مطابق، سیاروں کی حرکات کا حساب لگایا گیا ہے۔

(۲) المَدْخَل الکبیر (علمِ نجوم کا عظیم مقدمہ): یہ عربی زبان کی ایک تالیف ہے اور آٹھ اجزا پر منقسم، لیکن ابھی تک عربی میں شائع نہیں ہوئی۔ لاطینی میں اس کتاب کا ترجمہ دو مرتبہ ہو چکا ہے: اوّل جونز (Johannes Hispalensis) نے ۱۱۳۰ء میں کیا اور پھر ہرمنس سیکنڈس (Hermannus Secundus) یادی جرمن (the German) نے ۱۱۵۰ء میں، جس کا آگے چل کر مسیحی یورپ نے بڑا اثر قبول کیا۔ اس کے لاطینی مخطوطات کثرت سے ہیں اور ہرمین (Hermann) کا ترجمہ تو بہت پہلے، یعنی ۱۴۸۹ء ہی میں، *Introductorium in astronomiam Albumasaris Abalachii octo continens libros partiales* کے نام سے چھپ چکا تھا۔ یہ ترجمہ وینس میں بھی پہلے ۱۴۹۵ء میں اور پھر ۱۵۰۶ء میں طبع ہوا۔ یہاں قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ اس نے علمِ نجوم کے اس مخزن میں مدّ و جزر کا ایک نظریہ بھی پیش کیا ہے، بلکہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ نے مدّ و جزر کے قوانین اسی کتاب سے اخذ کیے؛ لیکن اس میں بعض صحیح مشاہدات کے پہلو بہ پہلو ایسی تشریحات بھی شامل ہیں جو سرتاسر خیالی ہیں، مثلاً یہ کہ چاند کا اثر ہواؤں، بارش، بلکہ سارے عالم تحت القمری پر ہوتا ہے۔

(۳) احکام تحاوِیل سِنِی المواليد، جس کا ترجمہ Johannes Hispalensis نے بعنوان *De magnis coniunctionibus et annorum revolutionibus ac eorum profectionibus octo continens tractatus* کیا، جو ۱۴۸۹ء میں آگسبرگ (Augsburg) میں اور ۱۵۱۵ء میں وینس (Venice) میں طبع ہوا۔ عربی متن اسکوریال کے مخطوطے، شمارہ ۹۱۷، میں موجود ہے (براکلمان، ۱:۲۲۱، کا غلطی سے یہ خیال ہے کہ یہ مخطوطہ مقدّم الذکر کتاب کا نسخہ ہے)۔ علاوہ ازیں یہ پیرس کے قومی کتب خانے کے مخطوطے، شمارہ ۲۵۸۸، میں بھی مل سکتا ہے۔ نالینو (Nallino) کی رائے میں *De magnis coniunctionibus* ایک عربی کتاب دلالات الاشخاص العُلْوِیّة کا ترجمہ ہے مگر زُوٹر (Suter) لکھتا ہے کہ *De magnis coniunctionibus*..، اور کتاب القِرانات کے درمیان، کہ اسے بھی ابومَعْشر سے منسوب کیا جاتا ہے، کوئی تعلّق نہیں؛ لیکن، جیسا کہ جے ورنیٹ (J. Vernet) نے حال ہی کے ایک مقالے میں دکھایا ہے، دونوں کتابوں کے درمیان بہت کچھ مطابقت پائی جاتی ہے۔

(۴) النُّکَت، سابقہ رسالے کا ایک طرح کا خلاصہ، جسے جونز (Johannes Hispalensis) نے بعنوان *Flores astrologiae* ترجمہ کیا۔ عربی متن اسکوریال کے مخطوطوں، شمارہ ۹۱۸، ۱ و ۹۳۸، ۵، میں، نیز پیرس کے قومی کتب خانے کے مخطوطے، شمارہ ۲۵۸۸ کے اوراق ۱-۲۹، میں موجود ہے۔ لاطینی ترجمہ ۱۴۸۸ء میں اوگسبرگ میں اور ۱۴۸۸، ۱۴۹۵ اور ۱۵۰۶ء میں وینس میں طبع ہوا تھا۔

(۵) الألُوف فی بُیُوت العِبادات، یہ کتاب، جیسا کہ اس کے اقتباسات سے، جو بعد کے مصنّفین نے دیے ہیں، اندازہ ہوتا ہے، ان عبادت گاہوں کے حالات پر مشتمل تھی جو ہر ہزار سالہ دور میں دنیا میں تعمیر ہوئے۔

(۶) مَوالِیدِ الرِجال والنِساء، مردوں اور عورتوں کے زائچوں پر ایک رسالہ، جو بارہ ابواب میں منقسم ہے اور مخطوطۂ برلن، شمارہ ۵۸۸۱، میں محفوظ ہے۔

بعض دوسری کتابیں بھی ابومَعْشَر سے منسوب کی جاتی ہیں، لیکن ان کا مستند ہونا ابھی تک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا۔ بہر کیف ان کتابوں سے ابومعشر کے علمی کردار کا، جس کا انداز کلّی طور پر نجومیانہ ہے، کوئی دوسرا پہلو نمایاں نہیں ہوتا۔

مآخذ: (۱) براکلمان (Brockelmann)، ۱:۲۲۱ و تکملہ، ۱:۳۹۴؛ (۲) H. Suter: *Die Mathematiker und Astronomen der Araber*، ص ۲۸، تمہید، ص ۱۶۲؛ (۳) ابن القِفطی: تاریخ الحکماء، طبع لپرٹ (Lippert)، ص ۱۵۲؛ (۴) لپرٹ (J. Lippert): *Abū Ma'shars Kitāb al-ulūf*، در *WZKM*، ۱۸۹۵ء، ص ۳۵۱-۳۵۸؛ (۵) M. Steinschneider: *Die europäischen Überset zungen*، ص ۳۵-۳۸؛

(۶) P. Duhem: Le systéme du monde، ۲:۳۶۹-۸۶۰؛ (۷) C. Nallino: Scritti، ۴:۳۳۱-۳۳۲؛ (۸) G. Sarton: Introd. to the Hist. of Science، ۱:۵۶۸؛ (۹) J. Vernet: Problemas Bibliográficos en torno a Albumasar، بارسیلونا ۱۹۵۲ء.

(J. M. MILLÁS)

---

* **ابومَعْشَر نَجِیح**: بن عبدالرحمٰن السندی المدنی، مُلک یمن کا ایک غلام، جو ممکن ہے ہندی الاصل ہو اور جس نے ادائگیِ فدیہ کے بعد آزادی حاصل کی اور مدینۂ منوّرہ میں سکونت اختیار کر لی۔ اسے حدیث کا کسی قدر ضعیف راوی خیال کیا جاتا تھا، لیکن اپنی تصنیف کتاب المغازی کی بدولت وہ بجا طور پر شہرت کا مستحق ہے، جس کے کئی ایک اجزا واقدی اور ابن سَعْد کی کتاب المغازی میں محفوظ ہیں۔ اسناد کے سلسلے میں وہ ابن عمر مولٰی نافع، محمد بن کَعْب القُرظی اور مدینۂ [منوّرہ] کے دوسرے علما کا حوالہ دیتا ہے۔ ۱۶۰ھ/ ۷۷۶ء میں وہ مدینے سے رخصت ہو گیا اور اپنی وفات (ماہ رمضان (؟) ۱۷۰ھ/ ۷۸۷ء) تک بغداد میں مقیم رہا، جہاں اسے عباسی دربارِ خلافت کے متعدد امرا و اعیان کی عنایات حاصل تھیں۔ اسرائیلی تاریخ اور آنحضرت [صلی اللہ علیہ وسلم] کی حیات طیبہ کے علاوہ سنین و تواریخ کے بارے میں، بالخصوص جن کا سلسلہ اس کے سالِ وفات تک پہنچتا ہے، الطبری کی معلومات اسی سے ماخوذ ہیں.

مآخذ: (۱) براکلمان (Brockelmann): تکملہ، ۱:۲۰۷؛ (۲) بخاری: تاریخ، حیدرآباد ۱۳۶۰ھ، ص ۱۱۴؛ (۳) ابن حِبّان: مجروحین (مخطوطۂ آیا صوفیا، شمارہ ۴۹۶، ورق ۲۳۴)؛ (۴) ابن عَدِی: ضُعَفاء (مخطوطۂ طوپ قپوسرای، احمد ثالث، شمارہ ۲۹۴۳، ج ۳: ورق ۱۸۳ ب-۱۸۵ ل)؛ (۵) الخطیب البغدادی: تأریخ بغداد، قاہرہ ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۱ء، ۱۳:۴۵۷-۴۶۳؛ (۶) ابن حَجَر: تہذیب، حیدرآباد ۱۳۲۵-۱۳۲۷ھ، ۱۰:۴۱۹-۴۲۲؛ (۷) الذہبی: نُبلاء (مخطوطۂ طوپ قپوسرای، احمد ثالث، شمارہ ۲۹۱۰، ج ۶: ورق ۱۸۸ ب-۱۹۰ ل)؛ (۸) وہی مصنّف: تأریخ الاسلام، سترھویں طبقے کے متوفیوں کی کنیتوں کے ذیل میں؛ (۹) ابن قُتَیبہ: المعارف (طبع وُسْٹنفِلْٹ)، ص ۲۵۳؛ (۱۰) الیعقوبی: تأریخ، ۲:۵۲۳؛ (۱۱) یاقوت: معجم الادباء، ۳:۱۶۶؛ (۱۲) وہی مصنّف: مُشْتَرِک، ص ۲۵۶؛ (۱۳) J. Horovitz، در IC، ۱۹۲۸ء، ص ۴۹۵-۴۹۸.

(F. ROSENTHAL و J. HOROVITZ)

---

* **ابُومنصور الیاس النَفُوسی**: تاہرت کے رُستمی (خاندان کے) امام ابوالیَقظان محمد بن اَفْلح (م ۲۸۱ھ/ ۸۹۴-۸۹۵ء) کی طرف سے جَبَل نَفُوسہ اور طرابلس کا والی۔ وہ جَبَل نَفُوسہ کے ایک گاؤں تِنْدمیرہ کا رہنے والا تھا، لیکن اس کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکیں۔ بجز شہر طرابلس کے، جو اس وقت بنو اغلب کے قبضے میں تھا، طرابلس کا سارا علاقہ اس کی عملداری میں شامل تھا، جہاں اسے اپنے تقرر کے فوراً ہی بعد بربر اِباضی قبیلۂ زواغہ سے اُلجھنا پڑا، جو طرابلس سے جربہ تک کے ساحلی علاقے میں پھیلا ہوا اور قبیلۂ نَفُوسہ کے اقتدار سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا؛ چنانچہ اس قبیلے نے خَلَف بن السَّمح کے اختلافی عقائد قبول کر لیے اور اس کے بیٹے کے زیرِ قیادت، جو ان کے ہاں پناہ گزین تھا، ابو منصور کے خلاف بغاوت کر دی۔ زواغہ نے ابو منصور پر حملہ کیا، لیکن بھاری نقصانات کے ساتھ شکست کھائی، جس پر اس کا سرغنہ جزیرۂ جربہ میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا، لیکن اس کے پیرووں نے رشوت لے لی اور اُسے ابو منصور کے حوالے کر دیا.

ابن الرَقیق کے بیان کے مطابق، جس کا حوالہ الشَمّاخی نے دیا ہے، ۲۶۶ھ/ ۸۷۹ء میں جب ابوالعباس احمد بن طولون طرابلس کے اغلبی والی محمد بن قُرْہُب پر حملہ آور ہوا اور اسے شکست دے کر تینتالیس دن تک شہر طرابلس کا محاصرہ کیے رکھا تو وہاں کے باشندوں نے ابو منصور سے امداد چاہی۔ ابو منصور بارہ ہزار (سپاہیوں کے ایک) لشکر کے ساتھ شہر پر چڑھ آیا، ابن طولون پر حملہ کیا اور اسے مار بھگایا.

مآخذ: (۱) E. Masqueray: Chronique d' Abou Zakaria، الجزائر ۱۸۷۸ء، ص ۱۸۸-۱۹۴؛ (۲) الدَرجینی: طبقات المشائخ (مخطوطہ)؛ (۳) الشَمّاخی: سِیَر، قاہرہ ۱۳۰۱ھ، ص ۲۲۴-۲۲۵؛ (۴) A. de Motylinski: Le Djebel Nefousa، پیرس ۱۸۹۹ء، ص ۹۱، حاشیہ ۳؛ (۵) R. Basset: Les sanctuaires Djebel Nefousa، در JA، ۱۸۹۹ء، ص ۴۳۲.

(T. LEWICKI)

---

* **ابومَنْصُور**: [عبدالملک] رکّ بہ الثَعالِبی.

---

* **ابوالمُؤثر الصَّلْت**: بن خمیس البَہْلوی العمانی، ایک اِباضی مؤرخ اور فقیہ، جو عمان کے شہر بَہْلاء کا باشندہ تھا اور جس کی زندگی کے ٹھیک ٹھیک سنین معلوم نہیں، گو اس کا شمار تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے نصف آخر کے اِباضی علما میں ہوتا ہے۔ اس نے جو ادبی مواد چھوڑا ہے وہ بالخصوص تاریخ میں بڑا قابلِ قدر ہے۔ علاوہ ازیں اس نے اپنے زمانے کی سیاسی زندگی میں بھی بڑی سرگرمی سے حصّہ لیا، اس لیے کہ وہ امام الصَّلت بن مالک کا، جو ۲۷۳ھ/ ۸۸۶-۸۸۷ء میں معزول ہوا، پُرجوش حامی تھا.

اس کی تصانیف میں حسبِ ذیل قابلِ ذکر ہیں: (۱) الأحداث و الصِفات، جس میں الصَّلت بن مالک کے عہد میں عمان کے واقعات اور اس کی معزولی کے حالات مذکور ہیں؛ (۲) البیان و البرھان، جس میں الصَّلت ہی کے سلسلے میں اصول امانت سے بحث کی گئی ہے؛ (۳) السِیَرۃ، جس میں اباضی تحریک کی قدیم ترین ممتاز شخصیتوں کے متعلّق معلومات جمع کی گئی ہیں۔ ان تین کتابوں

کے قلمی نسخے (S. Smogorzewski) کے پاس موجود تھے؛ (۴) تفسیر الخمس مائۃ آیۃ، ان چیزوں کے متعلّق جوحرام یا حلال ہیں قرآن پاک کی پانچ سو آیات کی تفسیر.

مآخذ: (۱) السالمی: تحفۃ الاعیان فی سیرۃ اھل عمان، ۱۳۳۲ھ، ۱: ۶۵ ـ ۶۶، ۱۵۳؛ (۲) وہی مصنّف: اللَّمعۃ (اباضیہ کی چھے کتابوں کے مجموعے میں، طبع الجزائر ۱۳۲۶ھ)، ص ۲۱۹؛ (۳) E. Masqueray: *Chronique d'Abou Zakaria*، الجزائر ۱۸۷۸ء، ص ۳۹، حاشیہ؛ (۴) السیر العُمانیۃ، مخطوطہ در Lwow University، ورق ۳ الف تا ۱۶ ب، ۱۷ الف تا ۲۵ الف، ۱۳۷ الف تا ۱۴۷ب، ۱۱۵ب تا ۱۲۰ الف، ۲۶۸ الف تا ۲۷۰ب؛ (۵) A. de Motylinski: *Bibliographie du Mzab*، در *Bull. de Corr. Afr.*، ۱۸۸۵ء، ص ۲۰، شمارہ ۲۷؛ (۶) S. Smogorzewski: *Matériaux pour servir á la bio-bibliographie ibāḍite* (غیر مطبوعہ).

(T. LEWICKI)

---

* **ابوموسی الاَشعریؓ:** رکّ بہ الاَشعَری.

---

* **ابوالنَّجم الفضل (المُفَضَّل) بن قُدامہ العِجلی:** پہلی صدی ہجری/ساتویں ـ آٹھویں صدی عیسوی کا ایک عرب شاعر (جو ۱۰۵ھ/۷۲۴ء کے بعد فوت ہوا)۔ اس نے اگرچہ کئی قصیدے بھی لکھے ہیں، لیکن اس کی شہرت زیادہ تر اس کے رجزیہ اشعار پر مبنی ہے، جن میں اس نے بدوی موضوعاتِ سخن (اونٹ، گھوڑے، سیاہ گوش وغیرہ کی کیفیت) اختیار کیے اور اموی [خلفا] عبدالملک اور ہشام اور [اموی مشاہیر] عبدالملک بن بِشر اور الحجّاج کی مدح کی۔ نقّادانِ سخن، جو اسے عربی زبان کے چار بہترین رُجّاز (رجز کہنے والوں) میں شمار کرتے ہیں (اس کے ہم قبیلہ الاغلب اور دو تمیمی شاعروں العجّاج اور اس کے بیٹے رُؤبہ کے ساتھ ساتھ)، محاکات میں اسے سب سے اونچا درجہ دیتے ہیں اور بدیہہ گوئی میں بھی اس کی قادر الکلامی کے معترف ہیں۔ العجّاج سے اس کی رقابت (مُضر اور ربیعہ کی مخالفت) مشہور ہے۔ سوانح نگاروں نے ایک مضحکہ خیز منظر کا نقشہ بھی کھینچا ہے کہ جب مِرْبَد (اونٹوں کے باڑے) میں ابوالنجم ایک شُترنر پر سوار تھا تو اس نے اپنے حریف اور اس کی سانڈنی کو بھگا دیا اور یہ شعر اس کی زبان پر تھا:

[انّی و کُلُّ شاعرٍ من البشر
شیطانہٗ انثی و شیطانی ذکر]

''میں کیا انسانوں میں ہر شاعر کو شیطان اکساتے ہیں، لیکن میرا شیطان نر ہے اور اس کا مادہ''۔ [اس نے یہ شعر پڑھا اور اپنا اونٹ اس کی اونٹنی پر ڈال دیا (ابن قتیبہ، ص ۳۸۲)]۔ بایں ہمہ یہ رُؤبہ ہی تھا جس نے ابوالنجم کے ایک طویل ارجوزہ کو، جو ہشام کے سامنے پڑھا گیا، امّ الرجز کا نام دیا اور جس میں ایک بے محل لفظ کے استعمال سے ہشام غضبناک ہو گیا تھا؛ تاہم جلد ہی وہ ابوالنجم پر مہربان ہو گیا اور اسے سوادِ کوفہ میں معافی کی ایک زمین بھی عطا کی.

مآخذ: (۱) براکلمان (Brockelmann): تکملہ، ۱: ۹۰؛ (۲) Rescher: *Abriss*، ۱: ۲۲۳؛ (۳) Nallino: *Scritti*، ۶: ۹۸؛ حالاتِ زندگی اور کچھ اشعار (۴) ابن سَلّام: طبقات (طبع Hell)، ص ۱۴۸، ۱۴۹ ـ ۱۵۰، میں مل سکتے ہیں؛ (۵) ابن قتیبہ: الشعر والشعراء، ص ۳۸۱ ـ ۳۸۶؛ (۶) الأغانی، طبع اوّل، ۹: ۷۷ ـ ۸۳؛ (۷) البغدادی: خِزانۃ الأدب، ۱: ۱۰۳ و ۲: ۳۴۰ ـ ۳۵۳؛ (۸) *MMIA*، ۱۹۲۸ء، میں سوانح حیات کے بارے میں مواد کو یکجا (ص ۳۸۵ ـ ۳۹۴) امّ الرَّجَز کو شائع کیا گیا ہے (ص ۴۷۲ ـ ۴۷۹)؛ (۹) مَیْمَنی نے الطرائف الادبیۃ میں ایک لامیہ قصیدہ شائع کیا ہے، قاہرہ ۱۹۳۷ء، ص ۵۵ ـ ۷۱؛ اور متعدّد کتابوں میں اس کے منتشر اشعار درج ہیں، بالخصوص (۱۰) الجاحظ: البیان والحیوان، طبع دوم (بہ امداد اشاریہ)؛ (۱۱) الاَصمَعی: فُحُوْلَۃ، در *ZDMG*، ۱۹۱۱ء، ص ۴۹۹، ۵۰۳، ۵۱۱، ۵۱۵؛ (۱۲) ابوتمام: الحماسۃ (طبع فرایتاغ Freytag)، ص ۴۵، ۱۴۴، ۵۱۴، ۷۵۵؛ (۱۳) المَرزُبانی: المُعْجَم، ص ۳۱۰؛ (۱۴) العَسکَری: دیوان المعانی، ۱: ۱۱۳، ۲۷۹.

(CH. PELLAT)

---

* **ابونَصر:** رکّ بہ الفارابی.

---

* **ابونظّارہ:** یعقوب بن رَفائیل صَنُّوع (نیز James Sanua)، مصر کا ایک پُرنویس یہودی صحافی اور تمثیل نگار (۱۸۳۹ـ ۱۹۱۲ء)، اس نے تعلیم و تقریر، نیز طنزیہ تمثیلات لکھ کر اور انھیں سٹیج پر دکھا کر اور سب سے پہلے ابو نَظّارۃٍ زَرْقاء (=''نیلی عینک والا آدمی'') کے نام سے ایک پرچہ جاری کر کے عُرابی کی شورش پر بالواسطہ اثر ڈالا۔ یہ ایک گمنام پرچہ تھا، جو پتھر پر چھپتا تھا اور جس میں مصری فلّاحین کی عام بولی استعمال کی جاتی تھی، نیز مضحکہ خیز تصاویر (cartoons) سے اسے دلچسپ بنایا جاتا تھا۔ چونکہ یعقوب نے خدیو اور اس کے مشیروں کی تنقید کی تھی، اس لیے ۱۸۷۸ء میں اسے مصر چھوڑنا پڑا لیکن اس نے پیرس سے عربی اور فرانسیسی میں اپنے پرچے کی اشاعت کچھ وقفوں کے ساتھ جاری رکھی اور مختلف ناموں [مثلاً الحاوی اور الوطنی المصری] سے اسے خفیہ طور پر مصر بھیجتا رہا۔ اس کے پرچے شمالی افریقہ، شام اور ہندوستان بھی پہنچتے تھے۔ اس کے اخباروں میں ''ابونظّارہ'' کے علاوہ مصری زندگی کے دیگر کردار مثلاً حریص ''شیخ الحارہ'' (خدیو اسمٰعیل)، سرکاری ملازمین، تاجر، دلّال، گداگر وغیرہ بھی نمودار ہوتے تھے۔ یہ کردار اپنے خیالات کا اظہار مکالمات، خطوط، مختصر تمثیل اور جلسوں کی روئداد کی صورت میں بھی کرتے تھے۔ یعقوب فرانس کے مختلف اخبارات میں بھی مضامین لکھا کرتا تھا۔ تمثیلات کے علاوہ، جن کے متعلّق اس کا دعوی ہے کہ تیس سے زیادہ لکھیں (ایک تمثیل عربی زبان میں محفوظ ہے)، اس نے کچھ افسانے اور

رسالے بھی شائع کیے، مگر ان کی ادبی قدر و قیمت بہت کم ہے۔ جلاوطنی کے زمانے میں اس کی سیاسی اور صحافی سرگرمی کے دو دور ہیں۔ پہلے دور میں ۱۸۸۲ء تک وہ خدیو اسمٰعیل اور خدیو توفیق پر حملے کرتا رہا اور حزب الوطنی اور اس کے حامیوں کی حوصلہ افزائی۔ دوسرے دور میں عُرابی کی بغاوت کی ناکامی اور اس تحریک کے رہنماؤں کی جلاوطنی کے بعد وہ برطانیہ اور اس کے مصری مؤیدین پر برستا اور فرانس اور ترکی کو دعوت دیتا رہا کہ وہ برطانیہ کو مصر سے نکال دیں۔ اس نے محمد علی کے بیٹے شہزادہ حلیم کو مصر کے تخت پر بٹھانے کی تجویز پیش کی۔ اس نے فلّاحین مصر کی حالت کو بہتر بنانے کی بھی سرسری طور پر مہم جاری رکھی۔ بہرحال مجموعی طور پر وہ عربی زبان میں مزاحیہ اخبار نویسی اور طنزیہ تمثیل نگاری کا بانی تھا۔ [اس کے مندرجۂ ذیل رسائل بھی چھپ چکے ہیں: (۱) حسن الاشارۃ فی مسامرات ابی نظّارۃ، مصر ۱۳۲۸ھ؛ (۲) رحلۃ ابی نَظّارۃ، ۱۳۰۸ھ میں استانبول کا سفرنامہ، چاپ سنگی ۱۳۰۹ھ، مع فرانسیسی ترجمہ؛ (۳) محامد الفرنسیس و وصف باریس، پیرس ۱۸۹۰ء].

مآخذ: (۱) براکلمان (Brockelmann): تکملہ، ۳:۲۶۵-۲۶۶؛ (۲) یوسف اِلْیان سرکیس: معجم المطبوعات العربیۃ، عمود ۳۴۹-۳۵۰؛ (۳) ف- طرّازی: تأریخ الصحافۃ العربیّۃ، ۲:۲۳۸، ۲۴۷، ۲۸۳، ۲۸۴، ۳۵۴ و ۳:۸-۹؛ (۴) وہی مصنّف: *Arabic periodicals fascicle*، ۱۹۳۳ء، ص ۱۶۲-۱۶۳، ۲۷۲-۲۷۷، ۳۹۸-۳۹۹؛ (۵) ابراہیم عبدہٗ: تَطوُّر الصِحافۃ المِصْریّۃ، ۱۹۴۵ء، ص ۱۰۷، ۲۳۵، ۲۳۶؛ (۶) J. Heyworth-Dunne: *Society and politics in modern Egyptian literature*، در *Middle-East Journal*، جولائی ۱۹۴۸ء، ص ۳۰۹-۳۱۰؛ (۷) I. Krachkovskij، در *Vostok*، ۱۹۲۴ء، ص ۱۶۵-۱۶۸؛ (۸) Aimé Vingtrinier: *Abou Naḍḍāra, à Constantinople*، ۱۸۹۷ء؛ (۹) J. M. Landau: *Abou 'Naḍḍāra, an Egyptian Jewish Nationalist*، در *Jou-rnal of Jewish Studies*، ۱۹۵۲ء، ص ۳۰-۴۴؛ (۱۰) ابراہیم عبدہٗ: ابونظّارۃ قاہرہ ۱۹۵۳ء؛ [(۱۱) الکواکب السیّارۃ؛ (۱۱) الزرکلی، طبع دوم، ۹:۲۵۹].

(J. M. LANDAU)

---

* **ابُونُعَیم الاِصْفَہانی:** احمد بن عبداللہ بن اسحٰق بن موسٰی بن مِہران الشافعی، جو رجب ۳۳۶ھ/جنوری-فروری ۹۴۸ء (ابن خلّکان: یا ۳۳۴ھ؛ یاقوت: معجم البلدان، ۱:۲۹۸: ۳۳۰ھ) میں اصفہان میں پیدا ہوا اور دوشنبہ ۲۱ محرّم (ابن خلّکان: یا صفر؛ یاقوت: دوشنبہ ۲۰ محرم؛ الذہبی، السُّبکی: ۲۰ محرّم) ۴۳۰ھ/ ۲۳ اکتوبر ۱۰۳۸ء کو فوت ہوا۔ وہ فقہ اور تصوّف کا مستند عالم تھا۔ اس کا دادا محمد بن یوسف ایک مشہور زاہد مرتاض تھا، جس نے اپنے خاندان میں سے سب سے پہلے اسلام قبول کیا (ابن خلّکان)۔ خود ابُونُعیم نے حلیۃ الاولیاء (۱:۴) میں اس کا ذکر اپنے پیشرو کی حیثیت سے کیا ہے۔ اس کے باپ نے، جو خود بھی ایک عالم تھا، (یاقوت: البلدان، ۴:۳۴۴)، اسے چھے سال کی عمر ہی سے بعض اہم اساتذہ، مثلاً جعفر الخُلْدِی اور الاَصَمّ، سے تعلیم دلائی۔ ۳۵۶ھ/ ۹۶۷ء سے اس نے عراق، حجاز اور خراسان کا سفر کیا اور تحصیلِ علم کرتا رہا۔ چودہ سال تک اسے حدیث کے بہترین اساتذہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ یہ بات اس کے ہم عصر الخطیب البغدادی نے، جس نے اس کے اقتباسات بھی نقل کیے ہیں (تاریخ بغداد، ۱۲: ۴۰۷، ۴۱۲)، نیز الذہبی اور السُّبکی نے بیان کی ہے۔ لیکن نہ تو الخطیب نے اور نہ یاقوت نے اسے ان علما میں شامل کیا ہے جن کے تراجم انھوں نے لکھے ہیں۔ ان لوگوں کی تعداد جنھوں نے ابُونُعَیم سے حدیث روایت کی ہے اسّی کے قریب بیان کی جاتی ہے۔ اس کے ایک معاصر السُّلَمی نے، جو عمر میں اس سے بڑا تھا، ایک واسطے کے ساتھ اس کی سند پر ایک حدیث روایت کی ہے (طبقات الصوفیۃ، بذیل ابو العبّاس بن عطاء)۔ بقول السُّبکی، جو اس کے قریب ترین شاگردوں میں تھا، الخطیب کو یہ اعتراض ہے کہ ابونعیم اجازات کے معاملے میں سہل انگاری برتتا تھا [انہ یقول فی الاجازۃ "أخبرنا" من غیر انْ یُبیّن، طبقات، ۳:۱۰] لیکن الذہبی، ص ۲۷۸، اس بارے میں اس کی تردید کرتا ہے [اور خود السُّبکی نے بھی اس الزام کا جواب دیا ہے]۔ حنبلیوں اور شافعیوں کے جھگڑے کے باعث اس کے ہم شہر ابوعبداللہ بن مَنْدَہ نے اس پر شدید تنقید کی (قب براکلمان: تکملہ، ۱:۲۸۱) اور اسے زدوکوب کیا گیا؛ یہاں تک ہوا کہ لوگوں نے اسے اصفہان کی مسجد سے نکال دیا، لیکن اس سے اس کی جان بچ گئی، کیونکہ روایت ہے کہ جب امیر سبکتگین نے اس شہر کو سر کیا تو ان تمام لوگوں کے قتلِ عام کا حکم دے دیا جو اس مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے جمع ہوے تھے۔ اس واقعے کو اس کی کرامات میں شمار کیا جاتا ہے۔ النَّبْہانی (قب براکلمان: تکملہ، ۲:۷۶۳ بعد) لکھتا ہے کہ وہ مسجد دو دفعہ گری اور اس کے نیچے مجمع کچلا گیا، کیونکہ ابُونُعَیم نے اسے بددعا دی تھی۔ ابونعیم کی کتاب حلیۃ الاولیاء و طبقات الاصفیاء (قاہرہ ۱۳۵۱ھ/ ۱۹۳۲ء-۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء) ۴۲۲ھ/ ۱۰۳۱ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی (دیکھیے ۱۰:۴۰۸)۔ یہ کتاب اس نظریے کو جسے وہ حقیقی تصوّف سمجھتا تھا تقویت پہنچانے کے لیے لکھی گئی تھی (۱:۴)۔ تصوّف کے عمومی بیان کے بعد اس نے اس لفظ کے مختلف اشتقاقات کا ذکر کیا ہے اور بالخصوص اس کے مادّۂ صُوف سے مشتق ہونے کا، جس پر اس نے ایک کتاب لَبْس الصُّوْف کے نام سے لکھی ہے اور اس میں صُوف کے اضافی معنی عجز و انکسار پر بہت زور دیا ہے (۱:۲۰، ۲۳)۔ باقی کتاب چھے سو انچاس متّقی اشخاص (نُسّاک) کے حالات و اقوال پر مشتمل ہے، جنھیں صوفی شمار کیا گیا ہے اور جن کی ابتدا چہار خلفاے راشدین سے کی گئی ہے۔ اس سے تصوّف اور دینِ راسخ کے ایک دوسرے میں نفوذ کرنے کی شہادت ملتی ہے۔ ہر باب اس فقرے سے شروع ہوتا ہے: "قال الشیخ (ابونُعَیم)"۔ یہ کتاب السُّلَمی کی طبقات سے مختلف ہے، جس میں صرف اقوال درج کیے گئے ہیں اور حکایات بہت کم بلکہ کلیۃً نہیں ہیں۔ کہا جاتا

پنی اس تصنیف کو نیشاپور لایا، جہاں اس نے اسے چار سو درہم میں بیچ ڈالا۔ ابن الجوزی نے صفۃ الصفوۃ میں اس کے اقتباسات استعمال کیے ہیں۔

اس کی دوسری بڑی تصنیف ذکر اخبار اصفہان (طبع ڈیڈرِنگ (S. Dedering)، لائڈن ۱۹۳۱ء) ہے، جس میں اصفہان کی مختصر سی تاریخ اور مقامی جغرافیہ بیان کرنے کے ساتھ اس شہر کے اشخاص ـــ زیادہ تر علما ـــ کے سوانح حیات درج کیے گئے ہیں۔ اس موضوع پر چند مصنّفین اس سے پہلے بھی لکھ چکے تھے (قبّ ڈیڈرِنگ Dedering، ۲: viii تا x)۔ اس کے علاوہ اس نے اثبات نبوّت، طبّ نبوی اور رسول [اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم] کے اوّلین متّبعین کے فضائل پر چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی لکھی ہیں، جن میں بخاری اور مسلم سے اقتباسات دیے گئے ہیں۔ [اس کی تصنیف دلائل النبوۃ شائع ہو چکی ہے، حیدرآباد دکن ۱۳۲۰ھ۔] اس نے اصفہان میں وفات پائی اور یاقوت (۱: ۲۹۸) کا بیان ہے کہ اس کا مزار مُرذُباب میں ہے۔

مآخذ: (۱) Brockelmann: تکملہ، ۱: ۶۱۶ بعد؛ (۲) یاقوت، اشاریہ؛ (۳) ابن خلِّکان [: وفیات]، مطبوعۂ قاہرہ، شمارہ ۳۲؛ (۴) الذہبی: تذکرۃ الحفّاظ، حیدرآباد ۱۳۳۴ھ، ۳: ۲۷۵ - ۲۷۹؛ [(۵) وہی مصنّف: میزان الاعتدال، ۱: ۵۲]؛ (۶) السُّبکی: طبقات الشافعیۃ، قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ص ۷ - ۹؛ (۷) ابن حجر: لِسان المیزان، ۱: ۲۰۱؛ (۸) الشّعرانی: الطبقات الکبری، قاہرہ ۱۳۱۵ھ، ۱: ۵۶؛ (۹) ابن العماد: شذرات الذہب، ۳: ۲۴۵؛ (۱۰) النّبہانی: جامع کرامات الاولیاء، قاہرہ ۱۳۲۹ھ، ۱: ۲۹۳؛ [(۱۱) الخوانساری: روضات الجنات، ۱: ۵۷]۔

(J. PEDERSEN)

* **ابو نُعَیم الفضل:** بن دُکَین المُلائی عالم حدیث اور تاریخی اخبار کا ناقل (ولادت ۱۳۰ھ / ۷۴۸ء، وفات ۲۹ شعبان ۲۱۹ھ / ۸ ستمبر ۸۳۴ء)، جو [حضرت] رسول [اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم] کے صحابی طلحہؓ کے خاندان کا مولٰی تھا۔ وہ کوفے میں رہتا تھا، مگر کبھی کبھی بغداد بھی جایا کرتا تھا، جہاں ایک دفعہ وہ خلیفہ المأمون کے ہاں باریاب ہوا۔ دُکین کا اصلی نام عَمْرو بیان کیا جاتا ہے۔ ابو نُعَیم کے ایک بیٹے عبدالرحمٰن (غالبًا مصنّفِ تفسیرِ قرآن، جو الفہرست، ص ۳۴، میں مذکور ہے) اور ایک پوتے احمد بن مِیثم کا ذکر بھی آیا ہے۔

ابو نُعَیم کو احادیث کا نہایت ثِقہ راوی خیال کیا جاتا ہے اور اس وجہ سے بھی اس کی بہت ستائش کی جاتی ہے کہ اس نے قرآن کے غیر مخلوق ہونے کے عقیدے کی حمایت میں معتزلہ کے مذہبی احتساب کا مقابلہ بڑی جرأت کے ساتھ کیا، لیکن اس کے برخلاف اس پر شیعہ ہونے کا شُبہہ کیا جاتا تھا۔ وہ [حضرت] علیؓ کے لیے اپنے دل میں عقیدت و احترام کا جذبہ رکھنے کا معترف تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بیان کرتا تھا کہ اس معاملے میں وہ ایک معتدل روش رکھتا ہے۔ وہ حامیانِ علیؓ کے حلقوں میں آمد و رفت رکھتا تھا اور اس نے بسا اوقات آل ابی طالب اور علویوں کے بارے میں روایات نقل کی ہیں (قبّ مثلاً ابن سعد، ۳: ۱۶۰ و ۴/ ۱: ۲۳ بعد، ۳۰ و ۵: ۶۶ بعد، ۲۳۶ - ۲۳۸؛ (۲) ابوالفَرَج الاصفہانی: مقاتل الطالبیین، قاہرہ ۱۳۶۸ھ / ۱۹۴۰ء، ص ۴۶)۔ وہ شیعوں اور عباسیوں دونوں میں مقبول و محترم تھا۔ جب وہ فوت ہوا تو سب سے پہلے ابو طالب کی اولاد میں سے ایک آدمی نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ بعد ازاں کوفے کے عبّاسی والی نے، جو پانچویں واسطے سے حاکمِ وقت خلیفہ المعتصم کا چچا زاد بھائی تھا، دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھانے پر اصرار کیا۔

ابو نُعَیم کی تصانیف میں سے کوئی چیز ابھی تک روشنی میں نہیں آئی، البتہ مؤرّخوں نے کثرت سے اس کے حوالے دیے ہیں۔ اس نے زیادہ تر مشاہیر کی سیرت کے متعلّق معلومات بہم پہنچائی ہیں اور کسی قدر عام تاریخی معلومات کو بھی نقل کرتا ہے۔ تاریخ کے موضوع پر غالبًا اس کی اپنی کوئی تالیف نہیں ہے۔ الفہرست، ص ۲۲۷، میں اسے عبادات اور فقہی مسائل کے متعلّق دو کتابوں کتاب المناسک اور کتاب المسائل فی الفِقہ کا مصنّف بتایا گیا ہے۔

مآخذ: (۱) ابن سعد: طبقات، ۶: ۲۷۹ بعد و مواضع کثیرہ؛ (۲) البلاذُری: انساب الاشراف (طبع Goitein)، ج ۵: اشاریہ؛ (۳) بخاری: تأریخ، حیدرآباد ۱۳۱۶ھ، ۴/ ۱: ۱۱۸؛ (۴) ابن قُتَیبہ: المعارف، ص ۱۲۱، ۲۶۲؛ (۵) الطبری: اشاریہ؛ (۶) ابن حِبّان: ثِقات، مخطوطہ طوپ قپوسرای، احمد ثالث، شمارہ ۲۹۹۵، ورق ۲۹۲ ب؛ (۷) الأغانی، طبع اوّل، ۱۴: ۱۱؛ (۸) الفہرست، ص ۲۲۷؛ (۹) الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، قاہرہ ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۱ء، ۱۲: ۳۴۶ - ۳۵۷؛ (۱۰) عبدالغنی الجمّاعیلی: کمال، در MSOS As.، ۱۹۰۴ء، ص ۱۸۹ - ۱۹۳؛ (۱۱) الذہبی: حُفّاظ، (طبع وُسْٹِنْفِلْٹ)، ۱: ۸۲؛ (۱۲) وہی مصنّف: نُبلاء، مخطوطۂ طوپ قپوسرای، احمد ثالث، شمارہ ۲۹۱۰، ۷: ورق ۱۷۴ الف تا ۱۷۸ الف؛ (۱۳) ابن حجر: تہذیب، حیدرآباد ۱۳۲۵ - ۱۳۲۷ھ، ۸: ۲۷۰ - ۲۷۶؛ [(۱۴) ابن الأثیر: الکامل، مصر ۱۳۰۱ھ، ۶: ۱۸۱؛ (۱۵) مناقب الامام احمد، ص ۳۹۵]۔

(روزنتھال FR. ROSENTHAL)

* **ابُو نُمَیّ اوّل و ثانی:** شرفائے مکّہ (رکّ بہ مکّہ)۔

* **ابو نُواس:** الحسن بن ہانی الحَکَمی، عبّاسی دور کا مشہور ترین عربی شاعر، الاہواز میں ۱۳۰ھ / ۷۴۷ء اور ۱۴۵ھ / ۷۶۲ء کے درمیان پیدا ہوا اور ۱۹۸ھ / ۸۱۳ء اور ۲۰۰ھ / ۸۱۵ء کے درمیان بغداد میں فوت ہوا (حمزہ الاصفہانی، مخطوطۂ فاتح، شمارہ ۳۷۷۳، ورق ۶ الف، کا بیان بھی یہی ہے)۔ چونکہ اس کے دیوان میں الامین (م ۱۹۸ھ / ۸۱۳ء) کا ایک مرثیہ بھی شامل ہے، اس لیے اس سے پہلے کی تاریخیں غیر اغلب ہیں۔ اس کا باپ آخری اموی خلیفہ مروان ثانی کی فوج میں ملازم اور الجرّاح بن عبداللّٰہ الحکمی کا مولٰی تھا، جو جنوبی عرب کے ایک قبیلے

سعد بن عَشِیرہ میں سے تھا۔ ابونُواس کی نسبت [''الحکمی''] اور شمالی عربوں سے اس کے تنفّر کی وجہ یہی تھی۔ اس کی ماں گُلبان (=گُلبان) ایرانی تھی۔

ابُونُواس ابھی خوردسال تھا کہ بصرے آیا اور بعدازاں کوفے چلا گیا۔ اس کا پہلا استاد والِبہ بن الحُبّاب شاعر تھا، جس کے متعلّق کہا جاتا ہے کہ ابونُواس کے ساتھ اس کے تعلّقات عاشقانہ تھے۔ والِبہ کی وفات کے بعد (قب مرثیہ، دیوان، قاہرہ ۱۸۹۸ء، ص ۱۳۲) اس نے شاعر اور ''راوی'' خلف الاحمر کی شاگردی اختیار کی۔ اس نے قرآن اور حدیث کا کچھ علم بھی حاصل کیا اور ابوعُبَیدہ، ابوزَید وغیرہ نحویوں کے درس میں شرکت کی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے پرانے دستور کے مطابق زبان دانی کو بہتر بنانے کے لیے کچھ زمانہ بدوی لوگوں میں بھی گزارا۔

تحصیلِ علم کی تکمیل کے بعد ابونُواس بغداد پہنچا تاکہ مدحیّہ قصیدے پیش کر کے خلیفہ کی خوشنودی حاصل کرے۔ لیکن دربارِ خلافت میں اس کی طرف زیادہ التفات نہ ہوا، البتہ بَرامکہ [خاندانِ وزرا] نے اس کی زیادہ قدر کی۔ بَرامکہ کے زوال پر اسے مصر کی طرف بھاگنا پڑا، جہاں اس نے دیوان الخراج کے رئیس الخطیب بن عبدالحمید، کی شان میں قصائد لکھے، مگر تھوڑے عرصے بعد ہی اسے اپنے محبوب شہر بغداد کو لوٹ آنے کا موقع مل گیا اور یہیں اس نے الامین کے منظورِ نظر مصاحب کی حیثیت سے اپنی زندگی کے درخشندہ ترین سال بسر کیے؛ تاہم الامین نے بھی اسے ایک دفعہ شراب نوشی سے منع کیا، بلکہ اس بنا پر اسے قید بھی کر دیا۔

اس کی موت کے بارے میں مختلف روایات بیان کی جاتی ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس کی موت زنداں میں واقع ہوئی، جہاں وہ ایک ایسا شعر کہنے کی پاداش میں قید کر دیا گیا تھا جس میں مذہب کی توہین پائی جاتی تھی، دوسرا بیان یہ ہے کہ اس نے ایک مے خانے کی مالکہ کے گھر میں وفات پائی اور ایک تیسری روایت کی رُو سے وہ آلِ نوبخت کے علم دوست شیعہ خاندان کے گھر میں فوت ہوا۔ اس خاندان، بالخصوص اسمٰعیل ابن ابی سہل النوبختی سے اس کے گہرے دوستانہ مراسم تھے، اگرچہ یہ بات اسے اسمٰعیل کی شان میں دل آزار ہجویہ اشعار لکھنے سے مانع نہ ہوئی (دیوان، ص ۱۷۱ ببعد)؛ اس لیے یہ بیان کہ اسے نوبختیوں نے مروایا تھا غالباً محض بہتان ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ اس خاندان نے ابونُواس کی وفات کے بعد بھی اس کی نظموں کو جمع کرنے میں دلچسپی لی اور حمزہ الاصفہانی نے ان سے اخذ کردہ معلومات کو استعمال کیا ہے (قب مخطوطۂ فاتح، شمارہ ۳۷۷۳، ورق ۳ ب)۔

خود عرب نقّادانِ سخن ابونُواس کو جدید دبستانِ شعر کا نمائندہ خیال کرتے تھے۔ قدما میں امرؤالقیس کا جو مقام تھا وہی نئے شاعروں [مُحدَثین] میں ابونُواس کو حاصل ہے (مخطوطۂ فاتح، شمارہ ۳۷۷۳، ورق ۷ الف)۔ زیادہ سے زیادہ بَشّار بن بُرد شاید اس کے مرتبے کو پہنچ سکتا ہے۔ اگرچہ ابونُواس اپنے قصیدوں میں عام طور پر قدیم طرز ہی کی پیروی کرتا ہے (دیکھیے مثلاً دیوان، ص ۷۷، قصیدہ جو ''منہو کہ'' کے نام سے مشہور ہے اور فضل بن الربیع کی شان میں لکھا گیا تھا؛ اس پر ابن جِنّی نے ایک مفصّل شرح لکھی ہے)؛ تاہم دوسری اصنافِ سخن، خصوصاً نسیب کا اس نے مذاق اڑایا ہے۔ ایک جگہ وہ یک لخت [آداب قصیدہ کو ملحوظ رکھے بغیر] یوں آغاز کرتا ہے: ''میں اس لیے نہیں روتا ہوں کہ [محبوبہ کا] مسکن صحرائے بے آب و گیاہ بن گیا ہے...'' (فاتح، شمارہ ۳۷۷۵، ورق ۱۲ الف)۔ محبوبہ کی سابقہ جاے سکونت کے بجاے وہ ان مے خانوں پر آنسو بہاتا ہے جو اجڑ گئے اور ان یاران ہم پیالہ کے لیے روتا ہے جو دور دور بکھر گئے (قب نیز نظم، جس کا ترجمہ H. Ritter: *Orientalia*، ج ۱، استانبول ۱۹۳۲ء، نے کیا ہے)۔

ابونُواس کے بہترین اشعار وہ ہیں جو اس نے شراب اور امرد پرستی کے موضوع پر لکھے ہیں۔ وہ نہ صرف تازہ بتازہ سُروں میں اِن ہر دو قسم کی لذتوں کے گیت گا سکتا ہے بلکہ مزاح آمیز حقیقت نگاری کے ساتھ اس میدان میں اپنے تجربوں اور کارناموں کا نقشہ بھی کھینچتا ہے۔ ایک موقع پر جب ان نوجوانوں نے جنھیں اس نے اس غرض سے شراب پلا کر مدہوش کر دیا تھا کہ ان سے دل لگی کر سکے اس کی خوب مرمّت کی تو وہ اپنے آپ پر طنز کرنے سے بھی نہیں چُوکا (قب مثلاً فاتح، شمارہ ۳۷۷۵، ورق ۲۱)۔ اسی طرح کی طنز اس کے ان نوحوں میں بھی موجود ہے جو اس نے اپنے جسم کے بارے میں، جسے بیماری نے مضمحل کر دیا تھا، لکھے ہیں (دیوان، ۱۳۱ ببعد)۔ ابونُواس اپنے گناہوں کا اعتراف پوری کشادہ دلی اور صاف بیانی کے ساتھ کرتا ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی دعوت دیتا ہے کہ وہ بھی اسی طریق سے پشیمانی کا اظہار کریں۔ وہ اپنے ناصحین سے، جو اسے ملامت کرتے ہیں، کہتا ہے کہ وہ اسے اپنے حال پر چھوڑ دیں، کیونکہ ان کی ملامت اسے اَور بھی گناہ پر ابھارتی ہے اور نہ وہ قبر میں پہنچنے سے پہلے اپنی اصلاح کرنے کا ارادہ ہی رکھتا ہے۔ وہ اس بات پر فخر کرتا ہے کہ اس نے شرک کے سوا کسی ایسی حرکت سے اجتناب نہیں کیا جو اللہ کو ناراض کرنے والی ہو (دیوان، ص ۲۸۱)۔ وہ اسلام کے جملہ آئین و شعائر کی ہنسی اُڑاتا ہے، مگر اسلام کے خلاف اس کے اشعار کسی فکری اصول کی پیداوار نہیں، بلکہ ان لذائذِ دنیوی کی محبت پر مبنی ہیں جن سے اسلامی اوامر روکتے ہیں۔ بالآخر وہ بھی اللہ کی مغفرت کا اُمیدوار ہے اور اپنی ہستی کو اس قدر حقیر خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے اعمال کا حساب لینے کی پروا نہ ہوگی۔ (فاتح، شمارہ ۳۷۷۵، ورق ۱۶) اس کی زُہدیّات اس بات کا ثبوت نہیں کہ بڑھاپے میں وہ تائب ہو گیا تھا۔ ایسی نظمیں غالباً اس نے عارضی نفسیاتی کیفیت کے دوران میں لکھی ہوں گی یا انھیں ایسی اتّفاقی نظمیں سمجھا جا سکتا ہے جو مخصوص جذبات کے ماتحت لکھی گئیں۔ اس کے علاوہ بھی دیوان میں کثرت سے متضاد باتیں موجود ہیں۔ انھیں ذہنی تبدیلی کا ثبوت یا ریاکاری نہ سمجھنا چاہیے، کیونکہ ابو نُواس کو نفسِ مضمون کی جگہ اس بات سے زیادہ دلچسپی تھی کہ کسی مضمون کو پُرلطف انداز میں کس طرح باندھا جائے۔

ابونُواس کی ایسی نظمیں جن میں عورتوں کے ساتھ عشق کا تذکرہ ہے لڑکوں سے معاشقے والی نظموں کی بہ نسبت بہت کم ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابونُواس

صرف ایک دفعہ ایک عورت کے عشق میں مبتلا ہوا تھا، جو جنّان نامی ایک لونڈی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ حمزہ الاِصبہانی اس بیان کی پُرزور تردید کرتا ہے اور ایسی عورتوں کی ایک طویل فہرست دیتا ہے جن سے ابونُواس کا معاشقہ بیان کیا جاتا ہے (فاتح، شمارہ ۳۷۷۴، ورق ۶۷ ب)؛ لیکن یہ صرف نام ہیں جو اس کی نظموں سے لیے گئے ہیں اور شاید فرضی بھی ہوں.

دیوانِ ابونُواس اس عربی ادب کی اوّلین مثال ہے جس میں شکار کے متعلّق نظموں [طردیات] کا ایک خاص باب شامل ہے۔ ان نظموں میں زیادہ تر شکاری کتّوں، بازوں اور گھوڑوں، لیکن اس کے ساتھ ہی شکار کے مختلف قسم کے جانوروں کا بیان ہے۔ وہ رنگینی و لطافتِ زبان کے اعتبار سے قابلِ دید ہیں۔ جانوروں کے متعلّق ان بیانات میں جو قدیم بدوی شاعری میں موجود ہیں ابونواس کو اس صنفِ سخن کے نمونے مل سکتے تھے، لیکن بظاہر اس نے اسے ایک مستقل صنف بنا دیا تھا۔ بعد میں ابن المعتزّ نے اس صنفِ شعر کو مزید ترقی دی.

بحیثیتِ مجموعی ابونواس صحیح زبان استعمال کرتا ہے؛ تاہم کبھی کبھی اپنے زمانے کی عام بول چال کے لفظ بھی لکھ جاتا ہے۔ زبان کی جو غلطیاں اس نے کی ہیں وہ اس کے پیشروؤں کے ہاں پہلے سے معمول بن چکی تھیں (قب J. Fück: *Arabīya*، ص ۵۱ ببعد)۔ اس کی نظموں کی خاص خاص قسموں میں فارسی کے الفاظ بکثرت آئے ہیں (مثلاً دشتِ بیابان (فاتح، شمارہ ۳۷۷۵، ورق ۲۹)، یعنی ایک مکمل ترکیب اضافی استعمال کی گئی ہے)۔ مجموعی طور پر ایرانی تہذیب کو اس کی شاعری میں ایک قابلِ ذکر مقام حاصل ہے (قب Gabrieli، در *OM*، ۱۹۵۳ء، ص ۲۸۳)۔ اس کے کلام میں اکثر تاریخِ ایران کے بہادروں کا حوالہ ملتا ہے، لیکن چونکہ وہ قدیم عربوں کا ذکر بھی جا بجا کرتا ہے اس لیے یہ بات چنداں اہمیت نہیں رکھتی اور اس کی بنا پر ابونُواس کو 'شُعُوبیّہ' کا طرفدار شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا کلام محض دورِ عبّاسی کے ثقافتی پسِ منظر کا آئینہ دار ہے، جس میں ایرانی عنصر کا اثر بتدریج بڑھتا گیا.

دنیائے عرب کے تخیل میں ابونُواس کی شخصیت ہارون الرشید سے گہرے روابط کے ساتھ وابستہ ہے، جو اپنی جگہ پر خلافت کی شان و شکوہ کا مجسمہ تھا۔ اسی حیثیت سے اس کا نام الف لیلۃ میں آ گیا ہے اور وہ ابھی تک عوامی کہانیوں کی ایک مقبول و معروف ہستی ہے، جن میں وہ زیادہ تر ایک درباری مسخرے کا کردار ادا کرتا نظر آتا ہے (قب A. Schaade: *Zur Herkunft der Urform einiger Abū Nuwās Geschichten in 1001 Nacht*، در *ZDMG*، ۱۹۳۴ء، ص ۲۵۹ ببعد؛ (۲) وہی مصنّف: *Weiteres zu Abū Nuwās in 1001 Nacht*، در *ZDMG*، ۱۹۳۶ء، ص ۶۰۲ ببعد؛ (۳) W. H. Ingrams: *Abū Nuwās in life and in Legend*، لنڈن ۱۹۳۳ء، قب Schaade، در *OLZ*، ۱۹۳۵ء، ص ۵۲۵ - ۵۲۷).

ابونُواس نے اپنی نظموں کا کوئی مجموعہ خود تیار نہیں کیا۔ اس طرح ایک طرف تو اس کے کلام کا بہت سا حصّہ ضائع ہو گیا، خصوصاً اس کی وہ نظمیں جو اس نے مصر میں لکھی تھیں اور جو عراق میں غیر معروف رہیں (قب فاتح، شمارہ ۳۷۷۳، ورق ۴ الف)، دوسری جانب بہت سی نظمیں، بالخصوص وہ جو مے نوشی اور امرد پرستی کے متعلّق ہیں، اس سے غلط طور پر منسوب کر دی گئیں۔ اس کا دیوان متعدّد تصحیح شدہ روایتوں کی صورت میں موجود ہے، جن میں سے دو اہم نسخے الصُّولی اور حمزہ الاصبہانی کی روایت پر مبنی ہیں (مؤخّر الذّکر کے لیے دیکھیے E. Mittwoch، در *MSOS*، ۱۹۰۹ء، ص ۱۵۶ ببعد)۔ الصُّولی نے اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ تمام جعلی نظمیں خارج کر دی جائیں اور اس نے نظموں کو مختلف ابواب میں حروفِ ہجا کے مطابق مرتّب کر دیا ہے۔ حمزہ اتنی ناقدانہ نظر سے کام نہیں لیتا، کیونکہ یقین کے ساتھ کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی مشکوک نظم اصلی نہیں ہے؛ اس لیے اس کا مجموعہ الصُّولی کے مجموعے سے تین گنا ضخیم ہے اور اس میں تقریباً پندرہ سو نظمیں ہیں، جو تیرہ ہزار اشعار پر مشتمل ہیں۔ مزید براں وہ بہت سے اشعار کے ساتھ 'اخبار' کا اضافہ کر دیتا ہے، جو الصُّولی کے ہاں مفقود ہے اور بعض ابواب کے ساتھ ایک شرح بھی اس نے بڑھا دی ہے۔ اس نے اپنے مجموعے میں وہ نام نہاد رسالۂ شامی بھی شامل کر دیا ہے جو ابونُواس کے سرقات کے بارے میں مُہَلْہِل بن یَمُوت نے اسے لکھا تھا۔ خمریّات ابونُواس کا جو ایڈیشن اہلوارت (Ahlwardt) نے تیار کیا وہ الصُّولی کی روایت کے مطابق ہے اور قاہرہ کا ایڈیشن (۱۸۹۸ء) حمزہ کی روایت پر مبنی ہے۔ آج ہمارے پاس اس وقت کی بہ نسبت جب کہ مذکورۂ بالا ایڈیشن تیار ہوئے دونوں نسخوں کے بہتر مخطوطات موجود ہیں، بالخصوص استانبول میں۔ [نزھۃ الجلاس فی نوادر ابی نُواس بھی چھپ چکی ہے، چاپ سنگی، مصر ۱۲۸۱ھ۔ یہی کتاب سالب الھموم و جالب العلوم کے نام سے بھی چھپی ہے، بمبئی ۱۸۸۹ء].

مآخذ: (۱) طبعات: (ا) W. Ahlwardt: *Dīwān d. Abū Nuwās*، ج ۱، [الخمریات] *Die Weinlieder*، Greifswald ۱۸۶۱ء [ج ۲ (: فی الطرد)، طبع فان کریمر، وی انا ۱۸۵۵ء، مذکور در (۱۰)]؛ (ب) چاپ سنگی، قاہرہ ۱۲۷۷ھ؛ (ج) طبع [ٹائپ] بیروت ۱۳۰۱ھ؛ (د) طبع اسکندر آصف، قاہرہ ۱۸۹۸ء، ۱۹۰۵ء؛ (ہ) طبع محمود کامل فرید، قاہرہ ۱۹۳۲ء؛ (و) طبع النَّبہانی، قاہرہ ۱۳۲۲ - ۱۳۲۳ھ؛ (ز) طبع ا - ع - الغزالی، قاہرہ ۱۹۵۳ء؛ (۲) حدیقۃ الإناس فی شعر ابی نُواس، بمبئی ۱۳۱۲ھ؛ (۳) منصور عبد المتعالی: الفکاھۃ والاستئناس فی مُجُون ابی نُواس، قاہرہ ۱۳۱۶ھ؛ ترجمہ: (۴) A. von Kremer: *Diwan des Abû Nowâs, des grössten lyrischen Dichters der Araber*، وی انا ۱۸۵۵ء؛ مآخذ سوانح: (۵) ابن قتیبہ: کتاب الشعر، ص ۵۰۱ - ۵۵۲؛ (۶) ابن المعتزّ: طبقات الشعراء المُحدَثِین، در *GMS*، ص ۸۷ - ۹۹؛ (۷) المُرزُبانی: مُوَشّح، قاہرہ ۱۲۹۴ھ، ص ۲۶۳ - ۲۸۹؛ (۸) ابن الأنباری: نزھۃ، ۹۶ - ۱۰۳؛ (۹) الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، ۷: ۳۶۰ - ۴۴۹؛ (۱۰) ابن خلّکان، شمارہ ۱۶۹؛

[(۱۱) ابن عساکر: تہذیب، ۴: ۲۵۴؛] (۱۲) معاھد التنصیص، ۱: ۸۳؛ (۱۳) نزھة الجلیس، ۱: ۳۰۲؛ (۱۴) الثعالبی: العقد الفرید، ۳: ۳۳۷؛ (۱۵) خزانة الادب، ۱: ۱۶۸؛ (۱۶) الأغانی، ج ۷، ۱۷، ۱۸، بہ اِمدادِ اشاریہ؛] عصرِ حاضر کے مصنّفین: (۱۷) براکلمان (Brockelmann)، ۱: ۷۴-۷۶ وتکملہ، ۱۱۴-۱۱۸، ۹۴۰ و ۳: ۱۱۹۳؛ (۱۸) وہی مصنّف، در آ، لائڈن، طبع اوّل؛ (۱۹) H. Ritter: در *IA*؛ (۲۰) ابن منظور: اخبار ابی نُواس تاریخہ، نوادرہ، شعرہ، مُجُوْنہ، قاہرہ ۱۹۲۴ء؛ (۲۱) ابوالعباس مصطفٰی عمّار: ابو نُواس، حیاتہ وشعرہ، قاہرہ، بلاتاریخ؛ (۲۲) عُمر فَرُّوخ: ابونواس، شاعر ھارون الرشید ومحمد امین، ج ۱: دراسة ونقد، بیروت ۱۹۳۲ء؛ (۲۳) عبدالرحمٰن صِدْقی: ابونُواس، قاہرہ ۱۹۴۲ء؛ [(۲۴) ابن ہفان: اخبار ابی نواس؛] (۲۵) V. Rosen: *Ob Abu Nuwas i ego poesii*، در *Pamiati Akademika Rozena*، ماسکو-لینن گراڈ ۱۹۴۷ء، ص ۵۷-۷۱؛ (۲۶) F. Gabrieli: *Abû Nuwâs, Poeta Abbaside*، در *OM*، ۱۹۵۳ء، ص ۲۷۹-۲۹۶؛ (۲۷) E. Wagner: *Der Überlieferung des Abū Nuwās Diwān*، Wiesbaden ۱۹۵۸ء.

(EWALD WAGNER)

---

* **ابوالوَفاء البُوْزَجانی**: محمد بن محمد بن یحیٰی بن اسمٰعیل بن العباس، [الفھرس التمھیدی، ص ۳۱۹، میں اس کا نام احمد بن اسحٰق درج ہے، جو درست نہیں] عظیم ترین عرب ریاضی دانوں میں سے ایک، جو غالبًا ایرانی النسل تھا، یکم رمضان ۳۲۸ھ/ ۱۰ جون ۹۴۰ء کو قُہستان کے شہر بُوزجان میں پیدا ہوا۔ ریاضی کا علم اس نے سب سے پہلے اپنے دو چچاؤں ابوعمرو المُغازِلی اور ابوعبداللہ محمد بن عَنْبَسَہ سے حاصل کیا۔ ان میں سے مقدّم الذّکر نے ابویحیٰی المَرْوَزی (یا الماوَرْدی) اور ابوالعلاء بن کَرْنِیب سے ہندسہ کا علم حاصل کیا تھا۔ ۳۴۸ھ/ ۹۵۹ء میں ابوالوفاء عراق چلا گیا اور اپنی وفات تک، جو رجب ۳۸۸ھ/ جولائی ۹۹۸ء میں واقع ہوئی، وہیں رہا۔ ابن الأثیر اور اس کی پیروی میں ابن خلّکان اس کا سال وفات ۳۸۷ھ/ ۹۹۷ء بتاتا ہے۔ یہ ابوالوفاء ہی تھا جس نے ۳۷۰ھ/ ۹۸۰-۹۸۱ء میں ابوحیّان التوحیدی کو وزیر سَعْدان سے متعارف کرایا اور جس کے لیے اس نے اپنی کتاب الامتاع والمؤانسة لکھی۔

ریاضی اور ہیئت کے موضوعات پر اس کی حسبِ ذیل تصانیف موجود ہیں: (۱) حساب کی ایک کتاب، بعنوان فیما یَحْتاج الیہ الکُتّاب والعُمّال من علم الحساب، یہ بعینہٖ وہی چیز ہے جس کا ذکر ابن القفطی نے المنازل فی الحساب کے نام سے کیا ہے۔ Woepke نے *JA*، ۱۸۵۵ء، ص ۲۴۶ ببعد، میں اس کتاب کے ابواب اور منازل کے عنوانات شائع کیے تھے؛ (۲) الکامل، غالبًا یہ وہی کتاب ہے جس کا ذکر ابن القفطی نے المَجِسْت کے نام سے کیا ہے۔ اس کتاب کے بعض حصّوں کا ترجمہ کارادوو (Carra de Vaux) نے کیا ہے *JA*، ۱۸۹۲ء، ص ۴۰۸-۴۷۱؛ (۳) الھَنْدَسَة (عربی اور فارسی میں)، غالبًا یہ وہی فارسی کتاب ہے جو کتب خانۂ پیرس میں *Book of the geometrical constructions* کے عنوان سے موجود تھی اور جس پر Woepke نے تبصرہ کیا ہے، *JA*، ۱۸۵۵ء، ص ۲۱۸-۲۵۶، ۳۰۹-۳۵۹۔ مؤخّر الذّکر کا خیال ہے کہ یہ کتاب ابوالوفاء کی اپنی نہیں بلکہ اس کے کسی شاگرد کی لکھی ہوئی ہے، جس نے اس کے درسوں کو یکجا کر دیا (دیکھیے نیز زُوٹر (H. Suter)، در *Abh. z. Gesch. der Naturwiss. u. d. Med.*، Erlangen ۱۹۲۲ء، ص ۹۴ ببعد)۔ افسوس ہے کہ اس نے جو شرحیں الاقلیدس (Euclid)، دایوفانطوس (Diophantus) اور الخوارزمی کی کتابوں پر لکھیں ان میں سے کوئی بھی زمانے کی دست بُرد سے محفوظ نہ رہی اور نہ علمِ ہیئت کی وہ جدولیں ہی جو الواضِح کے نام سے تیار کی تھیں؛ لیکن فلورنس، پیرس اور لنڈن میں زِیج الشامِل کے نام سے جو جدولیں کسی نامعلوم مصنّف کی ہیں وہ غالبًا ابوالوفاء ہی کی جدولوں سے تیار کی گئی ہیں۔

ابوالوفاء کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے علم المثلّث (trigonometry) کو مزید ترقّی دی۔ علم مثلّث میں اسی نے قائم الزاویہ کے بجائے Menelaus کے دعوے کے ساتھ مکمل ذوا ربعہ [الاضلاع] یعنی نام نہاد ''اقدارِ اربعہ کے قاعدے'' (جیب زوایہ (: جیب زوایہ ج = جیب زاویہ (: ۱) اور شکل مماسی (مماس (: مماس الف = جیب زاویہ ب: ۱) کو رواج دیا۔ ان کلیات سے اس نے ایک اَور کلیّہ اخذ کیا (جم ج = جم (جم ب)۔ مائل الزاویہ کروی مثلّث کے لیے غالبًا اسی نے سب سے پہلے جیب الزاویہ کا دعوٰی قائم کیا (قب Carra de Vaux، محل مذکور، ص ۴۰۸-۴۴۰)۔ ہم ۳۰ درجے کے جیب الزاویہ کا حساب لگانے کے طریقے کے لیے بھی اسی کے مرہونِ منت ہیں، جس کا نتیجہ اس کی صحیح قیمت کے ساتھ آٹھویں اعشاریہ تک مطابقت رکھتا ہے (Woepke، در *JA*، ۱۸۶۰ء، ص ۲۹۶ ببعد)۔ اس کی ہندسی اشکال بھی، جو ایک حد تک ہندی نمونوں پر مبنی ہیں، بہت جاذبِ توجہ ہیں؛ مگر دوسری طرف علم المثلث میں مماسّ، مماسِّ تام، قاطع، اور قاطع التام کو رواج دینے کا امتیاز اسے حاصل نہیں ہے، کیونکہ حَبَش الحاسب کو یہ اعمالِ ریاضی پہلے ہی معلوم تھے۔ اسی طرح چاند کی تبدیلیوں کو دریافت کرنے کا سہرا بھی اس کے سر نہیں باندھا جا سکتا جیسا، کہ L. A. Sedillot نے ۱۸۳۶ء میں دعوٰی کیا تھا۔ (اس پر ایک گرما گرم بحث چل نکلی تھی، جس میں Sedillot اور Chasles ایک طرف تھے اور Biot، Munk اور Bertrand ان کے مقابلے میں صف آرا تھے، تا آنکہ Carra de Vaux نے اس بات کی حقیقت مشرّح بیان کر دی)۔ [ابوالوفاء شاعر بھی تھا].

مآخذ: (۱) الفہرست، ص ۲۶۶، ۲۸۳؛ (۲) ابن القفطی، ص ۲۸۷؛ (۳) ابن الأثیر، ۹: ۹۷؛ (۴) ابن خلّکان، شمارہ ۶۸۱ (ترجمہ دیسلان de Slane، ۳: ۳۲۰)؛ (۵) ابوالفرج صالحانی، ص ۳۱۵؛ (۶) Cantor: *Vorlesungen über Gesch. d. Mathematik*، طبع دوم، ۱: ۶۹۸ ببعد؛ (۷) A.v. Brau-

Ihmühl: *Vorlesungen über Gesch. d. Trigon*، لائپزگ ۱۹۰۰ء، ۱: ۵۴ ببعد؛ (۸) زُوٹر (Suter)، ص ۷۱؛ ترجمہ، ص ۱۶۶؛ (۹) وہی مصنّف: *Abh. zur Gesch. d. mathem. Wissensch*، ۶: ۳۹؛ (۱۰) Nallino: *Scritti*، ۵: ۲۷۲، ۲۷۵، ۳۳۶ - ۳۳۷؛ (۱۱) براکلمان (Brockelmann)، ۱: ۲۵۵ و تکملہ، ۱: ۴۰۰؛ (۱۲) سارٹن (Sarton): *Introduction*، ۱: ۶۶۶ - ۶۶۷.

(H. SUTTER زُوٹر)

---

* **ابو ہاشم**: معتزلی عالمِ دین، رکّ بہ الجُبّائی.

---

* **ابو ہاشم**: عبداللہ بن محمد بن الحَنَفِیّہ، ایک شیعی قائد، جو شیعیوں کی ایک چھوٹی شاخ [رکّ بہ کیسانیہ] کے امام کی حیثیت سے اپنے والد محمد بن الحَنَفِیّہ کے جانشین ہوے۔ ان کے بارے میں ہماری معلومات صرف ان کی وفات اور بنو عبّاس کے حق میں ان کی وصیت تک محدود ہیں۔ قدیم تاریخی مآخذ اور فِرَقِ مبتدعہ سے متعلّق تالیفات میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ شیعیوں کی ایک جمعیت کے ساتھ سلیمان بن عبدالملک کے دربار میں گئے، جس نے ان کے فہم و ذکا اور اثر و اقتدار سے خائف ہو کر انھیں واپسی سفر کے دوران میں زہر دلوا دیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی موت کا وقت قریب ہے تو انھوں نے سفر کا رخ بدل کر حُمَیْمَہ کا قصد کیا، جو عبّاسیوں کی جاے سکونت سے چنداں دور نہ تھا اور امامت کے حقوق محمد بن علی العبّاسی [رکّ بآن] کے حق میں وصیت کرنے کے بعد انھوں نے وفات پائی۔ اس روایت کو عام طور پر عبّاسیوں کے حامی گروہ کی اختراع خیال کیا جاتا ہے، تاہم اگر اس میں سے بے محل باتوں اور حشو و زوائد کو خارج کر دیا جائے تو ممکن ہے کہ یہ روایت مغزِ صداقت سے خالی نہ ہو، خصوصًا اس لیے بھی کہ ابو ہاشم کی وفات کے بعد عبّاسی پردۂ خفا سے باہر نکل آئے اور شیعیانِ عراق ان کے احکام کی اطاعت میں سرگرمِ عمل ہو گئے (قبّ نیز مادّۂ بنو عباس).

مآخذ: (۱) ابن سعد، ۵: ۲۴۰ - ۲۴۱؛ (۲) ابن قتیبہ، معارف (طبع وُسٹنفِلٹ) ص ۱۱۱؛ (۳) البلاذُری: انساب الاشراف، مخطوطۂ پیرس، شمارہ شیفر (Schefer) ۲۴۷ الف، ورق ۶۸۵ الف تا ۶۸۶ ب؛ ۵۴۷ ب؛ (۴) الیعقوبی اور (۵) الطبری، بہ اِمداد اشاریہ؛ (۶) نوبختی: فِرَقُ الشِیعۃ (طبع رِٹّر Ritter)، ص ۲۹ - ۳۰؛ (۷) الاشعری: مقالات (طبع Ritter)، ۱: ۲۱؛ (۸) البغدادی: الفَرق، ص ۲۸، ۲۴۲؛ (۸) الشَہرَستانی، ص ۱۵، ۱۱۲؛ (۹) S. Moscati: *Il testamento di Abū Hāšim*، در *RSO*، ۱۹۵۲ء، ص ۲۸ - ۴۶.

(S. MOSCATI)

---

* **ابو ہاشم**: شریف مکّہ، رکّ بہ مکّہ.

---

* **ابو الہُذَیل العَلّاف**: محمد بن الہُذَیل بن عبداللہ بن مَکْحُول، جس کی نسبت (عبدالقیس کا مولیٰ ہونے کی وجہ سے) العَبْدی تھی.

معتزلہ کا یہ پہلا متکلّم بصرے میں پیدا ہوا اور وہاں علّافون (یعنی گھوڑوں وغیرہ کے لیے چارہ مہیّا کرنے والوں) کے محلّے میں رہتا تھا (اسی وجہ سے العَلّاف کہلاتا ہے)۔ اس کی تاریخ پیدائش غیر یقینی ہے، یعنی ۱۳۵ھ/ ۷۵۲ - ۷۵۳ء یا ۱۳۴ھ/ ۷۵۱ء یا ۱۳۱ھ/ ۷۴۸ - ۷۴۹ء۔ ۲۰۳ھ/ ۸۱۸ - ۸۱۹ء میں اس نے بغداد میں سکونت اختیار کی اور بڑی عمر پا کر وہیں ۲۲۶ھ/ ۸۴۰ - ۸۴۱ء، بلکہ ایک اور روایت کے مطابق خلیفہ الواثق کے عہد (۲۲۷ - ۲۳۲ھ/ ۸۴۲ - ۸۴۷ء) میں وفات پائی۔ بعض دیگر روایات کی رُو سے وہ خلیفہ المتوکّل کے زمانے میں ۲۳۵ھ/ ۸۴۹ - ۸۵۰ء میں فوت ہوا۔ [آخر عمر میں اس کی بصارت جاتی رہی تھی] وہ بالواسطہ واصِل بن عطا کا شاگرد تھا، یعنی واصِل کے ایک رفیق عثمان الطویل کی وساطت سے۔ واصِل کی طرح ابو الہُذَیل بھی ادیب تھا اور خصوصًا شاعری میں اپنے تبحّر کی وجہ سے بہت مشہور ہوا۔ اس کی سند سے بعض احادیث بھی روایت کی گئی ہیں.

وہ علمِ دین جو اس نے واصِل کے دَبِستانِ فکر سے حاصل کیا ابھی اپنی ابتدائی حالت میں تھا۔ یہ مکتبِ فکر بنیادی طور پر مناظرانہ تھا اور اس کا کام بظاہر غیر منظّم طریقے پر یہ تھا کہ ان تشبیہی عقائد کی جو عام مسلمانوں اور محدّثین میں رائج تھے، نیز عقیدۂ قدر کی، جس کی حمایت بنواُمیّہ سیاسی اغراض کے پیشِ نظر کرتے تھے اور اسی طرح [حضرت] علیؓ کی الوہیت کے عقیدے کی، جس کی تبلیغ غالی شیعہ کرتے تھے، مخالفت کرے۔ ابو الہُذَیل نے اس مناظرے کو جاری رکھا، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ سب سے پہلا شخص تھا جس نے اپنے دَور کے نظری مباحث کا آغاز کیا اور یہ ایسا کام تھا جس کے لیے وہ اپنے فلسفیانہ ذہن، اپنی فراست اور اپنی طاقت لسانی کی بدولت بہت موزوں تھا۔ وہ دیگر مذاہب کے خلاف اور اسی طرح گزشتہ دور کے بڑے فکری رجحانات، یعنی ثنویت، جس کی نمائندگی زرتشتی کرتے تھے، مانویت اور غناسطیت (gnosticism) کے خلاف اسلام کا وکیل بن گیا، نیز ان فلسفیوں کے جو یونانی خیالات سے اثر پذیر تھے، دہریوں کے، جن کی نمائندگی زیادہ تر علومِ طبیعیہ کے حامی کر رہے تھے اور آخر میں ان مسلمانوں کے خلاف جو خارجی افکار سے متاثّر ہو چکے تھے اور جن کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی، مثلًا صالح بن عبدالقدّوس ایسے خفیہ مانوی شعرا، طرزِ "جدید" کے علماے دین، جنھوں نے بعض غناسطی (gnostic) اور فلسفیانہ عقائد اختیار کر لیے تھے، وغیرہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے پختہ عمر کو پہنچنے کے بعد ہی فلسفے سے واقفیت حاصل کی۔ حج کے موقع پر (جس کی تاریخ ہمیں معلوم نہیں) مکّے میں اس کی ملاقات شیعی عالم ہشام بن الحَکَم سے ہوئی اور اس سے اس کے تشبیہی عقائد کے متعلّق جن میں

غناسطی (gnostic) اثرات نمایاں ہیں، مناظرے کیے۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس نے دہریوں کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ بعد کے مؤرّخین نے صفاتِ اِلٰہیہ کے بارے میں اس کے عقیدے اور موضوع امپیڈ وکلیز (pseudo-Empedocles) کے اس فلسفے کے درمیان بعض مماثلتوں کا سراغ لگایا ہے جیسے نوفلاطونیت (Neo-Platonism) کے حامیوں اور دورِ قدیم کے آخری حصّے کے ماہرینِ علم الطبیعیات نے وضع کیا تھا۔ عملاً اس کے فلسفیانہ مآخذ اس نوعیت کے ہوں گے جن کی نمائندگی عام طور پر ازمنۂ وسطیٰ کا ارسطاطالیسی دبستانِ حکمت کرتا ہے۔ وہ ان فلسفیوں کی طرف مائل بھی تھا اور متنفر بھی، چنانچہ جہاں اس نے ان کی مخالفت کی وہاں اس نے ان کے طریقوں اور مسائل سے متعلّق ان کے نقطۂ نظر کو اختیار بھی کرلیا۔ ایک مفکّر کی حیثیت سے وہ بہت سیدھا سادہ تھا اور مکتبی روایات سے نابلد۔ نظری مسائل پر وہ اس جرأت اور بیباکی کے ساتھ بحث کرتا تھا کہ مہملیّت کی حد تک پہنچ جانے سے بھی نہیں جھجکتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کے دینی افکار میں خامی اور توازن کی کمی کے ساتھ ساتھ تازگی کی خصوصیت بھی نمایاں ہے۔ معتزلہ میں وہ پہلا شخص تھا جس نے ان بہت سے بنیادی مسائل کو مرتّب کیا جن پر بعد میں آنے والے سب معتزلہ کو بہت کچھ کدّوکاوش کرنا تھی۔

خدا کی وحدانیت، اس کی روحانیت اور اس کے ماورائے ادراک ہونے کی صفت ابوالہُذیل کے دینی افکار میں تنزیہ کے انتہائی مدارج تک پہنچادی گئی ہے۔ خدا ایک ہے اور کسی اعتبار سے بھی اپنی مخلوق کے مشابہ نہیں؛ (ہشام بن الحکم کے نظریے کے برعکس) وہ جسم نہیں رکھتا؛ اس کی کوئی ہیئت، کوئی صورت اور کوئی حد نہیں۔ وہ ایک علم کے ساتھ علیم ہے، ایک قدرت کے ساتھ قدیر ہے، ایک حیات کے ساتھ حیّ ہے اور قیوم ہے، ایک ابدیت کے ساتھ ابدی ہے، ایک قوتِ بصارت کے ساتھ بصیر ہے، وغیرہ (شیعیوں کے نظریات کے خلاف جو کہتے تھے کہ خدا خود علم ہے، وغیرہ) لیکن یہ علم، یہ قدرت وغیرہ اس کی عین ذات ہیں (عوام کے نظریے کے خلاف جو صفاتِ الٰہیہ کو ایسے اعراض قرار دیتے ہیں جن کا جوہر -ذاتِ مطلق- پر اضافہ ہوا ہے)۔ ابوالہذیل کے یہ افکار مفاہمت کے وقتی اصول تھے، جو بعد میں آنے والی نسلوں کی تسلی نہ کرسکے۔ خدا کے حاضر، مطلق اور ہر جگہ موجود ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر چیز کا انتظام کرتا ہے اور اس کی تدبیر ہر جگہ جاری وساری ہے۔ اللہ عالمِ آخرت میں بھی غیر مرئی رہے گا۔ اس پر ایمان لانے والے اسے دل کی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے۔ جہاں تک اس کے اپنے علمِ ذات کا تعلّق ہے اللہ کا علم لامحدود ہے اور جہاں تک دنیا کے علم کا تعلّق ہے، خدا کا علم اس کی تخلیق کی حدود میں محصور ہے، جو ایک محدود کل بناتی ہے (اگر یہ علم محدود نہیں تو وہ کل نہیں)۔ یہی بات قدرتِ الٰہیہ کے لیے بھی کہی جاسکتی ہے۔ ابو الہُذیل نے کائنات کے عدم سے وجود میں آنے کے نظریے اور ارسطاطالیس کے تکوینی نظریات کو باہم مطابق بنانے کی کوشش کی ہے، جس کی رُو سے کائنات، جسے خدا نے حرکت دی، ابدی ہے، کیونکہ حرکت خود اپنے مُحرّکِ اوّل کے ساتھ ابدی ہے۔ ابوالہُذیل حرکت کو کائنات کے عمل کی اصل تسلیم کرتا ہے، لیکن وہ اسے قرآنی مفہوم میں مخلوق بتاتا ہے؛ بنابریں یہ حرکت بھی اپنی انتہا کو پہنچے گی اور رک جائے گی۔ یہ انتہا اس کے نزدیک یومِ قیامت کے بعد اگلے جہاں میں واقع ہوگی۔ حرکت بند ہوجانے کی وجہ سے بہشت و دوزخ دونوں دائم رہیں گے اور ان میں بسنے والے ایک حالتِ سکون میں قائم ہوجائیں گے۔ خوش نصیب ابدالآباد تک اعلیٰ درجے کے لطف و آرام سے بہرہ ور ہوں گے اور بدبخت سخت ترین عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ اس عقیدے کو، جسے ایک روایت کے مطابق خود اس نے منسوخ کردیا تھا، جملہ علماے اسلام ــ معتزلہ وغیر معتزلہ ــ نے ردّ کیا ہے اور ان کی نظر سے وہ نتائج مخفی رہے جو اس عقیدے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عالمِ مطلق اور قادرِ مطلق ہونے کے بارے میں پیدا ہوسکتے تھے۔ عدلِ الٰہی کی تشریح کے سلسلے میں ابوالہذیل کی تعلیم یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ شرّ اور بے انصافی کے ارتکاب پر قادر تو ہے، لیکن اپنی خیر وحکمت کی صفت کی وجہ سے ایسا نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ انسان کو اعمالِ بد کی اجازت دیتا ہے لیکن وہ ان اعمال کا خالق نہیں۔ انسان اعمالِ بد کے ارتکاب کی قدرت رکھتا ہے۔ وہ خود ان کا ذمّے دار ہے، بلکہ ان غیر ارادی نتائج کا بھی ذمے دار ہے جو اس کے اعمال سے پیدا ہوتے ہیں۔ (یہی نظریہ تولّد ہے جسے سب سے پہلے ابوالہذیل نے پیش کیا)۔ ذمّے دار ہستی انسان بالکل ہے، یعنی اس کی روح مع اس کے مرئی جسم کے ذمّے دار ہے۔ یہ ابوالہذیل ہی تھا جس نے معتزلہ کے افکار میں اجسام کے اعراض (accidents) اور جوہر (atom) کا تصوّر داخل کیا۔ ان تصوّرات کو جو ابتدا میں صرف طبیعیات سے تعلّق رکھتے تھے اس نے الٰہیات، علم الکائنات، علم الانسان اور علم الاخلاق کی بنیاد کے طور پر استعمال کیا۔ یہ اس کی سب سے اچھوتی جدّت تھی جس کے دوررس نتائج ہوسکتے تھے۔ اسی نے معتزلہ کی دینیات میں ایک میکانیکی خصوصیت پیدا کردی۔ حیات، جان، روح، حواسِ خمسہ سب اعراض ہیں اور اس لیے باقی رہنے والے نہیں، حتّٰی کہ روح بھی باقی نہیں رہے گی۔ انسانی اعمال کو دو مرحلوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ یہ دونوں مرحلے حرکت سے تعلّق رکھتے ہیں۔ پہلا مرحلہ اقدام کا ہے (''میں کروں گا'') اور دوسرا تکمیلِ فعل کا (''میں نے کرلیا''); چونکہ انسان آزاد اختیار کا مالک ہے اس لیے دوسرے مرحلے میں پہلی حرکت روکی جاسکتی ہے اور اس طرح فعل غیر مکمّل رہ جاتا ہے۔ صرف وہ فعل قابلِ شمار ہے جو مکمل ہوچکا ہو۔ فعّالیتِ ایزدی کی تشریح اعراض کے اصول کی روشنی میں یوں کی گئی ہے: دنیا کا تمام سلسلہ اعراض کی غیر منقطع تخلیق پر مشتمل ہے جو اجسام میں اتر آتے ہیں، اگرچہ بعض اعراض کسی مقام یا کسی جسم میں نہیں پائے جاتے، مثلاً وقت اور ارادۂ ایزدی۔ ارادۂ ایزدی ابدی خالقیت کے لفظ ''کُن'' کا دوسرا نام ہے۔ یہ ارادہ اپنے مقصود (المراد) اور حکمِ خداوندی (امر) سے الگ اور جداگانہ شے ہے، جسے انسان مان یا نہ مان سکتا ہے (لیکن تخلیقی لفظ ''کن'' کا اثر مطلق ہے): [''کُنْ فَیَکُون''] وہ کہتا ہے ہو جا پس ہوجاتا ہے، قرآن، ۲[البقرۃ]: ۱۱۷ وغیرہ)۔ جو

لوگ وحی قرآنی سے باخبر نہیں تھے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے ایسے قابلِ تعریف افعال انجام دیے ہیں جن کا قرآن نے حکم دیا ہے، انھوں نے اس کا ارادہ کیے بغیر خدا کی اطاعت کی ہے (نظریۂ طاعة لا یراد اللّٰہ بها، جو بصورتِ دیگر خوارج سے منسوب ہے)۔ قرآن ایک عرض ہے، جسے خدا نے خلق کیا ہے اور جب اسے لکھا جاتا ہے، پڑھا جاتا ہے اور حفظ کیا جاتا ہے تو وہ بیک وقت مختلف مقامات پر موجود ہوتا ہے۔ ''منزلة بین المنزلتین'' کے مسئلے میں ابوالہذیل نے ایسا موقف اختیار کیا ہے جو اس کے زمانے کے سیاسی حالات کے مطابق تھا۔ اس نے [حضرت] علیؓ کی خلافت کے سوال پر جنگ کرنے والوں میں سے کسی کو مردود نہیں قرار دیا، تاہم اس نے [حضرت] علیؓ کو [حضرت] عثمانؓ پر ترجیح دی۔ اسے المأمون کی خوشنودیِ مزاج حاصل تھی، جو اسے دینی مباحثوں کے لیے اکثر اپنے دربار میں بلایا کرتا تھا۔ ابوالہُذیل کی جملہ تصانیف ضائع ہو چکی ہیں۔

ابو الہُذیل نے اپنی طویل زندگی میں الٰہیات کے ارتقا پر بہت وسیع اثر ڈالا اور اپنے گرد مختلف عمر اور زمانے کے بہت سے شاگرد جمع کر لیے۔ ان میں سے سب سے زیادہ مشہور النظّام ہے، اگرچہ اس کا اپنے استاد سے جوہر کے متعلق اس کے تجربی نظریات کے باعث بگاڑ ہو گیا تھا۔ ابو الہذیل نے اس کی مذمّت کی اور اس کے ردّ میں متعدد رسائل لکھے۔ اس کے شاگردوں میں یحیٰی بن بشر الاَرَّجانی، الشحّام اور دوسرے لوگوں کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ اس کا مکتبِ فکر عرصۂ دراز تک قائم رہا، چنانچہ الجُبّائی بھی بہت سے مسائل میں اس سے اختلافِ رائے رکھنے کے باوجود اس بات کا مُعترف ہے کہ اس نے ابوالہذیل کے دینی نظریات سے استفادہ کیا ہے۔ بدقسمتی سے ابوالہذیل کے دینی نظریات مذہبِ معتزلہ سے منحرف ہو جانے والے مشہور ابن الراوندی [رکّ بآن] کے بغض کا تختۂ مشق بن گئے، جس نے فضیحة المعتزلة میں انھیں بسا اوقات نہایت عامیانہ تنقیدات کا ہدف بنایا اور انھیں سراپا غلط صورت میں پیش کیا۔ اس بگڑی ہوئی شکل کو البغدادی نے اپنی کتاب اَلْفَرْقُ بین الفِرَق میں بعینہٖ نقل کر دیا ہے اور اسی کو معتزلہ عقائد کے خلاصوں میں اکثر دہرایا جاتا ہے۔ ابن الراوندی کے شدید نقاد الخیّاط کی الانتصار ہی کی بدولت ہم اس قابل ہوئے ہیں کہ ابن الراوندی کے طرزِ عمل کو بے نقاب کریں اور ابو الہذیل کے افکار کے محرّکات کا صحیح صحیح اندازہ لگائیں۔ الاشعری نے اپنے مقالات میں ابوالہذیل کے نظریات کو مذہبِ معتزلہ کی روایات کے مطابق قابلِ تعریف غیر جانبداری سے پیش کیا ہے۔ الشہرستانی نے اپنی توضیح و تشریح متاخّر معتزلی روایات، بالخصوص بظاہر الکعبی پر مبنی کی ہے۔

مآخذ: (۱) الخطیب البغدادی: تأریخ بغداد، ۳: ۳۶۶-۳۷۰؛ (۲) المسعودی: مُرُوْج، بہ اِمداد اشاریہ؛ (۳) ابن خلّکان [: وفیات]، شمارہ ۶۱۷؛ (۴) ابن المرتضٰی: T.W. Arnold: The Mu'tazila، بہ اِمداد اشاریہ؛ (۵) ابن قُتَیْبَہ: تأویل مختلف الحدیث، قاہرہ ۱۳۲۶ھ، ص ۵۳-۵۵؛ (۶) الخیّاط: اِنْتِصار (طبع Nyberg)، بہ اِمداد اشاریہ؛ (۷) الاَشْعَری: مقالات (طبع Ritter) بہ اِمداد اشاریہ؛ (۸) البغدادی: الفَرْق، بہ اِمدادِ اشاریہ؛ (۹) ابن حَزم: فِصَل، ۲: ۱۹۳، ۴۸۷ و ۴: ۸۳ بعد، ۱۹۲ بعد، وغیرہ؛ (۱۰) مُطَہَّر المَقْدِسی: البَدْء والتأریخ (طبع Huart)، بہ فرانسیسی ترجمے کا اشاریہ؛ (۱۱) الشہرستانی [: المِلَل والنِّحَل]، ص ۳۴-۳۷؛ (۱۲) صاعد الاندلسی، طبقات الأمَم (طبع شیخو Cheikho)، ص ۲۱ بعد؛ (۱۳) المَقْریزی: خِطَط، ۲: ۳۴۶؛ (۱۴) S. Pines: *Beiträge zur islamischen Atomlehre*، برلن ۱۹۳۶ء؛ (۱۵) A. S. Tritton: *Muslim Theology*، لنڈن ۱۹۴۷ء؛ (۱۶) L. Gardet و M. M. Anawati: *Introduction á la théologie musulmane*، پیرس ۱۹۴۸ء؛ (۱۷) ا-ن-نادر: فلسفة المعتزلة، اسکندریہ ۱۹۵۰-۱۹۵۱ء؛ [(۱۸) لسان المیزان، ۵: ۴۱۳؛ (۱۹) علی مصطفٰی الغرابی: ابو الھذیل العلاف، طبع دوم، قاہرہ ۱۹۵۳ء؛ (۲۰) نکت الھمیان، ص ۲۷۷].

(H. S. NUBERG)

✱ **ابوہُرَیرہؓ:** عُمَیرُ بن عامر بن عبد ذی الشَّریٰ [الدَّوسی الیمانی، رسول اللّٰہ [صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم] کے صحابی۔ [اُن کا شمار ان صحابہؓ میں ہے جو علمِ حدیث کے اساطین سمجھے جاتے ہیں۔ نبی اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے ان کے متعلق فرمایا: ابو ہریرہ علم کا ظرف ہے۔ بخاری، کتاب العلم]۔ ان کا نام پہلے عبد الشمس تھا، اسلام لانے پر بدل کر عُمَیر، عبداللّٰہ یا عبدالرحمٰن کر دیا گیا، لیکن ان...... ناموں کے علاوہ متعدّد دوسرے نام بھی بتائے گئے ہیں۔ انھیں ابو ہریرہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اپنے قبیلے کی بکریاں چراتے وقت وہ دل بہلانے کے لیے اپنے ساتھ ایک بلّی کا بچّہ رکھا کرتے تھے۔ [وہ طفیل بن عمر الدوسی کی تبلیغ سے مسلمان ہوے۔] جب ابو ہریرہؓ (یمن کے اسی خانوادے کے ساتھ مدینۂ [منوّرہ] پہنچے تو آنحضرت [صلی اللّٰہ علیہ وسلم] خیبر کی مہم (۷ھ/۶۲۹ء) پر گئے ہوے تھے؛ [چنانچہ یہ قافلہ حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے خیبر گیا۔ اس وقت حضرت ابو ہریرہؓ کی عمر تیس سال سے کچھ اوپر تھی]۔ قبولِ اسلام کے بعد وہ آنحضرت [صلی اللّٰہ علیہ وسلم] کی صحبت ہی میں رہے اور آپؐ ہی کی داد و دہش پر ان کی بسر اوقات ہوتی تھی۔ وہ ان غریب لوگوں میں سے تھے جو اہلِ صفّہ [رکّ بآن] کہلاتے تھے۔ اپنی والدہ سے انھیں بڑی محبت تھی اور ان کی ترغیب سے وہ بھی اسلام لے آئی تھیں۔ [حضرت] عمرؓ نے انھیں بحرین کا عامل مقرّر کیا، مگر بعد میں انھیں معزول کر کے ان کا بہت سامال و دولت ضبط کر لیا۔ بعد ازاں جب [حضرت] عمرؓ نے انھیں ان کے منصب پر بحال کرنا چاہا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ مدینۂ [منوّرہ] سے اپنی غیر حاضری کے زمانے میں مروان نے انھیں اپنا نائب مقرر کیا تھا، لیکن ایک اَور روایت یہ ہے کہ انھیں [امیر] معاویہؓ نے اس منصب پر مامور کیا تھا۔ ابو ہریرہؓ اپنے تقوٰی اور ظرافتِ طبع کے لیے مشہور تھے۔ ان کا سنِ وفات ۵۷، ۵۸ یا ۵۹ھ بتایا جاتا ہے، لیکن اگر یہ روایت صحیح ہے کہ وہ [ام المؤمنین حضرت] عائشہؓ کی نمازِ جنازہ میں شریک تھے (۵۸ھ) تو ان کی وفات ۵۸ھ/۶۷۸ء یا ۵۹ھ میں ہوئی ہوگی۔ انھوں نے ۷۸ سال کی عمر پائی۔ [ولید

نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور وہ جنّت البقیع میں دفن ہوے]۔

اگرچہ ابوہریرہؓ نے آنحضرت [صلّی اللہ علیہ وسلّم] کے وصال سے چار سال سے بھی کچھ کم عرصہ پہلے اسلام قبول کیا تھا، تاہم وہ بہت سی احادیث کے راوی ہیں اور جو روایات ان سے مروی ہیں ان کی تعداد تقریبًا [۵۳۷۵] بتائی جاتی ہے [ان میں سے ۳۲۵ متفق علیہ ہیں — تہذیب الکمال، ص ۴۶۲]۔ امام احمدؒ بن حنبل کی مسند میں ان کی روایات ۲۱۳ صفحات میں پھیلی ہوئی ہیں (۲:۲۲۸-۵۴۱)۔ جن لوگوں نے براہِ راست ابوہریرہؓ سے حدیث روایت کی ہے ان کی تعداد آٹھ سو یا اس سے کچھ زیادہ شمار کی گئی ہے۔ ایک روایت میں، جو تھوڑی بہت مختلف شکلوں میں نقل کی جاتی ہے، ابوہریرہؓ نے اس امر کی توجیہ کی ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ احادیث کے راوی کیوں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب دوسرے لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوتے تو وہ بارگاہ نبوی [صلّی اللہ علیہ وسلّم] میں حاضر رہتے تھے اور اس لیے انھیں دوسروں کے مقابلے میں آنحضرت [صلّی اللہ علیہ وسلّم] کی باتیں سننے کا زیادہ موقع ملتا تھا۔ ایک دفعہ ابوہریرہؓ نے آنحضرت [صلّی اللہ علیہ وسلّم] سے عرض کی کہ میں جو کچھ سنتا ہوں بھول جاتا ہوں تو آنحضرت [صلّی اللہ علیہ وسلّم] نے فرمایا کہ جب میں کچھ کہہ رہا ہوں تو تم اپنا جبّہ پھیلا دو اور جب میں اپنا کلام ختم کر چکوں تو اپنے گرد لپیٹ لو؛ چنانچہ ابوہریرہؓ نے ایسا ہی کیا اور اس کے بعد سے وہ آنحضرت [صلّی اللہ علیہ وسلّم] سے سنی ہوئی کوئی بات نہیں بھولے [بخاری، کتاب العلم]...[اشپرنگر نے ابوہریرہؓ کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے اسے حق بجانب نہیں کہا جا سکتا]، اس لیے کہ جو روایات ان سے مروی کہی جاتی ہیں ضروری نہیں کہ وہ انھیں کی ہوں۔ ممکن ہے کہ بعد کے زمانے میں جو حدیثیں وضع ہوئیں انھیں ابوہریرہؓ سے منسوب کرنا لوگوں کو آسان معلوم ہوا ہو...ابوہریرہؓ کی بہت سی روایات صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں درج ہیں۔ [ابوہریرہؓ کو جو حدیثیں یاد تھیں وہ انھوں نے لکھ بھی لی تھیں — حاکم: مستدرک، ۳:۵۱۱ و بخاری: کتاب العلم۔ چند روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض صحابہؓ ان کی بعض مرویات پر اعتراض کرتے تھے۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ انھیں ابوہریرہؓ کے حفظ و امانت پر شک تھا، بلکہ ان کے تفقہ پر انھیں اعتراض تھا۔ ابوہریرہؓ کچھ فارسی بھی جانتے تھے۔ ابوداؤدؒ، ۱:۲۲۷۔ انھیں تورات کے مسائل سے بھی واقفیت تھی — الاصابۃ، ۴:۲۰۵۔ ان کے خوفِ خدا، عبادت و ریاضت، محبّت رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم و آلِ رسول، والدہ کی خدمت، اظہارِ حق میں جرأت، سادگی اور فیاضی کے جستہ جستہ واقعات مآخذ میں ملتے ہیں]۔

مآخذ: (۱) ابن قتیبۃ: المعارف، ص ۱۴۱ بعد؛ (۲) عُیُون، ۱:۵۳؛ (۳) الدُّولابی: الکُنٰی والاسماء، حیدرآباد ۱۳۲۲-۱۳۲۳ھ، ۱:۶۱؛ (۴) ابن عبدالبرّ: الاِستِیعاب، حیدرآباد ۱۳۳۶ھ، ص ۶۹۷ بعد؛ (۵) ابن الأثیر: اُسد، ۵:۳۲۵؛ (۶) النَّوَوی: تہذیب الاسماء، طبع وُسٹنفِلٹ (Wüstenfeld)، ص ۷۶۰ بعد؛ (۷) الذہبی: تذکرۃ الحُفّاظ، ۱:۳۱-۳۵؛ (۸) ابن حجر: الاصابۃ، قاہرہ ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء، ۴:۲۰۰-۲۰۸؛ (۹) تہذیب التہذیب، ۱۲:۲۶۲-۲۶۷؛ (۱۰) Wensinck: *Handbook*، ص ۷ بعد؛ (۱۱) A. Sprenger: *Das Leben und die Lehre des Muhammad*، ۳: Ixxxxv-Ixxxiii؛ (۱۲) D.S. Margoliouth: *Mohammed*، ص ۳۵۲ بعد؛ (۱۳) *ZDMG*، ۱۸۹۵ء، ص ۴۸۷ بعد؛ (۱۴) صحیفۃ، جو ہمّام ابن مُنَبِّہ کی طرف منسوب ہے اور جس میں انھوں نے اپنے استاد ابوہریرہؓ کی روایات جمع کر دی ہیں، طبع محمد حمید اللہ، در *MMIA*، ۱۹۵۳ء، ص ۹۶ بعد؛ [(۱۵) شاہ معین الدین: مہاجرین، ۲:۴۸-۶۸؛ (۱۶) عبدالحسیب شرف الدّین: ابوھریرہ؛ (۱۷) الجواھر المضیئۃ، ۲:۴۱۸؛ (۱۸) صفۃ الصفوۃ، ۱:۲۸۵؛ (۱۹) حلیۃ الاولیاء، ۱:۳۷۶؛ (۲۰) ذیل المُذَیَّل، ص ۱۱۱؛ (۲۱) الذریعۃ، ۷:۱۱۴؛ (۲۲) ابن تیمیۃ: الردّ علی المنطقیین، ص ۴۴۶]۔

(J. Robson روبسن)

----

* **ابوالہَوْل:** (ہَول Hōl) "خوف کا باپ"، جیزہ (Gizeh) کے بڑے بت (sphinx) کا عربی نام؛ بعض مصنّف اسے صرف "الصنم" لکھتے ہیں، لیکن اس کی تصدیق ہو چکی ہے کہ فاطمی دور ہی میں اس کا نام "ابوالہَوْل" ہو گیا تھا۔ اس دَور تک اس بت کا قبطی نام بِلْہِیت (بِلْہِیب) یا جیسا کہ القُضاعی نے لکھا ہے (جسے المقریزی نقل کرتا ہے) بِلْہُوبہ (بِلْہُو بہ) بھی معروف تھا۔ عربی نام "ابوالہَوْل" غالبًا اسی قبطی نام کے عوامی اشتقاق پر مبنی ہے۔ [بلہیت یا بلہیب کا] ابتدائی حرف ب غالبًا قبطی حرفِ تخصیص (article) کی نمائندگی کرتا ہے جس نے عربی میں، جیسا کہ اکثر ہوتا رہا، ابو کی صورت اختیار کر لی ہے۔ قدیم روایات میں ابوالہول کے نام کا اطلاق اس شیر کی شکل والے مجسمے کے صرف سر پر کیا جاتا تھا، کیونکہ ازمنۂ وسطٰی میں اس کا جسم ریت کے اندر دبا ہوا تھا، اور کہیں ۱۸۱۷ء میں جا کر اس پر سے ریت ہٹائی گئی۔ عصرِ حاضر کے عربی مصنّف اس لفظ کو بالعموم اس شکل کے کسی بھی بُت (sphinx) کے لیے استعمال کرتے ہیں، نہ کہ خاص طور پر اس بت کے لیے جو اہرام کے قریب موجود ہے۔

عرب، جنھیں قدیم مصریوں کے تہذیب و تمدن کے بارے میں کچھ علم نہ تھا، اس بت کے سر کو، جو صحرا کی ریت کے اوپر اپنے شاندار طول و عرض کے ساتھ بلند تھا، وہم آمیز خوف کے ساتھ دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بت ایک طلسم ہے جو ریت کو نیل کی وادی پر دست درازی سے روکتا ہے۔ بعض دوسرے لوگ اہرام کی طرف بھی اسی قسم کا طلسماتی اثر منسوب کرتے تھے۔ ایک اَور عظیم الجثّہ زنانہ مجسمہ دریاے نیل کے دوسرے کنارے پر فُسطاط میں تھا، جسے ابوالہول کی محبوبہ تصوّر کیا جاتا تھا۔ اس بت کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مجسمہ غالبًا ایسس (Isis) دیوی اور اس کے بچے ہورس (Horus) کا تھا۔ اس بت کی پشت دریاے نیل کی جانب تھی، بحالیکہ ابوالہول کی پشت صحرا کی طرف ہے اور اسے فُسطاط کو دریا کی طغیانی سے بچانے کا طلسم خیال کیا جاتا تھا۔

اس مجسمے کو خزانے اور دفینے تلاش کرنے والوں نے ۷۱۱ھ/ ۱۳۱۱ء میں توڑ پھوڑ دیا اور اس کے پتھر ایک مسجد کی تعمیر میں لگا دیے گئے۔ ایک اَور روایت یہ ہے کہ ابوالہول افسانوی اُشْمُوم کی شبیہ تھی، جس پر صابیٔ مذہب کے لوگ سفید مرغوں اور بخور کا چڑھاوا چڑھایا کرتے تھے۔

عربوں کے بیانات ابوالہول کی تاریخ میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کرتے۔ المُقَدَّسی کے بیان کے مطابق ۳۷۵ھ/ ۹۸۵ء میں اس کا چہرہ صحیح سالم نہ تھا، لیکن بعد کے بیانات میں اس کی خوبصورتی اور خال وخد کی موزونیت کی تعریف کی گئی ہے اور اس کے سرخی مائل رنگ کا اکثر ذکر آتا ہے۔ ۷۸۰ھ/ ۱۳۷۸ء میں ایک متشدّد شیخ نے اس بت کو مزید نقصان پہنچایا۔

مآخذ: (۱) المقریزی: خِطَط، ۱: ۱۲۲ بعد، طبع Wiet، ۲: ۱۵۵ بعد (حواشی کے ساتھ)؛ (۲) ابن دُقماق، ۴: ۲۱ بعد؛ (۳) المقدسی، ص ۲۱۰؛ (۴) یاقوت، ۴: ۹۶۲؛ (۵) دساسی (S. de Sacy): *Relation de l'Egypte*، ص ۱۸۰؛ (۶) علی مبارک: الخِطَطُ الجَدیدۃ، ۱۶: ۴۴ بعد؛ (۷) E. Reitmeyer: *Beschreibung Ägyptens im Mittelalter*، ص ۹۸ - ۱۰۲؛ (۸) K. Baedeker: *Ägypten*، طبع ششم، ص ۱۲۴ بعد.

(C. H. BECKER)

---

* **ابوالہَیجاء الحَمْدانی**: رَكَ بہ بنوحَمْدان.

---

* **ابو یزید (بایزید) البِسطامی**[رح]: طَیفُور بن عیسیٰ بن سُروشان، معروف ترین مسلم صوفیاے کرام میں سے ایک۔ چند مختصر وقفوں کے سوا، جن میں وہ راسخ العقیدہ علماے دین کی مخالفت کے باعث اپنے شہر سے بہت دور جا کر رہنے پر مجبور ہوے، بایزید[رح] نے اپنی ساری زندگی ولایت قُومِس کے شہر بِسْطام میں بسر کی اور وہیں ۲۶۱ھ/ ۸۷۴ء یا ۲۶۴ھ/ ۸۷۷-۸۷۸ء میں وفات پائی۔ مشہور یہ ہے کہ ایلخانی سلطان الجائتو محمد خدا بندہ نے ۷۱۳ھ/ ۱۳۱۳ء میں ان کے مزار پر ایک قبّہ تعمیر کرایا تھا۔ انھوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی، لیکن ان کے تقریبًا پانچ سو اقوال نقل کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض بدرجۂ غایت دلیرانہ ہیں اور ایک ایسی نفسیاتی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں جس میں صوفی اپنے متعلّق یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ ایک ہے، بلکہ وہ خود معبودِ حقیقی میں تبدیل ہو گیا ہے (''عین الجمع'')۔ یہ اقوال بایزید[رح] کے حلقے کے افراد نے اور ان لوگوں نے جو ان سے ملے تھے جمع اور نقل کیے ہیں اور ان لوگوں میں اوّلیت کا شرف ان کے شاگرد اور مصاحب ابوموسیٰ (اوّل) عیسیٰ بن آدم کو حاصل ہے، جو شیخ موصوف کے بڑے بھائی آدم کا بیٹا تھا۔ بغداد کے مشہور و معروف صوفی جنید[رح] نے اس قسم کے اقوال اسی سے فارسی زبان میں سُنے اور ان کا ترجمہ عربی میں کر دیا (نور، ص ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۲۲)۔ ابوموسیٰ سے ان اقوال کا اہم راوی اس کا بیٹا موسیٰ بن عیسیٰ ہے، جو ''عَمّی'' کے لقب سے معروف تھا۔ اس سے طیفور بن عیسیٰ ''الاصغر'' نے روایت کی، جس کا مقام خاندان کے نسب نامے میں واضح نہیں۔ اس کے علاوہ دیگر راویوں نے بھی عَمّی سے روایت کی۔ ان کے زائرین میں سے، جنھوں نے ابو یزید[رح] کے اقوال نقل کیے، بدرجۂ اوّل ابوموسیٰ (الثانی) الدَّبِیلی، باشندۂ دَبِیل (اَرمینیہ) (نور، ص ۵۵) اور ابراہیم[رح] بن ادہم کے ایک شاگرد ابو اسحٰق ابراہیم الہَرَوِی المعروف بہ اِسْتَنْبَہ (سِتَنْبَہ) (حِلْیة، ۱۰: ۴۳، ۴۴)، نیز مشہور و معروف صوفی احمد بن خِضرویہ قابل ذکر ہیں، جن میں سے مؤخّر الذّکر نے حج کے موقع پر ان سے ملاقات کی تھی۔ ابو یزید[رح] ذوالنون[رح] المصری کے دوست تھے۔ جُنید[رح] نے ان کے ملفوظات کی ایک شرح لکھی تھی، جس کے بعض حصّے السّرّاج کی اللُّمَع میں محفوظ ہیں۔ ابو یزید[رح] کی زندگی اور ان کے اقوال کے بارے میں سب سے زیادہ مفصّل ماخذ ابوالفضل محمد بن علی بن احمد بن الحسین بن سہیل السَّہلگی البِسطامی (پیدائش ۳۸۹ھ/ ۹۹۸ - ۹۹۹ء؛ وفات ۴۷۶ھ/ ۹۸۴ء [کذا، ۱۰۸۳ - ۱۰۸۴ء]) کی تالیف کتاب النور فی کلمات ابی یزید طیفور ہے (شطحات الصوفیة، ج ۱، قاہرہ ۱۹۴۹ء، طبع عبدالرحمٰن بَدَوِی، جو چنداں تسلی بخش نہیں)۔ السہلگی نے جن اسناد سے استفادہ کیا ہے ان میں سے اہم ترین (۱) الحلّاج کا مشہور سوانح نگار ابوعبداللہ محمد بن عبد اللہ الشیرازی ابن بَاکُوْیَہ، (م ۴۴۲ھ/ ۱۰۵۰ء) جس سے السہلگی نے ۴۱۹ھ یا ۴۱۶ھ میں ملاقات کی (نور، ص ۱۳۸) اور (۲) شیخ المشائخ ابوعبداللہ محمد بن علی الداستانی (ہجویری: کشف المحجوب، باب ۱۲) ہیں؛ ایک جعلی جنید کی کتاب القصد الی اللّٰہ، جس میں ابو یزید کے ''معراج'' کی افسانہ نما تزئین کی گئی ہے (R. A. Nicholson: *An early Arabic version of the Miʿráj of Abú Yazíd al-Bistámi*، در *Islamica*، ۱۹۲۶ء، ص ۴۰۲ - ۴۱۵)۔

تصوّف میں ابو یزید کے استاد ابوعلی السِندی نامی ایک ایسے صوفی تھے جو عربی نہیں جانتے تھے۔ ابو یزید[رح] نے انھیں قرآن پاک کی وہ آیات سکھائی تھیں جو نماز کے لیے ضروری ہوتی ہیں، لیکن جنھوں نے اس کے بدلے میں ابو یزید[رح] کو وحدتِ سرّی سے متعارف کیا۔ یہ بات غیر ممکن نہیں کہ ابو یزید[رح] ان کی وساطت سے ہندی اثرات سے متاثّر ہوے ہوں۔ ابو یزید[رح] بعد کے صوفیہ، مثلاً ابو اسحٰق الکازُرونی اور ابوسعید بن ابی الخیر، کے برعکس محض باطنی (Introvert) صوفی تھے، یعنی ان کی طرح وہ معاشرتی سرگرمیوں (خدمة الفقراء) میں حصّہ نہیں لیتے تھے، تاہم نوعِ انسانی کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے ان کی جگہ خود تکلیف اُٹھانے کے لیے آمادہ تھے، بلکہ بعض ملفوظات میں انھوں نے عقوبت جہنم پر، جو مردودین کو ملے گی، نکتہ چینی بھی کی ہے، کیونکہ یہ گنہگار بھی بہر حال ایک مشت خاک ہی ہیں۔ ان میں [مسیحی اصطلاح میں] فدائیت (''numinous'') کا احساس بہت بڑھا ہوا ہے اور اسی کے ساتھ معبودِ حقیقی کی بارگاہِ جلال میں خشیت وخوف کا، جس کے حضور وہ اپنے آپ کو ہمیشہ ایسا کافر محسوس کرتے ہیں جو زُنّار کو ابھی ابھی

اتارنے والا ہو۔ ان کی والہانہ آرزو یہ ہے کہ باقاعدہ ریاضتِ نفس کے ذریعے (''اناحدّاد نفسی'' ــ میں اپنی ذات کا آہنگر ہوں) ان تمام رکاوٹوں (حُجُب) سے جو انھیں اللہ سے جُدا کر رہی ہیں نجات کلّی حاصل کرلیں تا کہ اُسے پاسکیں۔ اس عمل کو انھوں نے اپنے احوال کی ترجمانی کرنے والے اقوال میں کسی قدر پُرشکوہ تعبیرات کے ساتھ بیان کیا ہے، جو بدرجۂ غایت دلچسپ ہیں۔ ان کے نزدیک دُنیا، زہد (ترک دنیا)، عبادت، کرامات، ذکر، حتّٰی کہ مقاماتِ سلوک بھی سب کے سب صرف ایسے حجابات ہیں جو انھیں اللہ سے دُور رکھتے ہیں۔ جب بالآخر وہ اپنی ''اَنا'' کو فنا میں اس طرح اتار پھینکتے ہیں جس طرح کہ ''سانپ اپنی کینچلی اتار دیتا ہے'' اور مطلوبہ مقام پر جا پہنچتے ہیں تو ان کا تبدیل شدہ شعورِ خودی ان مشہور متضاد اقوال (شطحات) کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جن پر ان کے معاصرین بہت معترض اور برہم ہوے، مثلاً: ''سُبْحَانِی مَا اَعْظَمَ شَأنِی'' (پاک ہوں میں، میری شان کتنی بلند ہے)؛ ''میرے لیے تیری اِطاعت تیرے لیے میری اِطاعت سے بڑھ کر ہے''؛ ''میں ہی عرش ہوں اور میں ہی اس کا پایہ''؛ ''میں لوح محفوظ ہوں''؛ ''میں نے کعبے کو اپنے گرد طواف کرتے ہوے دیکھا'' وغیر ذلک۔ مُراقبات میں انھوں نے ماورائے ادراک فضاؤں میں پرواز کی۔ انھیں کی بدولت ان پر یہ الزام وارد ہوا کہ وہ اسی طرح کی معراج کے تجربے کا ادّعا کرتے ہیں جیسی کہ رسول [اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم] کی تھی۔ ان روحانی پروازوں کے دوران میں اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی وحدت انانیت سے مشرّف کیا، اپنی انانیت کا لباس پہنایا، لیکن انھوں نے اس حال میں لوگوں کے سامنے آنے سے احتراز کیا، یا یہ کہ انھوں نے دیمومیّت کے بازووں کے ساتھ ''لا کیفیت'' کی فضا کے پار پرواز کی اور ''ازلیت'' کی سرزمین میں پہنچے اور وہاں احدیّت کے شجر کی زیارت کی، جس سے یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ سب مشاہدات دھوکا تھے؛ یا یہ سب کچھ وہ ''خود ہی تھے'' وغیرہ۔ یہ اقوال ظاہر کرتے ہیں کہ وہ تصوّف کے ہر انتہائی عقدے تک پہنچ گئے تھے۔ بعد کے زمانے کے ایک قصّے میں آتا ہے کہ کسی مسیحی خانقاہ میں ان کے سامنے جو [روحانی] معمّے پیش کیے گئے انھیں بایزید نے نہایت آسانی سے حل کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جملہ اہلِ خانقاہ نے دین اسلام قبول کرلیا.

مآخذ: (۱) سَرّاج: اللُّمَع، طبع نکلسن، ص ۳۸۰ ـ ۳۹۳ واشاریہ؛ (۲) السُّلَمی: طبقات الصُّوفیة، قاہرہ ۱۹۵۳ء، ص ۶۷ ـ ۷۴؛ (۳) انصاری ہَرَوِی: طبقات الصوفیة، مخطوطۂ نافذ پاشا، شمارہ ۴۲۵، ورق ۳۸ الف تا ۴۱ ب؛ (۴) جامی: نفحات الانس، طبع Nassau Lees، ص ۶۲ ببعد؛ (۵) ابونُعَیم: حِلیة الاولیاء، ۱۰: ۳۳ ـ ۴۲؛ (۶) القُشَیری: رسالة، قاہرہ ۱۳۱۸ھ، ص ۱۶ ـ ۱۷؛ (۷) ہُجوِیرِی: کشف المحجوب، باب ۱۱، شمارہ ۱۲؛ (۸) عبدالرحمٰن بَدَوی: شَطَحات الصوفیة، ج ۱: ابو یزید البِسطامی، قاہرہ ۱۹۴۹ء، اس میں السَہلگی کی کتاب النّور، سبط ابن الجوزی کی مرآة الزمان، نفحات الاُنس اور طبقاتِ سُلَمی کے اقتباسات درج ہیں اور عیسائی خانقاہ کے راہبوں کا قصّہ بھی مذکور ہے۔ (راہبوں کے اس قصے پر A. J. Arberry نے بحث کی ہے، *A Bisṭámí legend*، در *JRAS*، ۱۹۳۸ء، ص ۸۹ ـ ۹۱۔ یہ کہانی ترکی میں بھی موجود ہے، مخطوطۂ ایوب مہرشاہ سلطان، شمارہ ۲۰۲ و ۴۴۳ اور مخطوطۂ فاتح، شمارہ ۵۳۳۴؛ عربی میں: مخطوطۂ فاتح، شمارہ ۵۳۸۱)؛ (۹) رُوزبِہان بَقلی: شرح الشطحیات، مخطوطۂ شہید علی پاشا، شمارہ ۱۳۴۲، ورق ۱۴ ب تا ۲۶ ب؛ (۱۰) ابن الجَوزی: تَلبِیس ابلیس، ص ۳۶۴ ببعد؛ (۱۱) عطّار: تذکرة الاولیاء، طبع نکلسن، ص ۱۳۴ ببعد؛ (۱۲) ابن خَلِّکان [: وفیات]، طبع بولاق، شمارہ ۱۲۷۵، ۱: ۳۳۹؛ (۱۳) نور اللہ شُستری: مجالس المؤمنین، مجلس ۶؛ (۱۴) خوانساری: روضات الجنّات، ص ۳۳۸ ـ ۳۴۱؛ (۱۵) نکلسن (R. A. Nicholson)، در *JRAS*، ۱۹۰۶ء، ص ۳۲۵ ببعد؛ (۱۶) ماسیون (L. Massignon): *Essai... mystique musulmane*، پیرس ۱۹۲۲ء، ص ۲۴۳ ـ ۲۵۶؛ (۱۷) اس کے روضے کی تصویر صنیع الدولہ محمد حسن خاں: مطلع الشمس، تہران ۱۳۰۱ھ، ۱: ۶۹ ـ ۷۰ اور E. Diez: *Die Kunst der islamischen Völker*، برلن ۱۹۱۷ء، ص ۶۹، میں موجود ہے؛ (۱۸) H. Ritter: *Die Aussprüche des Bayezīd Bistāmī*، در *Westöstliche Abhandlungen Rudolf Tschudi... überreicht*، Wiesbaden ۱۹۵۴ء، ص ۲۳۱ ـ ۲۴۳؛ [(۱۹) میزان الاعتدال، ۱: ۴۸۱؛ (۲۰) الشعرانی، ۱: ۶۵؛ (۲۱) المناوی، ۱: ۲۴۴].

(رِٹّر H. RITTER)

✱ **ابو یزید النُّکّارِی:** مَخْلَد بن کَیْداد، خارجی قائد (جو اِباضی النُّکّار [رَکَ بآن] میں سے تھا)، جس نے بغاوت کا عَلَم بلند کر کے شمالی افریقہ میں فاطمی حکومت کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ اس کا باپ، تَقیُوس (یا تُوزَر) ضلع قَسطیلیہ کے زَناتہ بربر قبیلے کا ایک سوداگر تھا۔ اس نے تَدمَکَت میں سبیکہ نام کی ایک لونڈی خریدی، جس کے بطن سے ۲۷۰ھ/ ۸۸۳ء میں ابو یزید (بظاہر سُودان میں) پیدا ہوا۔ ابو یزید نے اباضِیّہ مذہب کی تعلیم حاصل کی اور تاہَرت میں مُدرِّس ہوگیا۔ ابوعبداللہ الشیعی کی فاتحانہ یلغار کے وقت وہ تَقیُوس چلا گیا، جہاں اُس نے ۳۱۶ھ/ ۹۲۸ء میں حکومت کے خلاف تبلیغ شروع کی۔ پہلی مرتبہ گرفتاری کے بعد، جس سے وہ جلد ہی رہا کر دیا گیا، وہ کوہِ اَوْراس میں بنو کُملان کے قبیلۂ ہَوّارہ کے پاس چلا گیا، جن میں اسے بہت سے پیرو مل گئے۔ (یہ لوگ آخری دم تک اس کے بہت ہی پکے مددگار بنے رہے۔) نُکّاری امام ابو عمّار الاعمٰی نے قیادت کی زمام اس کے حوالے کردی۔ ابو یزید کو تُوزَر کے مقام پر گرفتار کرلیا گیا، لیکن ابو عمّار نے زنداں میں داخل ہو کر اسے رہا کرالیا۔ وہ ایک سال سُمَاطہ کے علاقے میں رہا اور بعد ازاں اَوْراس واپس آ گیا.

۳۳۲ھ/ ۹۴۳ء میں اُس نے اپنی بغاوت کا آغاز کیا اور تبِسّہ، مَرْماجَنّہ (جہاں اسے اس کا وہ سواری کا منظور نظر گدھا بطور تحفہ ملا جس کی وجہ سے وہ صاحب الحمار کہلانے لگا)، اَلْاُرْبُس (Leribus؛ ۱۵ ذوالحجہ ۳۳۲ھ) اور باجہ (۱۳ محرم ۳۳۳ھ) پر قبضہ کرلیا اور ۲۳ صفر کو القَیرَوان میں داخل ہو کر اُس نے فاطمیوں

کے سپہ سالار خلیل بن اسحٰق اور شہر کے قاضی کو قتل کرا دیا۔ القیروان کے سُنّی ابتدا میں اس کے ساتھ ہمدردی کے جذبے سے خالی نہ تھے، کیونکہ وہ گو خود بھی ایک بدعتی فرقے سے تھا، لیکن اُس نے انھیں فاطمیوں کے اقتدار سے نجات دلائی تھی (مالکی فقہا کے رویّے کے متعلق قب ابو بکر المالکی: ریاض النفوس، جس پر ایچ-آر-اِڈریس، در *REL*، ۱۹۳۶ء، ص ۸۰-۸۷ نے ایک تنقیدی تبصرہ لکھا ہے، نیز ابوالعرب، طبع محمد بن شنب (*Classes des Savants de l'Ifrīqīya*، دیباچہ، ص viii ببعد، xvi)؛ لیکن بربروں کے ناجائز مطالبات سے وہ روز بروز برگشتہ خاطر ہوتے چلے گئے۔ دوسری جانب اس کے اپنے فرقے کے متشدّد دین نے جب دیکھا کہ ان کے امام اور قائد نے اپنے سادہ طور طریقے ترک کر دیے ہیں، ریشمی کپڑے پہننے لگا ہے اور اعلیٰ نسل کے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے تو وہ بھی اس سے خاصے غیر مطمئن رہنے لگے۔

اپنے بیٹے فضل اور ابوعمّار کو القیروان میں چھوڑ کر ابو یزید نے ۱۲ ربیع الاوّل کو فاطمی سپہ سالار مَیسُور کے خلاف جنگ کر کے اُسے شکست دی (اور مار ڈالا) اور المہدیّہ کے قریب جا پہنچا۔ پہلے اس نے شہر پر دھاوا بول کر اسے سر کرنے کی کوشش کی (۳ جمادی الاُخرٰی)، جس کے دوران میں وہ مصلّی تک پہنچ گیا (فاطمیوں کی ایک مشہور روایت کے مطابق المہدی نے پیش گوئی کی تھی کہ آئندہ ایک بہت خطرناک باغی مصلّی تک پہنچ جائے گا، لیکن اس سے آگے نہیں بڑھے گا) اور بعد ازاں شہر کا محاصرہ کر لیا۔ جمادی الاُخرٰی، رجب اور شوّال کے مہینوں میں اس نے شہر پر دھاوا کر کے اسے فتح کرنے کی پے در پے کوششیں کیں اور محصورین نے ذوالقعدہ ۳۳۳ھ اور صفر ۳۳۴ھ میں جوابی حملے کیے، جس کے بعد ابو یزید شہر کا محاصرہ اُٹھا کر القیروان چلا گیا۔ اس نے عیش و تنعّم سے توبہ کی اور اپنی پہلی سادہ زندگی کی طرف رجوع کر لیا، چنانچہ بربر پھر اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ تونس (جو کئی مرتبہ ایک فریق سے دوسرے کے قبضے میں جاتا رہا) اور باجہ کے نواح میں شدید جنگیں جاری رہیں۔ ربیع الثانی میں ابو یزید کے ایک بیٹے ایوب نے فاطمی سالار الحسن بن علی کے ہاتھوں شکست فاش کھائی، لیکن جلد ہی اس شکست کا انتقام بھی لے لیا۔ الحسن کُتامہ کے علاقے کی طرف ہٹ گیا اور ابو یزید کے عقب میں (تیجِس اور باغایہ پر قبضہ کر کے) اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے۔ ۶ جُمادَی الاُخرٰی کو ابو یزید نے سُوسہ کا محاصرہ کیا۔ القائم [بامر اللہ] نے ۱۳ شوّال کو وفات پائی۔ اس کے جانشین المنصور نے المہدیہ سے سوار فوج کا ایک چھوٹا سا دستہ روانہ کیا جو سُوسہ کے سامنے ابو یزید کو ہزیمت دینے میں کامیاب ہوا (۲۱ شوال) اور وہ بعجلت تمام القیروان کو واپس چلا آیا۔ اس اثنا میں القیروان کے باشندے ابوعمّار کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور اب انھوں نے ابو یزید کو شہر میں داخل نہ ہونے دیا۔ المنصور ۲۳ شوال کو القیروان میں داخل ہوا۔ ابو یزید نے فاطمیوں کی افواج پر، جو شہر میں قلعہ بند تھیں، متعدّد ناکام حملے کیے (ذوالقعدہ ۳۳۴ھ، محرّم ۳۳۵ھ) اور ۱۳ محرّم کی شدید جنگ کے بعد وہ مغرب کی طرف پسپا ہو گیا۔ الحسن بن علی نے ابو یزید کی بعض باقی ماندہ قلعہ نشین افواج (مثلاً باجہ کی افواج) کے خلاف اقدامات کیے اور پھر المنصور کے لشکر سے جا ملا۔ [اندلس کے] اموی امیر الحجر ابن رماحِس کا بیڑا، جو افریقیہ کی طرف آ رہا تھا، ابو یزید کی ہزیمت کی خبریں سن کر واپس چلا گیا۔ (عبدالرحمٰن ثالث کی طرف ابو یزید کی سفارتوں کے لیے قب نیز ابن العِذاری، ۲:۲۲۸ ببعد؛ E. Lévi Provençal: *Hist. Esp. mus.*، ۲:۱۰۳-۱۰۴)۔

ابو یزید مغرب کی طرف بھاگا اور المنصُور اس کے تعاقب میں برابر چلا آ رہا تھا۔ المنصُور ۲۶ ربیع الاوّل کو القیروان سے چلا اور (سَبِیبَہ اور مَرْ مَاجَنّہ کے راستے) باغایہ پہنچا، وہاں سے اس نے بِلّزمہ، طُبنہ اور بِسکَرہ تک (جہاں وہ جُمادَی الاولٰی کو پہنچا) ابو یزید کا پیچھا کیا۔ وہاں سے وہ طُبنہ کو لوٹ آیا اور مَقَّرہ کے قریب ابو یزید کو شکست دے کر (۱۲ جُمادَی الاولٰی) المَسِیلہ میں داخل ہو گیا۔ ابو یزید جبلِ سالات کو بھاگ گیا۔ جب المنصور اس اجاڑ ملک میں اسے تلاش کرنے میں ناکام ہو کر مغرب کی طرف صِنْہاجہ کے علاقے میں چلا گیا تو ابو یزید نے اس کے عقب میں المسیلہ کا محاصرہ کر لیا۔ ابو منصور واپس ہوا اور ۵ رجب کو المسیلہ میں داخل ہو گیا۔ اس پر ابو یزید نے عَقّار اور کِیانہ کے پہاڑوں میں پناہ لی۔ المنصور نے ۱۰ شعبان کو المسیلہ سے نکل کر ابو یزید کو ایک شدید جنگ میں شکست دی۔ ماہِ رمضان میں المنصور نے اسے ایک اَور شکست دی اور وہ کِیانہ کے قلعے کی طرف پسپا ہوا (جہاں سے وہ مقام نظر آتا تھا جو بعد میں قلعہ بنی حمّاد کہلایا)۔ ۲ شوال کو المنصور نے اس قلعے کا محاصرہ کیا اور ۲۲ محرم ۳۳۶ھ کو اس میں فاتحانہ داخل ہوا۔ رات کے وقت [اس کی فوج کے] آخری باقی ماندہ سپاہی ابو یزید اور ابوعمّار کو اٹھا کر قلعے سے باہر لے گئے، لیکن ابوعمّار مارا گیا اور ابو یزید [گھوڑے سے] گر پڑا اور گرفتار ہوا۔ اس موقع پر المنصور اور اس کے قیدی کے درمیان جو دلچسپ گفتگو ہوئی وہ لکھی ہوئی موجود ہے۔ ابو یزید اپنے زخموں سے ۲۷ محرّم [۳۳۶ھ] / ۱۹ اگست ۹۴۷ء کو فوت ہو گیا۔ اس کی لاش میں بھُس بھروا کر المہدیہ میں عوام کی توہین و تذلیل کا نشانہ بنایا گیا۔ ابو یزید کے بیٹے فَضْل نے اَوْراس اور قِفْصَہ کے علاقے میں کچھ مزید فساد برپا کیا، تا آنکہ ذوالقعدہ ۳۳۶ھ میں اس نے شکست کھائی اور مارا گیا۔ ابو یزید کے دوسرے بیٹوں کو قُرطُبہ کے اُموی دربار میں پناہ مل گئی۔

مآخذ: (۱) اہم ترین ماخذ فاطمی زمانے کی ایک تاریخ ہے، جس کا مواد ادریس عماد الدّین: عیون الاخبار، ج ۵ کے نصف آخر میں محفوظ ہے؛ (۲) اسی بیان سے ابن الرقیق نے اپنی افریقیہ کی گم شدہ تاریخ میں بھی مدد لی تھی؛ (۳) ابن حَمّادُو (طبع Vanderheyden)، ص ۱۸ ببعد، کا سارا بیان بلاشُبہہ ابن الرقیق سے ماخوذ ہے؛ (۴) ابن شدّاد نے بھی اپنی القیروان کی گم شدہ تاریخ میں بلاشُبہہ ابن الرقیق ہی کی نقل کی ہے اور (۵) ابن الاثیر، ۸:۳۱۵ ببعد، کا بیان، جسے آسانی سے اب بھی اسی فاطمی تاریخ کا اقتباس شناخت کیا جا سکتا ہے، بیّن طور پر ابن شدّاد سے لیا گیا ہے؛ (۶) التیجانی کی رحلۃ، مطبوعۂ تونس ۱۹۲۷ء، ص ۱۷، ۱۸-۱۹، ۲۰-۲۱، ۲۳۳-۲۳۵ (ترجمہ در *JA*،

۱۸۵۲ء، ص ۹۶ ببعد، ۱۰۱ ببعد، ۱۰۶ ببعد؛ طبع ۱۹۵۳ء، ۳۶۳ ببعد) میں جو عبارتیں نظر آتی ہیں وہ ابن الرقیق سے ماخوذ ہیں؛ مزید حوالوں کے لیے دیکھیے: (۷) ابو زکریا: *Chronique d' Abou Zakaria*، ترجمہ از Masqueray، الجزائر ۱۸۷۹ء، ۲۲۶ ببعد؛ (۸) ابن العِذاری: البیان المُغرِب (طبع Colin و Lévi Provençal)، ۱: ۳۱۶ (اس میں ابن حَمّادُو — چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی، یہ وہ ابن حمّادو نہیں جس کا ذکر اُوپر آیا ہے —، ابن سعدون اور ابن رقیق سے اقتباسات دیے گئے ہیں)؛ (۹) المقریزی: اِتّعاظ (طبع Bunz) نے زیادہ تر ابن الاثیر کا تتبع کیا ہے، لیکن کچھ مزید حاشیے بھی لکھے ہیں (ص ۵۵، ۵۶ - ۵۷)؛ قب نیز (۱۰) G. Marçais: *La Berberie et l' Orient*، ص ۱۴۷ - ۱۵۳؛ (۱۱) R. Le Tourneau: *La révolte d' Abû Yazîd*، در *Cahiers de Tunisie*، ۱۹۵۳ء، ص ۱۰۳ - ۱۲۵.

(S. M. Stern سٹرن)

---

* **ابو یعزّی**: (یا یعزی) یلنُّور بن مَیْمُون، جو ساحل اوقیانوس کے ایک بربری قبیلے (دُکّالہ، ہَزْمیرہ یا ہَسْکُورہ) میں پیدا ہوے، چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی کے ایک مشہور مراکشی ولی تھے۔ کچھ عرصے فاس میں رہنے کے بعد، جہاں محلّہ البلیدہ (عوامی بولی میں البُلَیْدَہ کی شکل) میں ان کا زاویہ اب بھی مرجع انام ہے، انھوں نے کوہستان اطلس وسطی کے ایک گاؤں طاغیہ میں، جو رَباط اور قصبہ تادْلا کے درمیان واقع ہے، سکونت اختیار کر لی۔ یہ گاؤں آج کل ایک چھوٹا سا انتظامی مرکز ہے اور اس کا نام ولی مذکور کے نام پر اس کے موجودہ تلفظ کے مطابق مُولاے بُوعزّی پڑ گیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اَزمُّور کے مربّی ولی ابوشُعَیب ایّوب بن سعید الصّنْہاجی (مقامی تلفظ: مولاے بُوشُعِیب) کے شاگرد تھے اور خود ان کے شاگردوں میں مشہور بزرگ ابو مَدْیَن [رکّ بآن] الغوث ہوے ہیں۔ انھوں نے یکم شوال ۵۷۲ھ/۲ اپریل ۱۱۷۷ء کو طاغیہ کے زاویے میں طاعون سے وفات پائی، جہاں وہ اپنے صوفیانہ مسلک کے کاملین کے درمیان مجاہدے اور ریاضت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے مزار کے زاویے پر زائرین کا سالانہ اجتماع (مَوْسم) ہوتا ہے۔ اس زاویے کی تعمیر و تزئین مراکش کے علوی سلطان مولاے اسمٰعیل کے حکم سے سترھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہوئی تھی۔

التادِلی نے اپنی کتاب التَشَوُّف الی رجال التَصوُّف میں ان بزرگ کا مفصّل تذکرہ لکھا ہے۔ اس کے علاوہ خاص ابو یعزّی پر مراکش کے ایک صوفی مصنّف احمد بن ابی القاسم الصَومَعی (م ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۴ء) نے المُعْزی فی مناقب ابی یَعْزی کے عنوان سے ایک خاص رسالہ تحریر کیا تھا، نیز دیکھیے E. Lévi Provençal: *Fragments historiques sur les Berbères au Moyen Age*، رباط ۱۹۳۴ء، ص ۷۷.

مآخذ: (۱) ابن القاضی: جَذْوَۃ الاقتباس، فاس ۱۳۰۹ھ، ص ۳۵۴؛ (۲) محمد العربی الفاسی: مرآۃ المحاسن، فاس ۱۳۲۴ھ، ص ۱۹۹؛ (۳) الیُوسی: مُحاضرات، فاس ۱۳۱۷ھ، ص ۱۱۷؛ (۴) الکتّانی: سلوۃ الأنفاس، فاس ۱۳۱۶ھ، ۱: ۱۷۲ - ۱۷۵؛ (۵) Leo Africanus: *Description de l' Afrique*، طبع شیفر (Schefer)، ۲: ۳۰؛ (۶) L. Massignon: *Le Maroc dans les premieres années du XIVe siècle*، الجزائر ۱۹۰۶ء، ص ۷۳؛ (۷) E. Lévi-Provençal: *Hist. Chorfa*، ص ۲۳۹ - ۲۴۰.

(E. Lévi-Provençal)

---

* **ابو یعقوب السّجزی**: اسحٰق بن احمد، اسمٰعیلی داعی اور اپنے فرقے کے اہمّ ترین مصنّفین میں سے ایک۔ رشید الدّین (جامع التواریخ، مخطوطۂ برٹش میوزیم، شمارہ Add. ۷۶۲۸، ورق ۲۷۷ الف) کا بیان ہے کہ "اس کے بعد، یعنی بخارا میں النّسفی کی سزاے موت کے واقعے (۳۳۱ھ/۹۴۲ء) کے بعد، اسحٰق السجزی عرف "خَیْشَفُوج" امیر خلف ابن اسحٰق (کذا در مخطوطہ، [اسحٰق کی بجاے] احمد پڑھیے) السجزی کے ہاتھ میں پڑ گیا" (خلف بن احمد "دوسرے" صفّاری خاندان کا حکمران تھا، جس نے ۳۴۹ سے ۳۹۹ھ تک حکومت کی)۔ اس بیان کا غالبًا یہ مفہوم ہے کہ ابو یعقوب کو امیر خلف نے مروایا تھا (W. Ivanow: *Studies in Early Persian Ismailism*، ص ۱۱۹، حاشیہ ۱، کے مطابق ابو یعقوب کی کتاب الافتخار اندرونی شہادت کی بنا پر، جس کی تصریح نہیں کی گئی، ضرور ۳۶۰ھ/۹۷۱ء کے بعد لکھی گئی ہوگی)۔ بہر کیف معمولاً جو یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ابو یعقوب بخارا میں النَّسفی کے ساتھ ہی ۳۳۱ھ میں مارا گیا تھا غلط ثابت ہوتا ہے (ابو یعقوب کا عُرف خَیْشَفُوج — جو قیاسی طور پر پڑھا گیا ہے، کیونکہ مخطوطے میں اس لفظ پر نقطے نہیں ہیں، غالبًا "بنولے" کے معنی میں ہے، قب Dozy، ۱: ۴۱۷ — البُستی کے اسمٰعیلی مذہب کے ردّ میں بھی مذکور ہے، مخطوطۂ ایمبروزیانا (Ambrosiana)، مجموعۂ (Griffini)، شمارہ ۴۱، جس کا تفصیلی مطالعہ مقالہ نگار ان نے کیا ہے).

ابو یعقوب کی متعدّد باقی ماندہ کتابوں میں سے، جن میں الافتخار سب سے زیادہ اہمّ معلوم ہوتی ہے، صرف کشف المحجوب ہی شائع ہوئی ہے (طبع H. Corbin، تہران، ۱۹۴۹ء)۔ یہ اپنے اصل عربی متن کی شکل میں طبع نہیں ہوئی، کیونکہ وہ گم ہو چکا ہے، بلکہ اس کے ایک فارسی ترجمے کے مطابق ہے۔ ابو یعقوب کی تصانیف کا گہرا مطالعہ از بس ضروری ہے، اس لیے کہ وہ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں اسمٰعیلیّت کی فلسفیانہ شاخ کے عقائد کے بارے میں ہماری سب سے بڑی سند ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس فلسفیانہ نظام کی تشریح و توضیح ابو یعقوب نے کی وہ مجموعی طور پر النّسفی [رکّ بآن] کے افکار پر مبنی تھا، کیونکہ بظاہر النسفی ہی نے ۳۰۰ھ کے قریب اسمٰعیلی مذہب میں نو افلاطونی فلسفہ رائج کیا۔ ابو یعقوب نے ابو حاتم الرّازی کے اعتراضات کے جواب میں النّسفی

کی اہم تصنیف المحصول کی تائید میں ایک کتاب لکھی تھی، جو افسوس ہے تلف ہوگئی۔ تاہم جہاں ہم النّسفی کے فلسفیانہ نظام کو، اس کے بڑے اصولوں کے ساتھ، صرف بعض مختصر اقتباسات کے ذریعے از سرِ نو تعمیر کر سکتے ہیں، وہاں ابو یعقوب کی جو کتابیں محفوظ ہیں ان کی مدد سے ہم، اس فلسفیانہ نظام کا اس شکل میں جس میں اسے ابو یعقوب نے پیش کیا ہے، تمام مطلوبہ تفصیلات کے ساتھ مطالعہ کر سکتے ہیں۔

مآخذ: (۱) البغدادی، الفَرْق، ص ۲۶۷؛ (۲) البیرونی [: کتاب الهند]، ص ۳۲؛ (۳) W. Ivanow: *A Guide to Ismaili Literature*، ص ۳۳-۳۵؛ (۴) وہی مصنّف: *Studies in Early Persian Ismailism*، اشاریہ؛ یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا ابو یعقوب السجزی وہی شخص تھا جو الفہرست، ص ۱۸۹، ۱۹۰ میں ابو یعقوب داعیِ رے، کے طور پر مذکور ہوا ہے اور جو چوتھی صدی ہجری/ دسویں صدی عیسوی کے وسط میں گزرا ہے۔

(S. M. STERN سٹرن)

---

* **ابو یَعْقُوب الخُرَیْمی:** اسحٰق بن حَسّان ابن قُوہی، عرب شاعر، جس نے غالبًا خلیفہ المأمون کے عہد میں ۲۰۶ھ/ ۸۲۱ء کے قریب وفات پائی۔ وہ سُغدِیانہ کے ایک شریف خاندان کا فرد تھا، جس کا ذکر اس نے کہیں کہیں فخر و مباہات کے ساتھ کیا ہے (یاقوت، ۵: ۳۶۳)۔ اس کی نسبت الخُرَیْمی (الخُزَیمی [''زاء'' کے ساتھ] صحیح نہیں) براہِ راست خُرَیم النّاعم کا مولی ہونے کی وجہ سے نہیں، جیسا کہ اُس کے اکثر سوانح نگار لکھتے ہیں، بلکہ اس کے وارثوں، یعنی خُرَیم بن عامر اور اس کے بیٹے عثمان، سے ہے (دیکھیے ابن عساکر: تأریخ، ۲: ۴۳۴-۴۳۷ و ۵: ۱۲۶-۱۲۸)۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عراق، شام، البصرہ اور بالآخر بغداد میں مقیم رہا۔ البصرہ میں وہ حمّاد العَجرد، مطیع بن ایاس وغیرہ جیسے اوباش شاعروں سے میل ملاقات رکھتا تھا (الأغانی، طبع اوّل، ۵: ۱۷۰ و ۱۳: ۸۲)۔ بغداد میں وہ خلیفہ ہارون الرشید کے درباریوں (الأغانی، طبع اوّل، ۱۲: ۲۱-۲۲) بالخصوص یحیٰی بَرْمَکی (الخطیب: تأریخ بغداد، ۶: ۳۲۶)، الفضل (الجہشیاری: الوزراء، ورق ۱۵۰ الف، اور جعفر (الأغانی، طبع اوّل، ۱۲: ۲۱-۲۲)، نیز ان کے کاتبوں الحسن بن بُجْباح البلخی اور محمد بن منصور بن زیاد (ابن الجرّاح، ص ۱۰۳؛ الجَہْشیاری، ص ۱۱۸ الف، ۱۷۰ الف) کے ساتھ وابستہ رہا۔ الامین اور المأمون کے مخاصمے میں اس نے الامین کی طرفداری کی (المسعودی: مُرُوج، ۶: ۴۶۲-۴۶۳) اور محاصرۂ بغداد کے دوران میں اس نے ایک طویل قصیدہ لکھا (الطبری، ۳: ۸۷۳-۸۸۰)، جس میں اس نے شہر کی تباہی کا نقشہ کھینچا تھا اور المأمون سے التجا کی تھی کہ وہ اس برادر کشانہ جنگ کو ختم کر دے۔

الخُرَیْمی کی شاعری، جس سے المغرب بھی واقف تھا (قبّ الحُصْری: زَھْر (طبع زکی مبارک)، ۴: ۲۰۱، ابن شَرَف: انتقاد (طبع Pellat)، الجزائر ۱۹۵۳ء، اشاریہ)، بلاشبہہ اس سے کہیں زیادہ اہم تھی جتنی کہ وہ مذکورہ قصیدے سے اور اس کے ان متفرق اشعار سے معلوم ہوتی ہے جو تاریخ و ادب کی کتابوں میں درج ہیں۔ اس نے کچھ ہجویہ اشعار بھی کہے، جن میں سے بعض کو عَلّوَیہ نے گایا تھا (ابن الجرّاح، ص ۱۰۵؛ الأغانی، ۱۰: ۱۲۰-۱۳۵)، لیکن الخُرَیْمی کا مقدّم ترین مقام قصائد (جن میں ممدوح کا انتخاب شخصی منفعت کے پیشِ نظر کیا جاتا تھا) اور مراثی کا مصنّف ہونے کی حیثیت سے ہے، جو اس نے اپنے متعلّقین، بالخصوص محمد بن منصور بن زیاد اور خُرَیْمی خاندان کے ارکان کے لیے لکھے ہیں (ابن عساکر، محلِ مذکور)۔ زندگی کے آخری ایام میں اس کی دوسری آنکھ بھی جاتی رہی (اس کی ایک آنکھ پہلے ہی نہ تھی اور اس لیے بعض دفعہ اسے 'الأعْوَر' کہا جاتا ہے)۔ اس حادثے کے زیرِ اثر اس نے درد انگیز اشعار لکھے ہیں (الجاحظ: الحَیوان، طبع دوم، ۳: ۱۱۳ و ۱۳۱-۱۳۲؛ الأغانی، ۱۵: ۱۰۹؛ الصَّفَدی: نَکْتُ الهِمْیان، ص ۱۷)۔

نقّادانِ سخن الخُرَیْمی کی طبّاعی کے معترف ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ اس کا کلام شاہی دفاتر کے کاتبوں میں بہت مقبول تھا۔ اس کی وجہ بلاشبہہ یہ تھی کہ وہ عجمی الاصل تھا، اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے شعوبیہ تحریک میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔

مآخذ: (۱) ان کے علاوہ جن کا ذکر متن مقالہ میں آ چکا ہے: (۱) الجاحظ: البیان (طبع السَّنْدُوبی)، ۱: ۱۰۵ و مواضع کثیرہ؛ (۲) وہی مصنّف: بخلاء (طبع حاجری)، ص ۳۲۸ ببعد؛ (۳) ابن قُتَیبہ: الشعر، ص ۵۴۲-۵۴۶؛ (۴) وہی مصنّف: عُیُون، ۱: ۲۲۹ و ۲: ۱۲۹؛ (۵) ابن الجرّاح: الوَرَقَة، قاہرہ ۱۹۵۳ء، بہ امداد اشاریہ؛ (۶) ابن المعتزّ: طبقات، ص ۱۳۸-۱۳۹؛ (۷) ابن عبد ربّہ: العقد، قاہرہ ۱۹۴۰ء، ۸: ۱۴۶؛ (۸) الفہرست، اشاریہ؛ (۹) عسکری: دیوان المعانی، ۱: ۴۷، ۲۷۹ و ۲: ۱۷۵، ۱۹۷؛ (۱۰) وہی مصنّف: صِناعَتَیْن، ص ۳۴۵؛ (۱۱) الثعالبی: خاص الخاص، تونس ۱۲۹۳ھ، ص ۹۷؛ (۱۲) رِفاعی: عصر المأمون، ۳: ۲۸۶-۲۹۴؛ (۱۳) احمد امین: ضحی الاسلام، ۱: ۶۴-۶۵؛ (۱۴) O. Rescher: *Abriss*، ۲: ۳۷-۳۸؛ (۱۵) براکلمان (Brockelmann)، ۱: ۱۱۱-۱۱۲.

(CH. PELLAT پیلا)

---

* **ابو یعقوب یوسف:** بن عبد المؤمن، مؤمنی خاندان (الموحّدون [رکّ بآن]) کا دوسرا حکمران، جس نے ۵۵۸ سے ۵۸۰ھ/ ۱۱۶۳ سے ۱۱۸۴ء تک حکومت کی۔ اسے تختِ سلطنت ایک غیر قانونی انقلاب حکومت کی بدولت نصیب ہو گیا، ورنہ ۵۴۹ھ/ ۱۱۵۴ء میں اس کے بڑے بھائی محمد کی ولی عہدی کا سرکاری طور پر اعلان ہو چکا تھا۔ یہ سچ ہے کہ محمد دو ماہ تک حکومت کرتا رہا، گو اس حقیقت کو اس خاندان کے تقریبًا جملہ مؤرّخین خاموشی سے نظر انداز کر گئے ہیں، لیکن با اقتدار وزیر عمر بن عبد المؤمن نے یہ دعوٰی کیا کہ اس کے والد نے اپنی وفات سے چار دن پہلے فرمان صادر کر دیا تھا کہ خطبے میں ولی عہد [محمد] کا نام نہ لیا جائے اور اسے (یعنی وزیر عمر کو) بسترِ مرگ پر بلا کر اس سے صراحةً کہہ دیا تھا کہ میں چاہتا

ہوں کہ میرے بعد یوسف میرا جانشین بنے؛ چنانچہ اس نے بعجلت تمام یوسف کو اشبیلیہ سے بلا لیا جہاں وہ گزشتہ چھے سال سے بحیثیت والی مقیم تھا اور رباط الفتح میں شیوخ اور عساکر سے اعلان کرا دیا کہ یوسف کو نیا خلیفہ مقرر کر دیا گیا ہے۔

یوسف کی تخت نشینی کو قطعًا بالاتفاق پسند نہیں کیا گیا، چنانچہ اس کے بھائی علی والیِ فاس نے، جو اپنے باپ کی میّت کو دفن کرنے کے لیے تینمَلّل (Tinmallal) گیا ہوا تھا، اس تحکمانہ تقرّر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، لیکن کوہستان اطلس سے واپس آتے ہوئے وہ پُراسرار طریق سے فوت ہو گیا۔ یوسف کے دو اَور بھائیوں عبداللہ والیِ بجایہ نے، جو کچھ ہی عرصے بعد زہر سے ہلاک ہو گیا اور عثمان والیِ قُرطُبہ نے بھی اسے خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا؛ اسی لیے یوسف کو لقب خلافت ''امیر المؤمنین'' اختیار کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور اس نے مزید پانچ سال تک ''امیر المسلمین'' ہی کے لقب پر اکتفا کیا۔

اس بھاری فوج کو جو اس کے باپ نے رباط میں جمع کر رکھی تھی برطرف کر کے مراکش میں اپنا تسلّط جما لینے کے بعد اسے ایک بغاوت فرو کرنا پڑی، جو سبتہ (Ceuta) اور القصر الکبیر (Alcázarquivir) کے درمیان غُمارہ قبائل میں برپا ہو گئی تھی۔ ادھر اندلس میں سید عمر اور سید عثمان ابن مَرْدَنیش [رکّ بآن] اور اس کی عیسائی اجیر فوج کے مقابلے میں زور شور سے معرکہ آرائی کر رہے تھے۔ انھوں نے ۵۶۰ھ/ ۱۱۶۵ء میں اس کے علاقے میں یلغار کر کے اس کی فوج کو مرسیہ سے دس میل باہر شکست دی، لیکن شہر مقابلے پر ڈٹا رہا اور اس نے مزید پانچ سال تک اپنی آزادی کو برقرار رکھا۔

جب معاند سید مطیع ہو گئے، یا راستے سے ہٹا دیے گئے، ابن مَرْدَنیش شکست کھا چکا اور غُمارہ کی بغاوت بھی دبائی جا چکی تو ۵۶۳ھ/ ۱۱۶۸ء میں یوسف نے لقبِ خلافت [امیر المؤمنین] اختیار کر لیا، لیکن ٹھیک اس وقت، جب کہ اعلانِ خلافت پر جشن منائے جا رہے تھے پرتگال کی چھوٹی سی جنگ جُو ریاست اس کے لیے بدرجۂ غایت تشویش و پریشانی کا موجب بن گئی۔ افانسو ہنریقس (Afonso Henriques) کے سپہ سالار گیرالڈو سِم پاؤور (Giraldo Sem Pavor) نے یَبُورا (Evora)، ترجالہ (Trujillo)، حِصن قاصرش (Cáceres)، مُنتانْجِش (Montanchez)، سرپہ (Serpa) اور جُرومنْہَہ (Juromenha) کے شہروں پر قبضہ جما لیا اور شاہ پرتگال کی معیت میں شہر بطلیوس (Badajoz) کا محاصرہ کر لیا، جو لیون (Leon) کے فرڈیننڈ (Ferdinand) ثانی کی مداخلت ہی سے بچایا جا سکا، جس کا الموحدون سے اتّحاد تھا۔

لیوانت (Levante) میں ابن مردنیش کا مسئلہ تقریبًا خود بخود حل ہو گیا۔ ابن مردنیش کے نائب اور خُسر ابن ہَمُشکُو کا ابن مردنیش سے جھگڑا ہو گیا اور ابن ہَمُشکُو نے الموّحدون کی اطاعت قبول کر لی۔ اس وقت یوسف نے اپنی ساری فوج مجتمع کی اور آبنائے [جبل الطارق] کو عبور کر کے اندلس پہنچ گیا۔ مرسیہ کا باقاعدہ محاصرہ شروع ہوا اور یوسف نے قرطبہ کے مرکز میں بیٹھ کر خود اس معرکے کی قیادت کی۔ شہر تو نہ لیا جا سکا، لیکن ابن مردنیش کے سپاہی ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑتے چلے گئے اور اس کے ظلم و ستم کے باعث اس کے آخری حامی بھی اس سے الگ ہو گئے۔ اپنی زندگی بھر کے کام کا قصّہ یوں تمام ہوتے دیکھ کر وہ ۵۶۷ھ/ ۱۱۷۲ء میں سخت جھنجلاہٹ کے عالم میں فوت ہو گیا۔ اس کا بڑا بیٹا ہلال اور اس کے دوسرے بھائی عقیدۂ ''توحید'' قبول کر کے یوسف کے مطیع ہو گئے۔ یوسف ان سے حسنِ سلوک سے پیش آیا، خاطر و مدارات کی اور انھیں اپنی مجلسِ مشاورت میں شامل کر لیا۔

ابن مردنیش کے یہ بیٹے جب اشبیلیہ پہنچے تو انھوں نے یوسف کو مشورہ دیا کہ وَبْذَہ (Huete) کا محاصرہ کر لینا چاہیے، جہاں انھیں دنوں عیسائی آ کر از سرِ نو آباد ہو گئے تھے اور جو کونکہ (Cuenca) کے لیے اور لیوانت کی سرحدوں کے لیے خطرے کا باعث بن رہا تھا۔ بنا بریں یوسف اشبیلیہ سے روانہ ہوا اور بِلْشِش (Vilches) اور الکرازہ (Alcaraz) کو سر کر کے البسیط (Albacete) کے میدانی علاقے میں سے کوچ کرتا ہوا جولائی میں وَبْذَہ پہنچ گیا۔ محاصرے سے جلد ہی خلیفہ میں عزم و ہمّت کے فقدان اور اس کی افواج کی غیر مستقل مزاجی اور غیر جنگجویانہ افتادِ طبع کا اندازہ ہو گیا؛ چنانچہ محاصرہ یکسر ناکام ثابت ہوا۔ پہلے یہ نظر آتا تھا کہ محصورین، جنھوں نے الموحدون کے حملے کا مقابلہ بڑی پامردی سے کیا تھا، پانی کی قلّت کی وجہ سے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائیں گے، لیکن موسمِ گرما کی طوفانی بارشوں نے ان کے تالاب پانی سے بھر دیے اور حملہ آوروں کے خیمے میں بدنظمی پھیلا دی۔ الموحدون سامانِ رسد کی کمی کے باعث نیز قشتالہ (Castile) کی افواج کے قریب آ جانے کی اطلاع پانے کی وجہ سے محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو گئے اور کونکہ، شاطبہ (Játiva)، آلیش (Elche) اور اوریولہ (Orihuela) کی راہ سے واپس مرسیہ پہنچ گئے، جہاں افواج منتشر کر دی گئیں۔

یوسف ۵۶۸ھ/ ۱۱۷۲-۱۱۷۳ء کے موسمِ سرما کے دوران میں آرام کرتا رہا، لیکن کاونٹ جمینو (Jimeno) ''کبڑا'' (الاحدب)، جس نے وابلہ (Avila) کے لوگوں سے مل کر وادی الکبیر کے علاقے میں تباہی مچا رکھی تھی، شعبان ۵۶۸ھ/ اپریل ۱۱۷۳ء میں استجہ (Ecija) کے علاقے میں گھس آیا اور لوٹ مار کر کے بہت سامان لے گیا۔ اس پر جو افواج وبذہ سے واپس آئی تھیں از سرِ نو اکٹھی کی گئیں اور ان تھک ابوحفص عمر اینْتِی [رکّ بہ ابوحفص عمر الہِنتاتی] نے خلیفہ کے دو بھائیوں یحیٰی اور اسمٰعیل کی معیت میں کاونٹ مذکور کو کراکوئیل (Caracuel) کے قریب جا لیا، اسے شکست دی اور جان سے مار ڈالا۔ اس کے بعد بطلیوس (Badajoz) کو سامانِ رسد پہنچایا گیا اور دریائے تاجہ (Tagus) کے کنارے طَلَبیرہ (Talavera) سے لے کر طلیطلہ (Toledo) تک کا سارا علاقہ تاخت و تاراج کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ افانسو ہنریقس (Afonso Henriques) پرتگال کی جانب سے اور کاؤنٹ نونیو ڈی لارا (Nuño de Lara) قشتالہ کی طرف سے لڑائی روکنے کی درخواست کرنے اور پانچ سال کے لیے عارضی صلح کے معاہدے

پر دستخط کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ۵۶۹ھ/ ۱۱۷۳-۱۱۷۴ء کا موسمِ سرما صوبۂ الغرب (Algarve) میں باجہ (Beja) کے مقام کے استحکامات کی درستی میں صرف ہوا، جو دو سال پہلے تباہ ہو گیا تھا اور خالی کر دیا گیا تھا۔

بعد ازاں یوسف نے بڑی دھوم دھام سے ابن مردنیش کی ایک بیٹی کے ساتھ بیاہ رچایا اور ۵۷۰ھ/ ۱۱۷۵ء کا سارا سال اشبیلیہ ہی میں مقیم رہا۔ اندلس میں یوسف کے اس دوسری مرتبہ قیام کو پانچ سال گزر چکے تھے کہ وہ اچانک مراکش کو روانہ ہو گیا۔

ان دنوں ساری مملکت کے اندر شدید وبا پھیلی ہوئی تھی۔ یوسف کے بھائی فوت ہو گئے اور وہ خود طویل مدّت تک بیمار رہا۔ اس اثنا میں الفانسو ہشتم نے کونکہ (Cuenca) کا محاصرہ کیا اور نو ماہ کے بعد اکتوبر ۱۱۷۷ء میں اس مشہور قلعے کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔ قرطبہ اور اشبیلیہ کی قلعہ نشین افواج نے محاصرین کی توجہ ہٹانے کے لیے طلبیرہ اور طلیطلہ کی طرف حرکت کی، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

کونکہ کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد یوسف نے، جو اب بیماری سے شفا پا چکا تھا، اپنے بھائیوں یعنی قرطبہ اور اشبیلیہ کے والیوں سے اس بارے میں مشورہ کیا کہ عیسائیوں کے روز افزوں جارحانہ اقدامات کو روکنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ پرتگال کے ساتھ عارضی صلح کی میعاد ختم ہو چکی تھی اور ولی عہد سینکو (Sancho) نے وادی الکبیر کے زیریں علاقے پر یلغار کر کے پہلے طریانہ (Triana) پر اور بعد ازاں لبلہ (Niebla) اور الغرب (Algarve) کے سارے علاقے پر حملہ کر دیا تھا؛ چنانچہ باجہ کا شہر مجبوراً پھر خالی کر دیا گیا تھا۔

یوسف کے پاس ان حملوں کے مقابلے کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ افریقیہ کے عربوں کو مراکش اور الاندلس میں منتقل کر دے، لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ یہ عرب علی کی قیادت میں، جو بنو الرَّند، رؤسائے قَفْصہ (Gafsa) [رک بآن]، میں سے تھا اور جس نے بغاوت کا عَلَم بلند کر رکھا تھا، روز بروز زیادہ شورہ پشت ہوتے چلے جا رہے ہیں تو وہ مخالفت کے اس خطرناک مرکز کا قلع قمع کرنے اور عربوں کو اندلس کے جہاد میں شامل ہونے پر مجبور کرنے کی غرض سے ان کے خلاف میدان کارزار میں اتر آیا اور مراکش سے افریقیہ کی طرف چل پڑا۔ اس نے ۵۷۶ھ/ ۱۱۸۰-۱۱۸۱ء کے موسمِ سرما میں قفصہ کے شہر کو تین ماہ کے محاصرے کے بعد سر کر لیا اور علی الملقب بہ الطویل نے ہتھیار ڈال دیے اور بنو ریاح نے بھی دکھاوے کے طور پر اطاعت قبول کر لی۔ بایں ہمہ عربوں کی محض ایک قلیل تعداد نے یوسف کا ساتھ دیا۔ ان میں سے زیادہ تر افریقیہ ہی میں رہے اور اس بات کے لیے حاضر و آمادہ تھے کہ الموحّدون کے خلاف جو بھی بغاوت کی تحریک ہو اس کی تائید کریں اور قَراقُوش [رک بآن] اور بنو غانیہ [رک بہ ابن غانیہ] کی امداد کر سکیں۔

اندریں اثنا جزیرہ نمائے آئی بیریا میں الفانسو ہشتم نے استجہ (Ecija) کی طرف پیش قدمی کر کے حصن لُورَہ (Lora del Rio) کے قریب شَنْتَ فِیلَہ (Santafila) کا مقام سر کر لیا۔ ٹھیک اسی زمانے میں ادھر تو المساجد (San Lucar la Mayor)، حصن الفارشہ (Aznalfarche) اور لبلہ (Niebla) کی جانب پرتگیزوں کی یلغار جاری تھی اور ادھر ''مقابل اطلس'' (Anti- Atlas) کے بنو واوَزْجیت نے بغاوت کر کے زجَنْدَر (Zadjundar) کی چاندی کی کان پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان باغیوں کی سرکوبی کے لیے خلیفہ کو خود جانا پڑا اور ابن وانُودِین نے طلبیرہ (Talavera) پر چھاپا مارا۔ بالآخر یوسف نے ۵۷۹ھ/ ۱۱۸۳ء میں شہر مرّاکش کی فصیل کو بڑھا کر اسے جنوب کی طرف توسیع دینے کا کام شروع کرنے کے بعد — ایک اہم اقدام، جسے اس کے بیٹے یعقوب نے الصّالحہ کا شاہی محل بنا کر جاری رکھا — وَبْذہ (Huete) کی حوصلہ شکن نظیر کے باوجود یہ فیصلہ کر لیا کہ پرتگیزوں کی جسارت اور گستاخی کا خاتمہ کرنے کے لیے اپنے تمام عساکر کو کام میں لائے۔

اس مہمّ کی اور لشکر کو جمع کرنے کی تیاریاں بہت وسیع پیمانے پر کی گئیں، لیکن ان میں بہت وقت صَرف ہو گیا۔ ماہ مئی میں قشتالہ (Castile) اور لیون (Leon) کی مملکتوں کے درمیان فریسنو لیوندرہ (Fresno- Lavandera) کا صلح نامہ طے ہو گیا تھا اور قرار پایا تھا کہ دونوں ریاستیں باہم مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑیں گی۔ فرڈیننڈ نے اپنی طرف سے یہ کیا کہ الموحّدون کے ساتھ دوستی کا معاہدہ منسوخ کر دیا۔ تین ماہ بعد یوسف نے اپنی فوجیں جمع کرنا شروع کیں اور ۱۶ ربیع الاوّل ۵۸۰ھ/ ۲۷ جون ۱۱۸۴ء کو شَنْتَرین (Santarém) کے سامنے جا پہنچا۔ پرتگیزوں کو اپنے اس قلعے کے استحکامات مضبوط کرنے کے لیے دس ماہ مل چکے تھے اور وہ یوں بھی طویل محاصرے کے بغیر قریب قریب ناقابلِ تسخیر تھا۔ الموحّدون کو دریا کے قریب کی بیرونی بستی پر قبضہ کرنے کے لیے بڑی زحمت اٹھانا پڑی۔ ایک ہفتے کی سعی بے سود اور دشمنوں کی ان تھک مزاحمت کے بعد جب یہ معلوم ہوا کہ فرڈیننڈ ثانی اپنے لیونی عساکر کے ساتھ آ رہا ہے تو الموحّدون میں ہراس پھیل گیا اور وہ سراسیمگی کے عالَم میں پھر دریا کے پار پسپا ہو گئے۔ خیمہ و خرگاہ اٹھایا جا رہا تھا کہ خلیفہ مہلک طور پر زخمی ہو گیا اور ۱۸ ربیع الثانی ۵۸۰ھ/ ۲۹ جولائی ۱۱۸۴ء کو اشبیلیہ کی شاہراہ پر یبورہ (Evora) کے نزدیک فوت ہو گیا۔

ابویعقوب یوسف کو خلفائے الموحّدین میں قابل ترین سمجھا جاتا ہے۔ وہ ایک مَصْمُودی عورت کے بطن سے تھا، جو قاضی ابن عمران کی بیٹی تھی۔ وہ قلبِ اطلس میں تِینْمَلَّل (Tinmallal) کے مقام پر پیدا ہوا اور اسے عقیدۂ ''توحید'' کی تعلیم مراکش میں دی گئی؛ پھر بھی اس امر کے باوجود کہ اس کی پیدائش المغرب کی تھی اور وہیں اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی اشبیلیہ کے طویل قیام کی بدولت، جہاں وہ سترہ سال کی عمر میں پہنچ گیا تھا، وہ ایک ایسا اندلسی ادیب بن گیا تھا جو تہذیب و شائستگی میں اس دَور کے ملوک الطوائف میں کسی سے کم نہ تھا۔ اس کے گرد مشہور حکما، اطبّا اور شعرا جمع رہتے تھے جن کی صحبت میں اس نے اپنے علم و ادب کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور اپنے فنونِ لطیفہ کے ذوق کو ترقی دی۔ اشبیلیہ کی

رعنائیوں کے فریب میں گرفتار ہوکر اس نے اس شہر کو از سرِ نو الاندلس کے صدر مقام کا لقب عطا کر دیا، جو اس کے باپ نے اپنے عہد کے آخری ایّام میں اس سے چھین لیا تھا۔ اس نے اس شہر میں متعدّد قابلِ یادگار عمارتیں بنوائیں اور رفاہِ عامّہ کے بہت سے مفید ادارے قائم کیے۔ وہ ان علمی مجالس میں شریک ہوکر لطف اندوز ہوتا تھا جن کی زینت ابن طفیل، ابن رُشد اور ابن زُہر جیسے علما بڑھایا کرتے تھے اور ان علما کی حوصلہ افزائی ہی سے اس نے اپنی مشہور تصانیف تیار کیں۔

اس کے ساتھ ہی اس خوف و ہراس کی بدولت جس کے ذریعے اس کے باپ نے اپنا اقتدار قائم کیا تھا علم و ہنر کے اس دوست کو المغرب میں مطلق العنانی سے حکومت کرنے کا موقع مل گیا۔ افریقیہ کا ملک اب بھی اس کے زیرِ اقتدار تھا اور مُرسیہ میں ابن مَرْدَنیش کی خطرناک خود مختار ریاست ختم ہوچکی تھی؛ تاہم ظاہری شان و شوکت کے باوجود الاندلُس میں عیسائیوں کے ساتھ اس کی لگاتار معرکہ آرائی نے ظاہر کر دیا کہ وہ کوئی قابل جنگی رہنما نہ تھا، اس کی بھاری فوج کے حوصلے پست تھے اور اس کے رسد رسانی کے انتظامات ناقص؛ چنانچہ جزیرہ نما کی چھوٹی چھوٹی عیسائی ریاستوں نے، جو اگرچہ اپنے اندرونی لڑائی جھگڑوں کے باعث باہم متحد نہ تھیں اور جن کے پاس جنگی سپاہیوں اور ذرائع جنگ کی کمی تھی، اسے کئی زبردست شکستیں دیں۔ اس کی جہاد جاری رکھنے کی زبردست خواہش عیسائیوں کے جارحانہ اقدام کو روکنے میں کامیاب نہ ہوسکی اور بالآخر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شُنْتَرین کے پرتگیزی قلعے کے سامنے وہ ہلاک ہوگیا۔

مآخذ: (۱) ابن العِذاری: البیان المُغْرِب، ج ۴، ترجمہ از Huici، تیطوان ۱۹۵۳ء، ص ۱ - ۸۴؛ (۲) المرّاکُشی: مُعْجِب (طبع ڈوزی)، ص ۱۶۹ ببعد؛ (۳) ابن خلدون: عِبَر، ۱:۳۱۸ ببعد؛ (۴) ابن ابی زَرْع: روض القِرطاس، فاس، ص ۱۳۰ ببعد؛ (۵) الحُلَل المَوْشِیَّة (طبع Allouche)، ص ۱۳۱؛ ترجمہ از Huici، ص ۱۸۸؛ (۶) R. Dozy: *Recherches*، طبع ثالث، ۱:۶۷ و ۲: ۴۴۳ - ۴۸۰؛ (۷) *Primera Crónical General* (طبع R. Menéndez Pidal)، ۱:۶۷۵؛ (۸) E. Lévi- Provençal: *Documents inédits d' his-toire almohade*، ص ۱۲۶ - ۲۱۴؛ (۹) da Silva Tarouca: *Crónicas dos sete primeiros reis di Portugal*، ۱:۹۹ ببعد.

(A. Huici Miranda مرانڈا)

⊗ **ابویَعْلَی الفرّاء:** محمد بن الحُسین بن محمد بن خلف ابن احمد البغدادی، مشہور حنبلی امام و فقیہ؛ ولادت: ۱۹ رمضان ۳۸۰ھ [۱۱ دسمبر] ۹۹۰ء؛ وفات: ۴۵۸ھ/ ۱۰۶۶ء۔ عبّاسی خلیفہ القادر باللہ اور القائم بامر اللہ کے عہد میں ان کا اثر و رسوخ اپنے اَوْج پر تھا۔ القائم نے انھیں دارالخلافہ کے قاضی کا منصب پیش کیا، لیکن انھوں نے انکار کر دیا؛ بالآخر اس شرط پر راضی ہوے کہ وہ شاہی جلوس، رسمی تقریبات اور دربار کی حاضری سے مستثنیٰ ہوں گے۔

ابویعلی نے عرصے تک شیخ ابوعبداللہ بن حامد کی صحبت میں رہ کر استفادہ کیا۔ ان کے شیوخ میں ایسے اصحاب بھی ہیں جن کے اور امام احمدؒ بن حنبل کے درمیان صرف ایک واسطہ البغوی کا ہے۔ جامع المنصور میں وہ عبداللہ بن الامام احمدؒ کی کرسی پر بیٹھ کر بعد نمازِ جمعہ درس دیا کرتے تھے۔ یہ مجلس اس لحاظ سے یادگار ہے کہ اس میں بیشتر اعیان و علما شریک ہوتے اور پھر بھی یہ اتنی بڑی ہوتی کہ بغداد میں ایسی مجلس کم ہی دیکھنے میں آتی۔

ابویعلی امام احمدؒ بن حنبل کے مقبرے میں مدفون ہیں۔

ابویعلی کا پایہ عقائد میں بہت بلند تھا۔ ان کے دور میں صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں گرما گرم بحث کا سلسلہ جاری تھا۔ ان کا مسلک وہی تھا جو بغیر کسی فلسفیانہ موشگافی کے سلفِ صالح کا تھا یعنی "الایمان باخبار الصّفات من غیر تعطیل ولا تشبیہ ولا تفسیر ولا تأویل"۔ اس مسلک کی وضاحت انھوں نے اپنی مشہور کتاب ابطال التأویلات لاخبار الصّفات میں کی، جس پر ابتدا میں بہت لے دے ہوئی، لیکن بالآخر القادر باللہ نے اس سے اپنی پوری خوشنودی و رضامندی کا اعلان کیا۔ خود القادر باللہ نے اپنے الرِسالة القادریة میں جو مسلک اختیار کیا ہے وہ ابویعلی کے مسلک کے عین مطابق ہے۔ ابویعلی نے اس سلسلے کی ایک اَور کتاب بھی تصنیف کی تھی، جس کا عنوان ہے ردود علی الأشعریّة والکرامیّة والسالمیّة والمجسّمیّة وابن اللبان۔

ابویعلی کی ایک اَور مشہور تصنیف الاحکام السلطانیة ہے۔ اس کی عبارت بیشتر جگہ ہو بہو وہی ہے جو مشہور شافعی امام الماوردی (ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب البصری البغدادی) کی ہم نام تصنیف کی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ابویعلی اپنے امام احمدؒ بن حنبل کے مذہب کے مطابق روایات اور فروع بیان کرتے ہیں اور الماوردی اپنے امام الشافعیؒ کا مذہب بیان کرتے ہیں اور اس کا مقابلہ دیگر مذاہب سے کرتے ہیں۔ ابویعلی اور الماوردی دونوں ایک ہی زمانے میں اور بغداد ہی میں تھے (الماوردی نے چھیاسی سال کی عمر پا کر ۴۵۰ھ میں وفات پائی)۔ ہنوز یہ امر تحقیق طلب ہے کہ ان دونوں میں سے کونسی کتاب متقدّم ہے اور ان دونوں کے مابین کس نوعیت کا رابطہ ہے۔

ابویعلی کی بابت ایک رائے یہ ہے کہ فقہ اور امام احمدؒ بن حنبل کے مذہب کی توضیح اور تائید میں ان کا کوئی ہمسر نہیں، البتہ رجال اور علل حدیث میں وہ قابلِ وثوق نہیں۔ بسا اوقات وہ کمزور حدیثوں کو بطورِ حجّت پیش کر جاتے ہیں۔

ابویعلی کا سارا گھرانا علم و فضل میں ممتاز تھا۔ ان کے باپ اور چچا مشہور عالم اور فقیہ تھے۔ اسی طرح ان کے تین بیٹوں نے علم و فقہ میں نمایاں حیثیت حاصل کی اور اپنے والد کے کارناموں میں اضافے کیے: ۱- عبید اللہ ابوالقاسم (۴۴۳ - ۵۴۹ھ)؛ ۲- محمد ابوالحسین (۴۵۱ - ۵۲۶ھ)، انھوں نے مشہور کتاب طبقات الحنابلة تصنیف کی، جو اپنی نوعیت کی پہلی کتاب شمار کی جاتی ہے اور اہم ترین ماخذ ہے۔ بعد میں اس کے متعدّد ذیل لکھے گئے؛ ۳- محمد ابوخازم (۴۵۷ -

۵۲۷ھ)، جن کے ایک صاحبزادے قاضی عمادالدین ''ابو یعلٰی الصغیر'' (۴۹۴ - ۵۶۰ء) کے لقب سے مشہور ہوئے۔

ابو یعلٰی کی تصانیف کثیر تعداد میں ہیں۔ ان کی فہرست ابن ابی یعلٰی: طبقات الحنابلة (۲: ۲۰۵) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ چند قابلِ ذکر کتابوں کے نام یہ ہیں: ۱- الکفایة فی اصول الفقه؛ ۲- العدّة فی الاصول؛ ۳- المعتمد فی اصول الدین؛ ۴- کتاب الایمان؛ ۵- المجرّد؛ ۶- شرح مختصر الخرقی (المختصر فی الفقه، تصنیف ابی القاسم عمر بن الحسین بن عبداللہ بن احمد، م ۳۳۴ھ)؛ ۷- احکام القرآن؛ ۸- عیون المسائل؛ ۹- اربع مقدمات فی اصول الدیانات؛ ۱۰- اثبات امامة الخلفاء الاربعة و تبرئة معاویة؛ ۱۱- مقدمة فی الادب؛ ۱۲- تفضیل الفقر علی الغنی؛ ۱۳- کتاب الطبّ؛ ۱۴- کتاب الروایتین والوجهین (اس کا تتمہ بعنوان التمام لکتاب الروایتین، ابو یعلٰی کے صاحبزادے ابوالحسین نے لکھا ہے)؛ ۱۵- الخلاف الکبیر؛ ۱۶- الخِصال والاقسام؛ ۱۷- إبطال الحِیَل؛ ۱۸- تکذیبُ الخَیابِرة فیما یَدّعونه من إسقاط الجزیة.

مآخذ: (۱) ابن ابی یعلٰی: طبقات الحنابلة، تصحیح محمد حامد الفقی، قاہرہ ۱۳۷۱ھ/ ۱۹۵۲ء، ۲: ۱۹۳ ببعد - مذکورہ طبقات کا اختصار از شمس الدین (ابو عبداللہ محمد بن عبدالقادر بن عثمان) النابلسی (م ۷۹۷ھ)، تصحیح احمد عبید، دمشق، ۱۳۵۰ھ؛ (۲) مختصر طبقات الحنابلة (مبنی بر طبقات الحنابلة، تا ۹۰۰ھ، از العلیمی المقدسی عبدالرحمٰن بن محمد بن عبدالرحمٰن، جمع و اختصار از محمد جمیل الشطّی، دمشق ۱۳۳۹ھ؛ (۳) الصفدی: الوافی بالوفیات، دمشق ۱۹۵۳ء، ۳: ۷؛ (۴) ابن الجوزی: المنتظم، ۸: ۲۴۳ - ۲۴۴ (عدد ۲۹۵)؛ (۵) تأریخ بغداد، (مطبعة السعادة ۱۹۳۱ء)، ۲: ۲۵۶؛ (۶) شذرات الذّهب، ۳: ۳۰۶؛ (۷) ابو یعلٰی: الاحکام السلطانیة، تصحیح محمد حامد الفقی، مصطفٰی البابی الحلبی، قاہرہ ۱۹۳۸ء؛ [(۸) الوافی بالوفیات، ۳: ۷؛] (۹) براکلمان، ۱: ۳۹۸.

(سید محمد یوسف)

* **ابو یَقْظان محمد بن الاَفْلَح**: رَكَ بہ (بنو) رستم.

* **ابو یوسف**: یعقوب بن ابراہیم الانصاری الکوفی، ایک ممتاز فقیہ، جو حنفی [رَكَ بہ حنفیہ] دبستان کے بانیوں میں سے تھے۔ وہ خالص عربی النسل تھے۔ ان کے مورث سعد بن حَبْتَۃ آنحضرت [صلّی اللہ علیہ وسلّم] کے عہد میں نوجوان تھے اور مدینۂ [منوّرہ] میں رہتے تھے (مفصّل شجرۂ نسب کے لیے رَكَ بہ الخطیب البغدادی، ۱۴: ۲۴۳)۔ ابو یوسف کی تاریخِ ولادت، جس کا حساب ان کی تاریخِ وفات سے لگاتے ہیں، محض تخمیناً ۱۱۳ھ/ [۷۳۱ - ۷۳۲ء] بتائی جاتی ہے۔ ایک حکایت کے مطابق، جس کی مختلف روایتیں آپس میں متناقض ہیں ابو یوسف لڑکپن میں نادار تھے۔ ان کی استعداد دیکھ کر ان کے استاد [امام] ابو حنیفہؒ [رَكَ بآن] ان کی مدد کرتے رہے اور انھوں نے تمام توقعات سے بڑھ کر کامیابی حاصل کی۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ ابو یوسف نے فقہ اور حدیث کوفے اور مدینۂ [منوّرہ] میں ابو حنیفہؒ، مالکؒ بن اَنَس اور اللیث بن سعد وغیرہ سے پڑھی (الخطیب البغدادی، ۱۴: ۲۴۲، نے ابو یوسف کے اساتذہ کی خاصی مکمّل اور معتبر فہرست دی ہے)۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ابو یوسف کا اس وقت تک کوفے میں قیام رہا جب تک کہ وہ بغداد میں منصبِ قضا پر مامور نہیں ہوئے۔ اس منصب پر وہ اپنی وفات ([۵ ربیع الاوّل] ۱۸۲ھ/ [۲۱ اپریل] ۷۹۸ء) تک فائز رہے۔ ان کے متعلّق یہ بھی روایت ہے کہ وہ ۱۶۷ھ اور ۱۸۰ھ میں بصرے بھی گئے۔ یہ یقینی طور پر معلوم نہیں ہے کہ انھیں المہدی، الہادی اور ہارون الرشید میں سے کس نے اس منصب پر مقرّر کیا۔ اس قصّے کے بموجب جو التّنوخی (م ۳۸۴ھ) نے اپنے والد سے سنا تھا (نِشْوار المُحاضرة، ص ۱۲۳ ببعد) ابو یوسف نے ایک بار کسی فقہی مسئلے میں کسی رکنِ حکومت کو مطمئن کر دیا تھا، جس نے انھیں فیاضی سے انعام دیا اور بعد میں ایک موقع پر ان کی سفارش خلیفہ ہارون سے کر دی۔ خلیفہ کو بھی جب ابو یوسف نے اطمینان بخش رائے دی تو خلیفہ نے انھیں اپنا تقرّب بخشا اور آخر الامر انھیں قاضی مقرّر کیا۔ اس بیان میں صحت و صواب کا کچھ احتمال ضرور ہے، مگر اسے محض اسی بنا پر معتبر قرار نہیں دیا جا سکتا؛ تاہم یہ مسلّم ہے کہ اپنی حسنِ عملی کی مدد سے انھوں نے جلد ہی ہارون الرشید کے ساتھ دوستانہ تعلّقات قائم کر لیے، بلکہ اس کے لیے ان کا وجود لابدی سا ہو گیا۔ ابو یوسف کی اس کامیابی کو مبالغہ آمیز طور پر پیش کر کے ان کے دوستوں اور ناشناسوں دونوں نے انھیں ایک ایسے بے اصول فقیہ کا نمونہ بنا دیا ہے جو کسی بھی قانونی مشکل سے نکلنے کا اپنے موکّلوں کے اور خود اپنے لیے ایک آسان راستہ پیدا کر لیتا ہے۔ ابو یوسف کی کتاب الحیل کی موجودگی سے اور اس سنجیدہ فقہی مقصد کے بارے میں غلط فہمی سے جو مصنّف کے زیرِ نظر تھا اس غلط تخیّل کو لازماً تقویت پہنچی (قبّ Schacht، در *Isl.*، ۱۹۲۶ء، ص ۲۱۷)۔ اسلام کی تاریخ میں پہلی بار ہارون الرشید نے ابو یوسف کو قاضی القضاۃ کا منصب عطا کیا۔ اس زمانے میں ''قاضی القضاۃ'' محض ایک اعزازی لقب تھا، جو پایۂ تخت کے قاضی کو دیا جاتا تھا، لیکن خلیفہ ابو یوسف سے نہ صرف شرعِ اسلامی کے مطابق داد گستری اور مالیاتی حکمتِ عملی اور اسی نوع کے دیگر مسائل میں مشورہ لیتا تھا بلکہ سلطنت کے دوسرے قاضیوں کے تقرّر کے بارے میں بھی ان کی رائے سے استفادہ کرتا تھا۔

ابو یوسف کے بیٹے یوسف باپ کی زندگی ہی میں قاضی ہو گئے تھے اور بغداد کے مغربی حصّے میں اپنے باپ کے قائم مقام تھے۔ یوسف کا انتقال ۱۹۲ھ میں ہوا۔ ابو یوسف کے سب سے اہم شاگرد [ابو عبداللہ محمد بن الحسن] الشیبانی [م ۱۸۹ھ] [رَكَ بآن] تھے۔

ابو یوسف کا تصنیف و تالیف کا کام یقیناً معتدبہ ہوگا۔ الفہرست میں ان کی

جن تصانیف کے نام درج ہیں ان میں سے ایک کے سوا سب ناپید ہو چکی ہیں۔ یہ باقی ماندہ تصنیف کتاب الخراج ہے، جو مالیات عامّہ، لگان، عدالتِ جنایات اور اسی قسم کے دوسرے مسائل سے متعلّق ہے اور جسے ابو یوسف نے ہارون الرشید کی فرمائش پر لکھا تھا (عربی متن طبع اوّل، بولاق ۱۳۰۲ھ؛ فرانسیسی ترجمہ از فاینان (E. Fagnan)، پیرس ۱۹۲۱ء)۔ تین اور کتابیں بھی، جو بلاشُبہہ انھیں کی ہیں، اگرچہ وہ ابو یوسف کی قدیم فہرستِ مصنّفات میں مذکور نہیں ہیں باقی رہ گئی ہیں، یعنی: (۱) کتاب الآثار، جو ان کوفی احادیث کا مجموعہ ہے جو ابو یوسف سے مروی ہیں (قاہرہ ۱۳۵۵ھ)؛ (۲) کتاب اختلاف ابی حنیفۃ و ابن لیلٰی، جس میں کوفے کے ان دو مسلّم الثبوت اور مستند اماموں کی آرا کا مقابلہ کیا گیا ہے جو عنوان کتاب میں مذکور ہیں (قاہرہ ۱۳۵۷ھ؛ نیز در الشافعی: کتاب الاُمّ، ۷: ۸۷-۱۵۰)؛ (۳) کتاب الردّ علی سِیَر الاَوْزاعی، جس میں جہاد سے متعلّق شامی عالم الاوزاعی کی آرا کو مدلّل طریقے پر اور منظم شرح و بسط کے ساتھ ردّ کیا گیا ہے (قاہرہ غیر مؤرّخ؛ نیز در الشافعی: کتاب الاُمّ، ص ۳۰۳-۳۳۶)۔ الفہرست میں اسی نوع کی کم از کم دو تقابلی اور مناظرانہ کتابوں کے عنوان مذکور ہیں، یعنی کتاب اختلاف الامصار اور کتاب الردّ علی مالک بن انَس۔ آخر میں ابو یوسف کی کتاب الحیل کے کچھ اقتباسات ان کے شاگرد الشّیبانی نے اپنی کتاب المخارج فی الحیل (طبع Schacht، لائپزگ ۱۹۳۰ء) میں شامل کیے ہیں۔ ان کے مناظرانہ رسالوں (مثلاً کتاب الردّ علی سِیَر الاوزاعی، پیرا ۵) میں ابو یوسف کے متعدّد بیانات سے، جو اصول و قواعد سے متعلّق ہیں، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اصولِ فقہ سے دلچسپی تھی (قب الفہرست، ص ۲۰۳، س ۱۷)، لیکن برخلاف اس کے جو کبھی کبھی کہا جاتا ہے، انھوں نے اس موضوع پر کوئی مخصوص تصانیف نہیں چھوڑیں۔

مجموعی طور پر ابو یوسف کا عقیدہ وہی ہے جو ابوحنیفہ[رح] کا تھا، جنھیں وہ اپنا استاد مانتے تھے؛ اس لیے ابو یوسف کے فقہی فکر کو سمجھنے کے لیے وہ نکات زیادہ کارآمد ہیں جن میں انھوں نے ابوحنیفہ[رح] سے اختلاف کیا ہے بہ مقابلہ ان کے جن میں وہ ان سے متفق ہیں۔ ابو یوسف کے اصول اور عقیدے کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے استاد کے مقابلے میں احادیث پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں، اس لیے کہ ان کے زمانے میں صحیح اور معتبر احادیثِ نبوی زیادہ تعداد میں موجود تھیں۔ دوسرے ابو یوسف کے عقیدے میں اکثر ابوحنیفہ[رح] کے قدرے غیر مقیّد اندازِ استدلال کے خلاف ردِّعمل پایا جاتا ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ابو یوسف کی روش ہمیشہ یکساں تھی، بلکہ متعدّد معاملات میں انھوں نے [امام] ابوحنیفہ[رح] سے اختلاف رائے کر کے زیادہ معقول یا زیادہ ارتقاپذیر عقیدے کو ترک کر دیا ہے۔ تیسرے ہمیں ابو یوسف کے فقہی فکر میں استدلال کے بعض مرغوب طریقے بھی نظر آتے ہیں، مثلاً دلیل الخُلف (reductio ad absurdum) [یعنی کسی اصول کے غلط ہونے کا ثبوت اس کے منطقی نتائج کو مہمل اور غلط ثابت کر کے دینا] اور اسی طرح کسی قدر تلخ مناظرے کی عادت۔ آخر میں ابو یوسف کے عقیدے کی ایک قابلِ ذکر صفت یہ بھی ہے کہ وہ اکثر اپنے نظریات بدلتے رہتے تھے اور تبدیل شدہ نظریہ ہمیشہ پہلے کی نسبت بہتر بھی نہ ہوتا تھا۔ رائے کی یہ تبدیلی، معاصر مآخذ کے بیان کے مطابق، کبھی تو بلاواسطہ ہوتی تھی اور کبھی غالباً اس وجہ سے کہ ابو یوسف کو قاضی کی حیثیت سے اپنے تجربے کی بنا پر رائے بدلنا پڑتی تھی۔ ابو یوسف سے اس عمل کا آغاز ہوتا ہے جس کے نتیجے میں کوفے کے فقہاے عراق کے قدیم دبستان کی جگہ ابوحنیفہ[رح] کے متّبعین نے لے لی۔ [وفات کے وقت انھوں نے فرمایا کہ میں نے جو فتوے بھی دیے ہیں انھیں میں بجز ان فتووں کے جو کتاب و سنت کے مطابق ہیں واپس لیتا ہوں۔ شذرات الذهب و الذہبی].

مآخذ: (۱) الفہرست، ص ۲۰۳؛ (۲) الخطیب البغدادی: تأریخ بغداد، ۱۴: ۲۴۲؛ (۳) ابن خلّکان، عدد ۸۳۴ (ترجمہ دیسلان (de Slane)، ۴: ۲۷۲ ببعد)؛ (۴) الیافعی: مرآۃ الجنان، ۱: ۳۸۲ ببعد؛ (۵) ابن کثیر: البدایۃ والنہایۃ، ۱۰: ۱۸۰ ببعد؛ [(۶) الذہبی: تذکرۃُ الحُفّاظ، ۱: ۲۶۷؛ (۷) النُّجُوم الزاہرۃ، ۲: ۱۰۷؛ (۸) الجواہر المُضِیئَۃ، ۲: ۲۲۰؛ (۹) اخبار القضاۃ، ۳: ۲۵۴؛ (۱۰) اعلام العرب فی العلوم والفنون، ۱: ۳۰؛ (۱۱) شذرات الذہب، ۱: ۲۹۸ ببعد؛ (۱۲) الفوائد البہیۃ، طبع اوّل، ص ۲۲۵؛ (۱۳) مفتاح السعادۃ، ۲: ۱۰۰ ببعد؛] (۱۴) احمد امین: ضحَی الاسلام، ۲: ۱۹۸ ببعد؛ (۱۵) محمد زاہد الکوثری: حسن التقاضی، قاہرہ ۱۹۴۸ء؛ (۱۶) کفرالی (K. Kufrali)، در *IA*، ۴: ۵۹ ببعد؛ (۱۷) شاخت (J. Schacht): *The Origins of Muhammadan Jurisprudence*، اوکسفرڈ ۱۹۵۰ء؛ (۱۸) براکلمان (Brockelmann)، ۱: ۱۷۷ و تکملہ، ۱: ۲۸۸؛ [(۱۹) شبلی نعمانی: سیرۃ النعمان، دہلی، ص ۱۵۶ ببعد].

(J. SCHACHT شاخت)

ابو یوسف یعقوب: بن یوسف بن عبدالمؤمن المنصور، بنومؤمن، یعنی * الموحّدون [رک بآں] کے خاندان کا تیسرا فرمانروا، جس نے ۵۸۰-۵۹۵ھ/ ۱۱۸۴-۱۱۹۹ء تک حکومت کی۔ شَنْتَرین کے سامنے ۱۸ ربیع الثانی ۵۸۰ھ/ ۲۹ جولائی ۱۱۸۴ء کو ابو یعقوب یوسف کے فوت ہو جانے پر وہ اپنے باپ کا جنازہ لے کر اشبیلیہ لوٹا اور یہیں یکم جُمادی الاولٰی ۵۸۰ھ/ ۱۰ اگست ۱۱۸۴ء کو اس کی تخت نشینی کا اعلان کیا گیا۔ پھر وہ بہ عجلت مرّاکُش پہنچا اور امیر المؤمنین کا لقب اختیار کر کے اس نے مالی اُمور کی بابت چند سخت فرامین صادر کیے اور رعایا سے قدیم عقائد پر سختی سے قائم رہنے کا مطالبہ کیا۔ کچھ عرصے تک اس نے دربارِ عام میں بذاتِ خود عدل و انصاف کرنے کی کوشش کی اور اپنی سلطنت میں کئی اہم عمارتیں بنوا کر اپنے والہانہ شوقِ تعمیر کو پورا کیا۔ المرابطون کے دارالحَجَر کو، جہاں اس کے باپ اور دادا رہا کرتے تھے، ضرورت سے زیادہ تنگ اور گنجان دیکھ کر اس نے الصّالحہ کی بیرونی بستی [ربض] تعمیر کرائی، تاکہ خود وہاں سکونت اختیار

کرے؛ لیکن یہ کام ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ اطلاع ملی کہ بنو غانیہ [رَکّ بہ ابن غانیہ] کے المرابطون کا لشکر بجایہ (Bougie) میں آن اترا ہے.

جونہیں شُنتَرین کی اچانک مصیبت کی اطلاع مَیُورقہ (Majorca) پہنچی، بنو غانیہ نے الموحّدون کی طرف سے اطاعت کے مطالبات کو ردّ کر دیا اور بجایہ کے حامیانِ بنوحمّاد کی شہ پا کر ایک بحری بیڑا تیار کیا اور ۱۹ صفر ۵۸۱ھ/ ۲۴ مئی ۱۱۸۵ء کو بجایہ پر قبضہ کر لیا۔ بجایہ کی تسخیر سے نظم و نسق میں جو خلل پیدا ہوا اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علی بن غانیہ نے الجزائر، مِلْیانہ، اَشِیْر اور قلعہ بنی حماد کو بھی سر کر لیا۔ ابو یوسف یعقوب نے فی الفور جوابی اقدامات اختیار کیے۔ ایک لشکر نے، جسے سَبْتہَ (Ceuta) کے بحری بیڑے کی امداد بھی حاصل تھی، ۵۸۲ھ/ ۱۱۸۶ء کے موسمِ بہار میں الجزائر، بجایہ اور دیگر مقامات، جو المرابطون کے قبضے میں چلے گئے تھے، از سرِ نو لے لیے اور علی بن غانیہ پر چڑھائی کر دی، جو اس وقت قسنطینہ (Constantine) کا محاصرہ کیے بیٹھا تھا۔ المرابطی قائد محاصرہ چھوڑ کر فی الفور الجرید کی جانب پسپا ہوا۔ وہاں اس نے تُوزَر اور قَفْصَہ (Gafsa) پر قبضہ جما لیا اور طرابلس کے قَراقُوش [رَکّ بآن] کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ اس طرح افریقیہ میں صرف تونس اور المہدیہ ہی الموحّدون کے پاس رہ گئے۔ ان حالات میں ابو یوسف یعقوب نے مشرق کی جانب ایک بڑی مہم لے جانے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ وہ تونس پہنچا اور وہاں سے اس نے ایک زبردست لشکر باغیوں اور ان کے اتحادیوں کے مقابلے کے لیے روانہ کیا، لیکن اس لشکر نے ۱۵ ربیع الثانی ۵۸۳ھ/ ۲۴ جون ۱۱۸۷ء کو قَفْصَہ کے قریب عُمرہ کے میدان میں شکست کھائی۔ الموحّدی خلیفہ نے تین ماہ بعد (۹ شعبان/ ۱۴ اکتوبر) الحَمّی کے مقام پر اس شکست کا بدلہ لیا۔ افریقیہ کا سارا جنوبی حصّہ از سرِ نو الموحّدی سلطنت کے زیرِ نگیں آ گیا، بادشاہ نے مغرب کو مراجعت کی اور تلمسان جا پہنچا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد افریقیہ میں فساد کی آگ دوبارہ بھڑک اٹھی، حالانکہ شکست کے کچھ عرصے بعد علی بن غانیہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ علی کا بھائی یحیٰی بن غانیہ الموحّدون کی سلطنت کے خلاف غیر معمولی مستعدی اور قابلیت کے ساتھ تقریبًا پچاس سال تک جدوجہد جاری رکھنے میں کامیاب ثابت ہوا، جس کی وجہ سے الموحّدون کو سخت تشویش لاحق رہی۔

دوسری جانب اب وقت آ گیا تھا کہ ابو یوسف پرتگیزوں اور اہلِ قشتالیہ کے حملوں کو روکنے کے لیے جزیرہ نمائے آئی بیریا کی طرف متوجّہ ہو، جسے چھوڑے ہوئے اسے پانچ سال ہو چکے تھے۔ اس غرض سے مؤمنی حکمران ابھی تیاریاں ہی کر رہا تھا کہ سینکو (Sancho) اوّل نے صلیبیوں کے مضبوط فوجی دستوں کی مدد سے، جو فلسطین جا رہے تھے، جنوبی ساحل کے مقام شِلْب (Silves) کا محاصرہ کر لیا اور تین ماہ بعد ۲۰ رجب ۵۸۵ھ/ ۳ ستمبر ۱۱۸۹ء کو یہ شہر فتح ہو گیا۔ اسی اثنا میں قشتالیہ کے بادشاہ نے الموحّدون کے مقبوضات پر چڑھائی کر رکھی تھی اور Magacela، Reina، القلقہ وادی آرا (Alcalca de Gadaira) اور (Calasparra) پر حملہ کر دیا تھا۔ ۵۸۶ھ/ ۱۱۹۰ء میں ابو یوسف یعقوب نے جوابی اقدام کیا۔ قشتالیوں اور لیونیوں کو عارضی صلح پر مجبور کیا اور بعد ازاں شُنتَرین کے شمال میں پرتگیزوں کے قلعوں ٹورس نووس (Torres Novas) اور تُومَر (Tomar) پر چڑھائی کی۔ اس کے ساتھ ہی ایک دوسرے لشکر نے شلب کا محاصرہ کر لیا۔ ٹورس نووس کی طاقتِ مزاحمت جواب دے گئی اور اس قلعے نے ہتھیار ڈال دیے؛ لیکن تومر کا قلعہ، جس کی مدافعت عیسائی صلیبی محارب (Templars) کر رہے تھے، مقابلے پر ڈٹا رہا اور اس کی محافظ فوج نے باہر نکل کر شدید حملے کیے۔ سامانِ رسد کی کمی اور ایک وبائے عام کے باعث جو الموَحّدون کے لشکر میں پھوٹ پڑی خلیفہ تومر اور شِلْب دونوں کا محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو گیا.

اگلے سال خلیفہ نے اسی سمت میں ایک اَور دھاوا کیا۔ اس نے دریاے تاجہ (Tagus) کے جنوب میں متعدّد قلعوں، مثلاً قصر ابی دانس (Alcacer do Sol)، پَلْمِلَّہ (Palmella) اور المعدن (Almada) کو بزورِ شمشیر لے کر ۲۵ جُمادَی الاُخرٰی ۵۸۷ھ/ ۱۰ جولائی ۱۱۹۱ء کو شِلْب پر اچانک قبضہ کر لیا.

۵۸۹ھ/ ۱۱۹۳ء میں ابو یوسف یعقوب نے، جو بذاتِ خود رباط کی تعمیرات کے کام کی نگرانی کر رہا تھا، حکم دیا کہ اشبیلیہ کے قریب الشَّرَف (Ajarafe) کے سب سے بلند اور تنگ مقام پر حصن الفَرَج (Aznalfarache) کا قلعہ تعمیر کیا جائے۔ بعد ازاں اس قلعے کی مدح میں شعرا بہت سی نظمیں لکھتے رہے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد اسے عیسائی ہسپانیہ کے خلاف ایک نئی مہمّ کا انتظام کرنا پڑا، کیونکہ اس عارضی صلح نامے کی میعاد ختم ہو چکی تھی جس پر ۱۱۹۰ء میں دستخط ہوئے تھے اور الفانسو ہشتم نے اشبیلیہ کے علاقے پر بڑی بیبا کی سے حملہ کر دیا تھا۔ ابو یوسف کو پھر آبنائے عبور کر کے اشبیلیہ جانا پڑا، جہاں پہنچتے ہی اس نے الفانسو ہشتم کی افواج کا مقابلہ کرنے کے لیے مورا دل (Muradal) کی تنگ گھاٹی (col) کا رخ کیا۔ ۸ شعبان ۵۹۱ھ/ ۱۸ جولائی ۱۱۹۵ء کو الاَرَک [رَکّ بآن] (Alarcos) کی مشہور جنگ لڑی گئی، جس میں قشتالیوں نے شکست فاش کھائی۔ الموحّدون نے قلعۂ رِباح (Campo de Calatrava) کے پانچ مستحکم مقامات پر قبضہ کر لیا۔ اشبیلیہ میں واپس آ کر ابو یوسف نے اس فتح کی یادگار کے طور پر المنصور باللہ کا اعزازی لقب اختیار کیا.

اگلے سال کے موسمِ بہار میں یعقوب المنصور نے اپنی کامیابی سے مزید فائدہ اٹھانے کے شوق میں مَنْتانْجس (Maontanchez)، ترجالہ (Trujillo) اور شَنْت قروش (Santa Cruz) کے شہروں پر قبضہ کر لیا اور دریاے تاجہ کی وادی میں طَلَبیرہ (Talavera) کا علاقہ تاراج کیا۔ وہ مَرْج طلیطلہ (vega of Toledo) تک بڑھتا چلا گیا اور اس خطّے کے تاکستان اور باغیچے اُجاڑ دیے۔ اگلے سال ایک اور ناکام یلغار میں وہ مجریط (Madrid) (جس کی مدافعت اس وقت ڈیگو لوپز دی ہارُو (Diego Lopez de Haro) کر رہا تھا) القلعۃ النہر (Alcalá de Henares) اور وادی الحجارہ (Guadaljara) تک پہنچ گیا.

جب وہ مراکش لوٹا تو اپنی علالت سے عاجز آ کر اس نے اپنے بیٹے محمد کو اپنا ولی عہد مقرّر کیا اور خود سلطنت کے کاموں سے سبکدوشی اختیار کر لی تاکہ اپنا وقت عبادت و ریاضت اور کارہاے خیر، مثلاً ایک شاندار ''بیمارستان'' کی تاسیس اور خیرات و صدقات کی تقسیم، میں صرف کرے۔ اس نے یہودیوں کو ایک خاص نشان پہننے پر مجبور کیا تاکہ وہ مسلمانوں سے الگ شناخت ہو سکیں۔ اپنی عمر کے آخری ایّام میں وہ اس بات پر بہت ندامت محسوس کرتا تھا کہ اس نے اپنے بعض بہت ہی قریبی رشتے داروں کے قتل کا حکم دیا تھا۔ اس نے الموحّدون کے شیوخ اور اپنے خاندان کے افراد کو اپنے الصّالحہ کے محل میں جمع کر کے وصیتیں کیں۔ بظاہر اس کی تاریخ وفات یقین کے ساتھ ۲۲ ربیع الاوّل ۵۹۵ھ/۲۳ جنوری ۱۱۹۹ء متعیّن کی جا سکتی ہے۔

یعقوب المنصور کا عہدِ حکومت الموحّدون کی سلطنت کے منتہاے عروج کا زمانہ ہے۔ اس کے کردار کی مستعدی، وہ احتیاط اور سختی جو وہ اپنی مملکت کے انتظام میں ملحوظ رکھتا تھا اور اس کی ذاتی جرأت نے اسے اس قابل بنا دیا کہ اپنے تمام دشمنوں کو افریقیہ میں بھی اور ہسپانیہ میں بھی شکست دے، اپنی افواج کے حوصلے بلند کرے اور آنے والی نسلوں میں اپنی ایسی یاد چھوڑ جائے جسے کہانیوں اور افسانوں کا ایک سنہری ہالہ گھیرے ہوے ہے۔ اس کی الصّالحہ کی شاہی بستی میں تعمیر کردہ شاندار عمارات، مرّاکش کی جامع الکُتُبیّین مع اپنے نفیس مینار کے، اشبیلیہ کا جیرالدہ (Giralda) اور رباط کی جامع حسّان کی ہیئتِ مجموعی — ان سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے دادا اور باپ نے یادگار عمارتیں تعمیر کرانے کا جو کارِ عظیم شروع کیا تھا اس نے اُسے شاندار طریق سے جاری رکھا۔ اس کی دولت و ثروت، اس کے دربار کی شان و شوکت، اس کا علما کی صحبت میں رہنے کا شوق، جہاد کے معرکوں میں اس کی کامیابیاں، ان سب باتوں نے اس کے مدّاحین کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے اور انھیں زوال و انحطاط کے وہ جراثیم نظر نہیں آتے جو اس درخشاں رُوکار کے پیچھے پوشیدہ تھے۔ الاَنْدَلُس میں پرتگیزوں اور قشتالیوں کے مقابلے میں اپنی شاندار کامیابیوں کے باوجود وہ عیسائیوں کی پیش قدمی کو نہ روک سکا۔ افریقیہ میں اگرچہ عربوں اور اہلِ میورقہ کی بغاوت نے، جو دب تو ضرور گئی تھی لیکن مری نہ تھی، سلطنت کے پہلو میں ایسا گہرا گھاؤ پیدا کر دیا جس نے اس کی ساری طاقت و قوّت کو بہت جلد سلب کر دیا۔ جب الموحّدون کی سلطنت کے جہاز کا ناخدا یعقوب المنصور ایسا ہوشیار اور قوی شخص نہ رہا تو ناگزیر تھا کہ اس کے جانشینوں کے عہد میں، جو اکثر بچّے اور نوعمر تھے اور بیشتر وقت قابلیت کے فقدان کا ثبوت دیتے رہے، یہ جہاز چٹانوں سے ٹکرا کر غرق ہو جائے۔

مآخذ: (۱) *Trente-sept letters officielles almohades*، طبع E. Lévi-Provençal، ص ۲۷ بعد؛ (۲) وہی مصنّف: *Un recueil de lettres officielle almohades*، اشاریہ؛ (۳) ابن العِذاری: البیان المُغْرِب، ج ۴، ترجمہ از Huici، تطوان ۱۹۵۳ء، ص ۸۵ بعد؛ (۴) المرّاکشی: مُعْجِب (طبع Dozy)، ص ۱۸۹ بعد؛ (۵) ابن خَلْدُون: عِبَر، ۱: ۱۸۹ بعد؛ (۶) ابن ابی زَرْع: روض القرطاس، مطبوعۂ فاس، ص ۱۳۷؛ (۷) ابن الأثیر، ۱۲: ۴۷، ۷۵؛ (۸) ابن خِلّکان، شمارہ ۸۰۰؛ (۹) ابن عبدالمنعم الحِمْیارِی: الروض المعطار (طبع Lévi-Provençal)، ص ۱۸؛ (۱۰) زَرْکَشی: تأریخ الدولتَین، ترجمہ از فاینان (Fagnan)، ص ۱۷؛ (۱۱) المَقَّرِی: نفح الطیب، ۲: ۲۸۹، ۲۹۰؛ (۱۲) *Primera Crónica General* (طبع R. Menéndez Pidal)، ۱: ۶۷۸؛ (۱۳) *Chronique des rois de Castille* (طبع Cirot)، ص ۴۱، ضمیمہ ص xi؛ (۱۴) A. Bel: *Les Benou Ghaniya*، ص ۳۸ بعد؛ (۱۵) da Silva Tarouca: *Cronicas dos sete reis de Portugal*، ۱: ۱۵۱؛ (۱۶) سعد زاغلول عبدالحمید: یعقوب المنصور، غیر مطبوعہ مقالہ، پیرس ۱۹۵۲ء۔

(A. HUICI MIRANDA مرانڈا)

✱ **الاَبْواء:** ایک مقام، جو مکۂ [معظّمہ] سے مدینۂ [منوّرہ] کو جانے والی شاہراہ پر الجُحفہ سے ۲۳ میل دور، قبیلۂ کنانہ کی شاخ بنوضَمْرہ کے علاقے میں واقع ہے۔ بعض اسناد کے مطابق دراصل یہ ایک پہاڑ کا نام تھا، جو اس مقام پر واقع ہے۔ عام روایت یہ ہے کہ [حضرت] رسول [اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم] کی والدۂ ماجدہ [حضرت] آمنہ نے مدینۂ [منوّرہ] سے مکۂ [معظّمہ] کی طرف سفر کرتے ہوے اسی جگہ وفات پائی تھی اور وہیں مدفون ہیں؛ لیکن بعض روایات میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ مکۂ [معظّمہ] میں دفن ہوئیں (الطبری: ۱: ۹۸۰)۔ مدینۂ [منوّرہ] سے پہلی مہم، جس میں رسول [اکرم صلی اللہ علیہ وسلم] خود شریک ہوے، الاَبْواء اور اس کے قریب کے مقام وَدّان کی طرف روانہ ہوئی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب ۳ھ/۶۲۵ء میں اہلِ مکّہ نے مدینۂ [منوّرہ] پر چڑھائی کی اور وہ الابواء کے مقام پر پہنچے تو ان میں سے بعض [کفار] نے یہ تجویز کی کہ [حضرت] آمنہ کی لاش کھود کر نکال لی جائے، لیکن اکثریت نے اس تجویز کی مخالفت کی۔

مآخذ: (۱) ابن ہشام، ص ۱۰۷-۴۱۵؛ (۲) ابن سعد، ۱/۱: ۷۳-۷۴ و ۲/۱: ۳؛ (۳) الطبری، ص ۱۲۶۶-۱۲۷۰؛ (۴) واقدی، طبع وِلہاؤزن (Wellhausen)، ص ۱۰۳؛ (۵) یاقوت، ۱: ۱۰۰؛ (۶) Caetani: *Annali*، ۱: ۱۵۷، ۴۶۱؛ (۷) A. Sprenger: *Die alte Geographie Arabiens*، ص ۱۵۵ (قب Burckhardt: *Travels in Arabia*، ۲: ۱۱۲ بعد)۔

(W. MONTGOMERY WATT واٹ)

✱ **اَبْواب:** رٓکّ بہ دربند۔

✱ **اَبْہَر:** (حدود العالم میں اَوْہَر)، ایک چھوٹا سا قصبہ، جس کی اہمیت محض اس وجہ سے ہے کہ وہ قَزْوِین (بمسافت ۸۶ کیلومیٹر) اور زَنْجان (بمسافت ۸۸ کیلومیٹر) کے درمیان نصف راہ پر واقع ہے اور یہاں سے ایک سڑک جنوب کی طرف دِینَوَر کو جاتی تھی۔ اس مقام کو ۲۴ھ/۶۴۵ء میں والیِ رَے بَراء بن

عازِب نے فتح کیا تھا۔ ۳۸۶ھ/۹۹۶ء اور ۴۰۹ھ/[۱۰۱۸-۱۰۱۹ء] کے درمیان یہ قصبہ (بنو) مسافر [رکّ بآن] کے ایک امیر کی جاگیر میں رہا۔ اَبْہَر کے شمال مغرب میں کوئی ۲۵ کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک درے کے قریب، جہاں سے تاروم (Tārom) [رکّ بآن] کو جاتے ہیں، سَرْجہان (راحة الصدور میں سرجاہان) کا قلعہ واقع ہے، جسے سلجوقیوں کے عہد حکومت میں بہت اہمیت حاصل رہی۔

مآخذ: (۱) لی سٹرینج (Le Strange)، ص ۲۲۱؛ (۲) Schwarz: *Iran*، ص ۷۲۶-۷۲۸؛ (۳) مِنُورسکی (Minorsky): *Studies in Caucasian History*، ۱۹۵۲ء، ص ۱۶۵.

(V. MINORSKY)

---

* **الاَبْہَرِی:** اثیرالدین مُفَضَّل بن عمرالاَبْہَری، ایک حنفی ادیب، جس کی زندگی کے حالات کچھ معلوم نہیں؛ وفات ۶۶۳ھ/۱۲۶۴ء؛ ابن العبری (Barhebraeus) کے قول کے مطابق ۱۲۶۲ء [اور بقول حاجی خلیفہ ۶۶۰ھ]۔ وہ فلسفۂ درسی کی دو کتابوں کا مصنّف ہے، جو بہت مستعمل رہی ہیں اور جن کی شرحیں بار بار لکھی گئی ہیں: (۱) ہدایة الحکمة، تین حصّوں میں: (ا) المنطق؛ (ب) الطبیعیات؛ (ج) الالٰہیات۔ اس کی بہترین شرح وہ ہے جو میر حسین المَیْبُدِی نے ۸۸۰ھ/۱۴۷۵ء میں لکھی تھی [مطبوعۂ ہند ۱۲۸۸ھ]؛ (۲) الایساغوجی [=الکلیات الخمس]، یہ کتاب Porphyry (قبّ فورفیریوس) کی *Isagoge* سے مقتبس ہے؛ [طبع اوّل مع لاطینی ترجمہ، روم ۱۶۲۵ء؛ ہند ۱۲۶۸ھ؛ مصر (چاپ سنگی) ۱۲۸۳ھ].

اس کی شرحوں میں سے ایک شرح، جو شمس الدین احمد الفَناری (م ۸۳۴ھ/۱۴۷۰ء [کذا، ۱۴۳۰-۱۴۳۱ء]) نے لکھی تھی، استانبول میں چھپ چکی ہے۔ [ایک شرح قال اقول کے نام سے خود مؤلف نے لکھی تھی، کان پور ۱۲۹۳ھ؛ لکھنؤ ۱۸۴۰ء].

مآخذ: (۱) براکلمان (Brockelmann)، ۱: ۶۰۸ و تکملہ، ۱: ۸۳۹ بعد؛ (۲) C. F. Seybold: *Isl*، ص ۱۱۲ بعد.

(براکلمان BROCKELMANN)

---

* **اَبْہٰی:** مملکت عربیۂ سعودیہ کے صوبۂ عَسِیر [رکّ بآن] کا دارالحکومت، جو وادی اَبْہٰی میں تقریباً ۱۸°-۱۳' عرض بلد شمالی اور ۴۲°-۳۰' طول بلد مشرقی) تخمیناً ۲۲۰۰ میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ اس کے متعدّد دیہات میں، جو اب ایک دوسرے سے ملحق ہو گئے ہیں لیکن جن کے امتیازی نام باقی ہیں، شاید دس ہزار نفوس آباد ہیں، جو سب کے سب شافعی مذہب کے پیرو ہیں۔ ان میں سے ایک بڑے گاؤں کا نام مَناظِر ہے، جسے بعض اوقات اس جگہ کا قدیم نام بتایا جاتا ہے۔ الہَمدانی (۱: ۱۱۸) نے مَناظِر کا ذکر نہیں کیا، لیکن اَبْہٰی کو وہ قبیلۂ عَسِیر کا مستقر بتاتا ہے۔ بنی مُغَیْد، جن کا موجودہ اَبْہٰی میں غلبہ ہے، قبیلۂ عسیر ہی سے تعلّق رکھتے ہیں۔

دوسری بستیاں حسب ذیل ہیں: اَلْقَرَی، غالبًا سب سے بڑی؛ مُقابِل، جسے وادی اَبْہٰی پر بنا ہوا ایک پتھر کا پل بڑے مجموعے سے ملاتا ہے؛ نُعْمان اور الرُّبُوع؛ النَّصَب، جہاں بڑی مسجد واقع ہے؛ الخُشَع اور المِفتاحہ۔ شہری زندگی کا مرکز ایک بڑا کشادہ چوک ہے، جہاں منگل کے دن بازار لگتا ہے اور اس کے قریب ہی شَدَی کا سنگین قلعہ ہے، جو صوبائی نظم و نسق کا مرکز ہے۔ اکثر مکانوں کی دیواریں مٹی کی ہیں، جن میں ایک سے زائد چپٹے پتھر کے چھجّے لگا دیے گئے ہیں، تاکہ دیواروں کو پانی کی کاٹ سے بچایا جا سکے۔ تقریبًا ۳۰ سینٹی میٹر کی سالانہ بارش اور اس کے علاوہ متعدّد کنووں کے پانی سے آبپاشی اس علاقے میں غلّے، پھل اور سبزی کی پیداوار کو مدد دیتی ہے، جن کی کاشت طبق برطبق کھیتوں میں کی جاتی ہے۔ شہر کے گرد جو اونچے مقامات ہیں ان پر ترکوں کے زمانے کے قلعے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے دو قلعوں کی مرمّت کی گئی ہے اور انھیں سعودی فوج استعمال کرتی ہے، یعنی ذِرَہ، جو شہر سے جنوب مَشرق کی طرف ۱۲۵ میٹر کی بلندی پر واقع ہے اور شُمَسان، جو شمال کی جانب واقع ہے۔ موٹر کے راستے اَبْہٰی کو بجانب شمال براہِ بیشہ مکّے سے، ۸۴۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر اور جانب جنوب و جنوب مشرق ظُہران اور نَجْران سے ملاتے ہیں۔ بحیرۂ قلزم کی بندرگاہوں القُنْفُذہ اور جیزان تک سیدھے نیچے کو اُترتے ہوئے راستے پر حمل و نقل کے لیے صرف جانور استعمال ہوتے ہیں۔

اَبْہٰی کے تاریخی حالات اس وقت تک کے بہت کم معلوم ہیں جب تک کہ وہابی مذہب پہاڑوں کو عبور کر کے ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں اس مقام تک نہ پہنچا۔ اس کے بعد [وہابیوں کے خلاف] جو ترکی۔مصری لشکر کشی ہوئی اس کے سلسلے میں ایک فوج مناظر پہنچی، جس میں کچھ یورپی بھی شامل تھے اور اس فوج نے مَناظِر پر ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء میں ایک ماہ کے لیے قبضہ جمائے رکھا۔ (Tamisier قریب کے ایک گاؤں "اَفَہ" کا ذکر کرتا ہے)۔ اس کے بعد بنی مُغَیْد کے شیوخ کا قبیلہ العائض اَبْہٰی سے حکمرانی کرنے لگا، جسے کچھ عرصے بعد فَیْصَل بن تُرْکی کے زیر قیادت سرکش وہابیوں کی تائید حاصل ہو گئی۔ ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۱ء میں جب ترک یمن پر دوبارہ تسلط قائم کرنے میں مصروف تھے تو محمد بن عائض نے میدانی علاقے میں ان پر حملہ کیا، لیکن جلد ہی ترک اس پر غالب آ گئے؛ انھوں نے اَبْہٰی پر قبضہ جما لیا اور اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد یہ شہر ولایتِ یمن کی ایک قضا کا مرکز بن گیا اور ۱۹۱۸ء کے متارکۂ جنگ کے وقت تک ترکی کے قبضے میں رہا، سوائے چند ماہ کی مدت کے، جس کے دوران میں صَبْیا کے ادریسیہ [رکّ بآن] نے اس شہر کو ترکی حاکم سلیمان شَفِیق کے ہاتھ سے چھین لیا تھا؛ چنانچہ مکّے کے شریف حسین کی سرکردگی میں جُمادَی الاُخْرٰی ۱۳۲۹ھ/جون ۱۹۱۱ء میں ایک کمکی فوج یہاں آئی تو اس نے اَبْہٰی پر سلیمان کو قابض پایا۔

ترکوں کے رخصت ہو جانے پر العائض قبیلے کے لوگ پھر اس شہر کے بلاشرکت حکمران بن گئے، لیکن انھیں فوراً ہی پہلے محمد الادریسی نے اور بعد ازاں سعودیوں نے للکارا۔ آلِ سعود کی دو مہموں نے (پہلی ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۱ء میں اور دوسری ۱۳۴۰-۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۲ء میں، جو فیصل بن عبدالعزیز کے زیرِ قیادت بھیجی گئی) العائض خاندان کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ اَبْہی اس وقت سے ایک سعودی والی کا صدر مقام چلا آ رہا ہے اور اس کی اہمیت ۱۳۴۵ھ/ ۱۹۲۶ء میں سعودیوں کے ادریسی علاقے پر قبضہ کر لینے کی وجہ سے اَور بھی بڑھ گئی ہے، چنانچہ ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۴ء [کذا، ۱۹۳۶ء] کی جنگِ یمن میں جو فوج سعود بن عبدالعزیز کے زیرِ قیادت تھی اس کا مرکز ابہی ہی تھا۔ دو سال بعد فِلبی (Philby) نے اس مقام کو دیکھا تو اس وقت بھی وہ سابقہ بدامنی کی تاراجیوں کا نقصان بھگت رہا تھا، لیکن پُرامن حکومت کے زیرِ سایہ اس کی خوشحالی عود کر رہی ہے۔ [اس نام کی زیادہ متعارف شکل اَبہا ہے]۔

مآخذ: (۱) رکّ بہ عَسِیر.

(H.C. MUELLER)

----

* **اَبِیب:** رکّ بہ تاریخ.

----

* **ابی سینیا:** Abyssinia، رکّ بہ الحبش.

----

* **اَبِیشے:** رکّ بہ اَبْشُر.

----

* **اَبْیَن:** یا اِبْیَن، قبّ یاقوت: ۱: ۱۱۰، نشوان، ۱: ۲۰۸، C. Landberg: *Études*، ج ۲، ۱۸۰۳ء).

(۱) یمن کی وادی بَنَاء کا ایک ضلع (مخلاف)، جس میں متعدّد قلعے اور عدن [رکّ بآن] کی بندرگاہ واقع ہے؛ اس لیے اس کا پورا نام عدن اَبْیَن ہے.

(۲) ساحلِ سمندر پر عدن کے شمال مشرق میں کوئی ۱۸ کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا مقام، جو اب ویران و غیر آباد ہے، شاعر ابوبکر ابن الادیب العِیدی (م ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء) کی جاے پیدائش.

(۳) بعض اشخاص کا نام، جو انساب کی روایات میں پایا جاتا ہے: (الف) اَبْیَن بن زُہَیر بن الغوثہ ابن اَیْمَن بن الہمیسع؛ (ب) (ذو) اَبْیَن (اِبْیَن) بن یَقْدُم بن الصَّوّار بن عبد شمس؛ (ج) اَبْیَن بن عدنان اور (اس کا بھائی عَدَن)، الطبری، ۱: ۱۱۱۱: اسماء، جو (۱) اور (۲) کی طرف منسوب ہیں۔ کتابیاتی مواد کے لیے قبّ C. Ryckmans: *Les noms propres sud-sémitiques*، ۱: ۳۶ب، ۱۵۱الف، ۳۲۵الف.

مآخذ: (۱) الہمدانی: صِفَۃ، ترجمہ از Forrer، ص ۴۲، حاشیہ ۴ (متعدّد حوالوں کے ساتھ)؛ (۲) عَبْدَلی: ہَدِیَّۃ الزَّمَن فی اخبار ملوک لَحْج و عَدَن، ۱۳۵۱ھ، ص ۱۹ ببعد؛ (۳) ابومخرمہ: تاریخ ثَغر عدن، ۱: ۴ و مواضع کثیرہ.

(O. LÖFGREN)

----

* **ابی وَرْد:** یا باوَرْد، کوہستان خراسان کی شمالی ڈھلانوں پر واقع ایک شہر اور ضلع کا نام، جو اب خود مختار حکومت جمہوریۂ ترکمان میں شامل ہے۔ یہ جمہوریۂ شورائیۂ روس کا ایک حصّہ ہے۔ پورا نخلستانی علاقہ، جس میں نَسَا [رکّ بآن]، ابی وَرْد وغیرہ شامل ہیں اور جو آتاک، یعنی دامن کوہ، کے ترکی نام سے معروف ہے، ازمنۂ گزشتہ کی تاریخ میں نمایاں حصّہ لیتا رہا، کیونکہ صحرائی حملہ آوروں کے مقابلے میں خراسان کا پہلا خطِّ دفاع یہی تھا.

اشکانیوں کے عہد میں یہ علاقہ اس حکمران خاندان کے بزرگوں کے وطن میں شمار ہوتا تھا۔ مؤرخ ایسیڈور چَرَکسی (Isidore of Charax) (سنِ عیسوی کے آغاز میں) اپنی تاریخ کے حصّۂ ۱۳ میں شہر Παρθυηνή (بشمولیتِ نَسَا) اور شہر Μαργιανή (=مَرْو) کے درمیان ایک ضلع Απαυαρτιχή، اور اس کے شہر Απαυαρτιχή، کا ذکر کرتا ہے، قبّ pliny، ۶: ۴۶، مادّہ Apaortene و قبّ Justin، ۴۱: ۵، مادہ mons(Z)apaortenon، دَرَہ (=کلات؟) کے ناقابلِ گزر شہر کے ساتھ، جسے اَرْسَک (اشکان) نے تعمیر کرایا تھا.

ساسانیوں کے عہد میں یہ ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا رہا۔ ابن خُرَّدَاذبہ، ص ۳۹، نے یہاں کے بادشاہوں کے نام محفوظ کر دیے ہیں: شاہ سَرَخْس: زادویہ، شاہ نَسا: اَبْراز (؟) اور شاہ اَبِیْوَرد: "ب ہم نہ" (بہمیہ، بہمنہ)۔ یہ نام غالبًا (اَبِیْوَرد کے مشرق میں، خاوران کے ضلع میں) مَہْنَہ یا مَیْہَنہ کے نام سے تعلّق رکھتا ہے.

[ابی وَرْد مسلمانوں کے قبضے میں سب پہلے عبداللہ بن عامر بن کُرَیْز کے ذریعے ۳۱ھ میں آیا، بلکہ ایک روایت یہ ہے کہ مسلمان اس سے بھی پہلے احنف بن قیس کے تحت اسے فتح کر چکے تھے].

مامون الرشید کے عہد میں عبداللہ بن طاہر نے ابی ورد کے مغرب میں چھے فرسخ کے فاصلے پر کُوفَن کی رباط تعمیر کرائی.

غالبًا غُز [رکّ بآن] ترکوں کی یہاں بڑی نقل مکانی سے پہلے ہی اس ضلع پر خَلَج ترک قابض ہو گئے تھے، قبّ جہان نما، مؤلفہ محمد بن نجیب بَکْران (جو ۱۲۰۰ھ میں لکھی گئی)۔ دوسرے ترکمان قبیلے خلج ترکوں کے بعد اس ضلع میں آباد ہوے.

بارھویں صدی عیسوی سے لے کر چودھویں صدی عیسوی تک ابی ورد مغل نسل کے جُون غُربانی امرا کے ہاتھ میں رہا (قبّ طُوس)۔ شاہ عباس اوّل کے عہد میں آتاک کا علاقہ ایرانیوں کے حلقۂ اثر سے باہر تھا۔ نادر شاہ کے عہد میں، جو اسی علاقے کا باشندہ تھا، آتاک اس کی یادگار زندگی کا نقطۂ آغاز بنا۔ ان دنوں دریاے تجَن (ہری رود) ابی ورد کی مزروعہ اراضی کی مشرقی حد سمجھا جاتا تھا ("منتہاے

معمورۂ سرحدات ابیوردات''، قب تاریخ نادری، تحت سن ۱۱۴۲ھ [یہی ماخذ ابی ورد؟ کے توابع میں ینگی قلعہ، قلعہ بُغْوادا، زاغ چِنْد (؟) وغیرہ کا ذکر کرتا ہے]۔ اس منظر سے نادر کے غائب ہوجانے کے بعد کلات [؟] کے نیم آزاد خوانین کا ۱۸۸۵ء تک اس ضلع میں کسی قدر اثر باقی رہا۔ اس سال روسی ایرانی سرحدوں کے معیّن ہوجانے پر آتاک کا علاقہ اپنی ترکمان آبادی کے ساتھ روسی مملکت میں شامل کرلیا گیا۔ اس کے نتیجے میں شمالی خراسان میں امن وتحفظ قائم ہوجانے سے ایرانی اس قابل ہوگئے کہ اُن دریاؤں کی بالائی گزرگاہوں میں جو آتاک کی طرف بہتے ہیں زراعت کو ترقی دیں، لیکن اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ خود آتاک میں آبپاشی کو خاصا نقصان پہنچا۔

آثارِ قدیمہ: پرانے شہر (کہنہ ابی ورد) کے کھنڈر ماوراے خزر (Trans-Caspian) ریلوے کے سٹیشن کَہکہ (قَہقَہَہ) کے مغرب میں پانچ میل کے فاصلے پر پائے جاتے ہیں اور ۱۴۰۰۰ مربع گز کے رقبے میں پھیلے ہوے ہیں۔ بیچ کے ٹیلے (تلّ) کا ارتفاع ساٹھ فٹ اور محیط سات سوفٹ ہے۔ کہنہ ابی ورد کے شمال مشرق میں کوئی دو میل کے فاصلے پر نماز گاہ کی چھوٹی پہاڑی ہے اور اس کے شمال میں پرانے وقتوں کے کسی شہر کا محلّ وقوع ہے، جس پر ایک ۴۵ فٹ اونچا ''پیش طاق'' (صدر دروازہ) ایستادہ ہے۔ ایک اَور اہم مقام کہنہ قَہقَہَہ ہے، یعنی وہ قلعہ جو تیمور نے ۷۸۴ھ/ ۱۳۸۲ء میں دوبارہ تعمیر کرایا تھا (ظفر نامہ، ۱: ۳۴۳)۔ اس سارے علاقے میں ٹیلے (قُرغان) کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ قہقہہ سے چودہ میل جانب جنوب میں خیوا آباد کے کھنڈر ملتے ہیں، جہاں نادر نے ان اسیرانِ جنگ کو آباد کیا تھا جنھیں خیوا کی فتح کے بعد اس نے آزاد کردیا تھا۔ اُرتِیک کے ریلوے سٹیشن سے گیارہ میل جنوب مشرق میں ایک بستی چُغُندُر نامی کے کھنڈر ہیں (جس کا نام ایک بزرگ کے مزار کے نام پر رکھا گیا تھا اور جو تیرھویں صدی عیسوی میں بنا تھا)۔

ان میں سے بعض آثار ضرور اشکانی حکمرانوں کے عہد تک جاتے ہیں (مثلاً اِیسِیدُور چَرکسی پیاو (Payau) نام کے ایک شہر کا ذکر کرتا ہے)، بلکہ بعض آثار زمانۂ قبل از تاریخ کے بھی ہیں، قب پمپلی (R. Pumpelly): *Explorations in Turkestan*، واشنگٹن ۱۹۰۵ء، اناوَ (Anau) کی کھدائیاں۔

مآخذ: (۱) Tomaschek: *Zur hist. Topographie von Persien*، ج ۱، در *SBAK Wien*، جلد ۱۰۲؛ (۲) وہی مصنّف، در Pauly-Wissowa، بذیل مادّہ *Apauarktike* و *Dara*؛ (۳) E. Quatremère: *Hist. des Mongols de la Perse*، ۱: ۱۸۲ اور حاشیہ ۴۸؛ (۴) Th. Nöldeke، در *ZDMG*، ۳۴: ۱۴۷؛ (۵) J. Marquart: وہی مجلہ، ۴۹: ۶۲۸ و ۴۸: ۴۰۳، ۴۰۷؛ (۶) A. W. Komarow، در *Peterm. Mitt.*، ۱۸۸۹ء، ۷: ۱۵۸-۱۶۳؛ (۷) بارتولڈ (Barthold): *Istoriko-geogr. očerk Irana*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۳ء، ص ۶۰-۶۲، ۷۰؛ (۸) وہی مصنّف: *Turkestan*، اشاریہ؛ (۹) وہی مصنّف: *K. istorii orosheniya Turkestana*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۴ء، ص ۴۱-۴۳؛ (۱۰) لی سٹرینج (Le Strange)، ص ۳۹۴؛ (۱۱) A. A. Semenow و دیگران: *Drevnosti Abiverdskago rayona* (''علاقۂ ابی ورد کے آثارِ قدیمہ'')، در *Acta Universitatis Asiae Mediae*، سلسلہ ۲، Orientalia، کرّاسہ ۳، تاشقند ۱۹۳۱ء (۱۹۲۸ء کی مہم)؛ [(۱۲) یاقوت: معجم البلدان، طبع اوّل، ۱۹۰۶ء، ۱: ۱۰۲]۔

(V. Minorsky مِنُورسکی)

✱ **الاَبِیْوَرْدی:** ابوالمظفر محمد بن [ابی العباس] احمد [العَبْشمی المعاوی]، عرب شاعر اور نسّاب، عَنْبَسَہ بن ابی سفیان (معاویۂ اصغر کی اموی شاخ سے) کی اولاد میں سے تھا۔ وہ خراسان کے شہر ابیورد، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ ابیورد کے قریب ایک گاؤں کُوفَن (کوفن نہیں) میں پیدا ہوا (اسی لیے اسے بعض اوقات الکُوفَنی بھی کہتے ہیں) اور اصفہان میں ۵۰۷ھ/ ۱۱۱۳ء میں (نہ کہ ۵۵۷ھ/ ۱۱۶۱-۱۱۶۲ء میں [جیسا کہ غلطی سے ابن خلّکان کی طبع بولاق وطبع المیمنیہ میں ہے]) زہر سے فوت ہوا۔ علم لسان اور تاریخ وانساب سے متعلّق اس کی تصانیف، خصوصًا ایک تاریخ ابیورد اور دوسری قبائل عرب کے یکساں اور مختلف ناموں پر، گم ہوچکی ہیں، لیکن [القیسرانی] نے آخر الذکر کتاب سے بکثرت کام لیا ہے۔ الابیوردی کے دیوان میں سے تین اہم ترین حصّے، یعنی ''النجدیات''، ''العراقیات'' (جس میں زیادہ تر نظمیں خلیفہ المُقتدِی، خلیفہ المُستظہر اور ان کے وزیروں سے متعلّق ہیں) اور ''الوجدیات''، چند مخطوطوں میں موجود ہیں۔ ایک دیوان ردیف کی ترتیب کے ساتھ ۱۳۱۷ھ میں لبنان میں شائع ہوا تھا، لیکن اس میں غلطی سے الغُزّی کی بہت سی نظمیں بھی شامل کردی گئیں [نیز بیروت ۱۳۲۷ھ، حجم ۳۸۲ صفحات]۔ کم اہمیت کی نظموں کا ایک انتخاب مقطعات الابیوردی کے نام سے ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰-۱۸۶۱ء میں قاہرہ میں چھپا [چاپ سنگی، حجم ۴۴ صفحات]۔

مآخذ: (۱) یاقوت، ۱: ۱۱۱؛ (۲) وہی مصنّف: ارشاد، ۶: ۳۴۲-۳۵۸؛ (۳) السُّبکی: طبقات، ۴: ۶۲؛ (۴) السیوطی: بُغیۃ، ص ۱۶؛ (۵) ابن خلکان، شمارہ ۶۴۲؛ (۶) ابو الفداء: مختصر، ۲: ۳۸۰؛ (۷) ابن الجوزی: منتظم، ۹: ۱۷۶-۱۷۷؛ (۸) القِفطی: اخبار المحمدین من الشعراء، مخطوطۂ پیرس، ورق ۱۰ب تا ۱۲الف؛ (۹) براکلمان (Brockelmann)، ۱: ۲۵۳ و تکملہ، ۱: ۴۴۷؛ (۱۰) شاعر اور اس کے کلام پر تنقیدی نظر از علی الطاہر، بعنوان *La Poésie arabe sous les seldj-oukides* (مقالہ Sorbonne، ۱۹۵۳ء)؛ [(۱۱) الخوانساری: روضات الجنات، ۴: ۱۸۵؛ (۱۲) ابن الاثیر: الکامل، ۱۰: ۱۸۸؛ (۱۳) ابن تغری بردی: النجوم الزاهرة، ۵: ۲۰۶؛ (۱۴) سبط ابن الجوزی: مرآة الزمان، ۸: ۴۸؛ (۱۵) ابن العماد: شذرات الذهب، ۴: ۱۸؛ (۱۶) الفهرس التمهیدی، ص ۲۸۰]۔

(C. Brockelmann براکلمان [و Ch. Pellat پیلا])

---

* **اَپَمِیَہ**: Apamea، رک بہ اَفامیہ.

* **اَپولّو نیوس تِیانہ**: (Apollonius of Tyana) رک بہ بَلِینُوس.

* **البُجَرّاس**: Alpujarras، رک بہ البُشّرات.

* **اَلپُوُنت**: (Alpuante) رک بہ اَلبُنت.

* **اَتا**: ترکی لفظ [پُرانی اور نئی دونوں زبانوں میں] جس کے معنی ہیں 'باپ'، نیز مورث اعلیٰ (قب 'اتا سوزُو' [ضرب المثل، بڑوں کی کہاوت] ۔غُز ترکوں میں اتا کا لقب ایسے لوگوں کے نام کے ساتھ آتا تھا جو معزّز و محترم ہوتے تھے [مثلاً دیکھیے شقائق ذیلی، ص ۱۳۱] ۔ یہ اصطلاح دانا اور مقدس و محترم کے معنی بھی دیتی ہے ۔ [جب ترکوں میں تصوّف کا فروغ ہوا تو وہ اپنے شیوخ کو 'باپ'، 'بابا'، 'اتا' وغیرہ کے لقب دینے لگے، چنانچہ یسوی صوفیوں میں، خصوصًا خوارزم میں، اکثر ناموں کے ساتھ 'اتا' کا لفظ دیکھنے میں آتا ہے، جیسے حکیم اتا، چوبان اتا، زنگی اتا، منصور اتا وغیرہ (دیکھیے فؤاد کوپرولو: ترک ادبیاتندہ ایلک متصوّفلر، استانبول ۱۹۱۹ء) ۔ وسطی ایشیا کے کئی ممالک میں مختلف مقامات کے ناموں میں، جو کسی نہ کسی بزرگ کے نام پر ہیں، اتا کا لفظ آتا ہے، مثلاً اولیا اتا، آوون اتا وغیرہ ۔ پندرھویں صدی کے معروف چغتائی شاعر اتائی کا تخلّص بھی اسی لفظ سے بنا ہے] ۔ قب نیز مادّۂ اتابک، اتابک العساکر، اتاترک.

* **اَتابک**: (اَتابیگ) سلجوقیوں اور ان کے جانشینوں کے عہد میں ایک بلند مرتبہ عہدے دار کا خطاب ۔ یہ اصطلاح ترکی زبان کی ہے اور اسلامی تاریخ میں پہلی مرتبہ سلجوقیوں کے عہد میں استعمال ہوئی؛ اس لیے یہ سوال بے جا نہ ہوگا کہ آیا وسطی ایشیا کے ترکی معاشروں میں اس کی کوئی نظیر موجود تھی یا نہیں ۔ تاحال اس لفظ کے استعمال کی کوئی سند دستیاب نہیں ہوئی اور یہ چیز کہ ارخون تمدن میں اتا (یعنی باپ) نام کا ایک شخص تھا جو کسی نوعمر شہزادے کے اتالیق کے طور پر کام کرتا تھا، اس قدر مبہم ہے کہ مذکورۂ بالا اصطلاح کے ساتھ اس کے تعلّق کی تصدیق ممکن نہیں ۔ یہی بات بعض دوسرے تمدنوں میں اسی قبیل کی دوسری چیزوں پر صادق آتی ہے (مثال کے طور پر ہارون الرشید اور یحیٰی برمکی ہی کو لیجیے) ۔ اس کے علاوہ قراخانی حکمرانوں کے یہاں بھی ایسے کسی منصب کے وجود کا سراغ نہیں ملتا ۔ بنابریں اتابیگ کی اصطلاح زیادہ معین طور پر غُز ترکوں یا سلجوقیوں ہی کے ساتھ مختص ہے ۔ سلجوقیوں کے یہاں بھی اس خطاب کا استعمال سب سے پہلے ایک ایرانی غیر فوجی (Civilian) منصب دار کے لیے ہوا اور آگے چل کر اس نے ترک فوجی سرداروں کے خطاب کی حیثیت سے تاریخی اہمیت حاصل کر لی ۔ جب ملک شاہ سلجوقی تخت نشین ہوا تو کم سن تھا ۔ اس نے اپنے وزیر نظام الملک کے لقب میں اتابیگ کا اضافہ کیا، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اس نے اپنا اقتدار تمام و کمال اپنے وزیر کے سپرد کر دیا ہے، گویا کہ وہ اس کا باپ ہے (ابن الأثیر، طبع ٹورن برگ (Tornberg) ۱۰: ۵۴؛ RCEA، ج ۷، شمارہ ۲۷۴۳ ـ ۲۷۴۷) ۔ بہرکیف چونکہ ملک شاہ کی وفات کے وقت سے لے کر یہ خطاب سلجوقی خاندان کی تمام شاخوں میں حتّٰی کہ ایشیاے کوچک کی شاخ میں بھی ملتا ہے، جس کی نشو و نما بالکل الگ اور بلا واسطہ ہوئی، اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ خطاب سلجوقی حکومت کے آغاز ہی سے موجود ہوگا ۔ ان حالات میں اخبار الدولة السلجوقية، طبع محمد ناظم، ص ۲۸ ـ ۲۹، کی اس شہادت کو ــ جو بظاہر پہلے کبھی پیش نہیں کی گئی تھی ــ مسترد کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ نوعمر شہزادہ آلپ آرسلان کے ساتھ اس کے باپ کے عہد میں ایک ترک اتابک مامور تھا، جس کا نام قطب الدین گُل سارِغ (قزِل سارغ؟) تھا ۔ ایک غیر ترک وزیر نظام الملک کا اس خطاب سے نوازا جانا بظاہر مستثنیات میں سے تھا، جس سے اس کے عروج و اقتدار کا مزید ثبوت ملتا ہے.

بہرحال ملک شاہ کی وفات کے وقت سے لے کر اتابیگ بیش از پیش باقاعدگی سے سامنے آتے ہیں اور ان کے عملی کردار میں بھی نمایاں اضافہ ہو جاتا ہے، جس میں شہزادوں کی کم سنی اور تخت و تاج کے دعویداروں کی باہمی آویزشوں سے مدد ملتی رہی ۔ اس ذیل میں صرف فوجی سرداروں کا ذکر ملتا ہے اور یہ اس روز افزوں اثر و رسوخ کے مطابق ہے جو اس طبقے کو سلجوقی حکومت کے دورِ انحطاط میں حاصل ہو گیا تھا ۔ ملک شاہ کے بیٹے بَرْکیارُک کے لیے باپ کی زندگی ہی میں جاندار گُمُش تکین کی حیثیت ''مربّی'' اور اتابک کی تھی (عماد الدین الاصفہانی، تلخیص بُنداری، طبع ہوتسما (Houtsma)، ص ۸۳؛ قب اَلرَّاوَندی: راحة الصّدور، طبع قزوینی، ص ۱۴۰) پھر بَرْکیارُک نے اپنے زمانے میں جب اپنے چھوٹے بھائیوں سنجر اور محمد کو مستقل جاگیریں دیں تو ان کے لیے اتابک مقرر کیے اور مرتے وقت اپنے بیٹے ملک شاہ کے لیے بھی، جو ابھی بہت خورد سال تھا ۔ اس کے ساتھ ہی ملک شاہ کے بھائی تُتُش کی وفات پر، جس کی جاگیر ملک شام میں تھی اور جو برکیارُک کا بدقسمت حریف تھا، اس کے دونوں بیٹوں رُضوان اور دُقاق کے لیے بھی ایک ایک اتابک مقرر ہوا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد سے ہر سلجوقی شہزادے کے لیے ایک اتابک ہوتا تھا، خاص کر اس صورت میں جب کہ اسے نابالغی کے عالم میں جاگیر دی جائے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی امیر کے متعدّد بیٹے ہوں تو اتنے ہی اتابک بھی ہوتے ہوں گے ۔ چونکہ یہ اتابک اب مخصوص طور سے غلامانہ اصل کے فوجی سرداروں میں سے لیے جاتے تھے اس لیے ان کے فریضۂ منصبی کو ایک طرح ہر غلام یا آزاد شدہ غلام کے اس فریضے سے متعلق سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے آقا کے خاندان کے حقوق اور مفاد کا تحفظ کرے جس کا ایک رکن وہ خود بھی ہوتا تھا ۔ مزید براں بسا اوقات یہ اتابک اپنے شاگرد کی ماں کے بیوہ ہو جانے پر

اس سے شادی کر کے اپنے ''باپ'' (اتا) ہونے کی حیثیت کو اَور مکمل کر لیتے تھے (مثلاً تُغ تکین نے دمشق میں [مذکورۂ بالا] دُقاق کی ماں سے نکاح کر لیا تھا)۔ اتابک کے اختیارات کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ وہ شہزادے یا امیر کے غیر معیّن اختیارات میں شریک ہوتا تھا اس لیے عام منصب داروں کی طرح اس کے اختیارات کی تعیین نہیں کی جاسکتی؛ تاہم ایک اتابک دوسرے اتابک کو معزول کر سکتا تھا اور بہر صورت شہزادے کے بالغ ہوجانے پر تو اتابک کے اختیارات خود بخود ختم ہوجاتے تھے اور اس کے لیے صرف یہ گنجائش باقی رہ جاتی تھی کہ وہ ایک ایسے مشیر کی حیثیت سے امیر کی رائے کو متاثّر کرتا رہے جس کی بات وہ سنتا ہو۔ اگر اتابک اس حد سے تجاوز کرتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ امیر سے اس کے تعلّقات منقطع ہوجاتے تھے (مثلاً رُضوان اور دُقاق کے) یا اسے قتل کرادیا جاتا تھا (جیسا کہ برکیارُک کے بھائی محمد نے قُتلُغ تکین کے ساتھ کیا)۔

کم از کم ابتدا میں یہی صورتِ حال تھی، لیکن وقت کے ساتھ اتابک کی حیثیت میں اضافہ اور شہزادوں کی حیثیت میں کمی ہوتی گئی۔ اتابک کے منصب کے حامل کو بڑا اقتدار حاصل ہوتا تھا اور عموماً اس کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ اس کا یہ اقتدار دائمی ہوجائے؛ لیکن اس کے علاوہ ملک شاہ کے جانشینوں کی دوسری پشت سے شہزادے اور اتابک کی حیثیتیں معکوس ہوگئیں۔ نقطۂ آغاز اب یہ ہوگیا کہ سلطان برضا یا بجبر کسی طاقت ور امیر کو کسی بڑی ولایت کا والی بنا دیتا تھا اور اس امیر کی رسمی اطاعت کو قائم رکھنے کے لیے سلجوقی شاہی خاندان کے بچوں میں سے کسی کو اس کے ساتھ وابستہ کر دیتا تھا اور یوں وہ امیر اس بچے کا اتابک بن جاتا تھا۔ کچھ مدت تک یہ کم سن شہزادہ اس امیر کے لیے ایک آڑ بنا رہتا تھا جس کے پیچھے امیر کی اپنی اُمنگیں پوشیدہ رہتی تھیں؛ چنانچہ سلطان مسعود کو اپنے متعدّد رشتے داروں کے ساتھ جو تنازعات پیش آئے ان کی وجہ یہی تھی کہ ہر رشتے دار کا اتابک اسے اکساتا تھا۔ اس طرح فارس، آذربیجان اور ایک موقع پر موصل بھی اپنے اپنے اتابک اور اپنے اپنے سلطنت کے دعویدار رکھتے تھے۔ کرمان کے چھوٹے سلجوقی خاندان میں بھی [اتابک کے اقتدار کا] اسی طرح کا ارتقا ظہور میں آیا (محمد بن ابراہیم: *Histoire des Seldjukides du Kirmān*، طبع ہوتسما (Houtsma)، ص ۳۵ - ۱۳۲ و مواضع کثیرہ و اشاریہ، بالخصوص قطب الدین محمد بن بُوزقُش کے عہد میں)۔

اس کے بعد ایک اَور نیا مرحلہ اس وقت آیا جب اتابک اپنے اتابکی منصب کے علاوہ ولایت کے منصب کو بھی موروثی بنانے میں کامیاب ہوگیا، جو نظریاتی طور پر گویا اتابک کے منصب کا صلہ یا انعام سمجھا جانے لگا۔ یہ بات چھٹی صدی ہجری/ بارھویں صدی عیسوی کے وسط کے بعد آذربیجانی اتابکوں کے خاندان نے، جو سلطان آرسلان کے اتابک ایلدگز کی نسل سے تھے، حاصل کی تھی۔ بالآخر اگلی صدی کے شروع میں جب دُقاق اپنا کوئی وارث چھوڑے بغیر سلجوقی مرکزوں سے بہت دور دمشق میں فوت ہوگیا تو اتابک تُغ تکین نے موقع پا کر ایک خود مختار خاندان قائم کر لیا اور اس کا نام اپنے نام پر رکھا۔ دوسرے مقامات پر صاحبِ قوت و صاحبِ اقتدار اتابکوں نے اپنے اپنے سلاطین کو مغلوب کر کے، جن کے وسائل بالکل ختم ہو چکے تھے، یہی مقصد حاصل کر لیا، چنانچہ موصل میں اتابک زنگی کی وفات پر اس کے جانشینوں نے ۵۳۹ھ/ ۱۱۴۴ء میں ایسا ہی کیا اور یہی صورت آخری ایرانی سلجوق سلطان کے مقابلے میں ایلدگز کے جانشینوں نے خلیفۂ اسلام کی مدد سے پیدا کی، جنھوں نے خوارزم شاہ کو وسطی ایران میں آنے کی دعوت دی (۵۸۸ھ/ ۱۱۹۲ء)۔ مزید براں سلطان کی عدم موجودگی آذربیجان اور موصل کے حکمرانوں کے لیے اس سے مانع نہ ہوئی کہ وہ اپنے آپ کو اتابک کہلواتے رہیں۔ اس وقت سے اس لفظ کا مخصوص مفہوم عملاً علاقائی امیر کا ہوگیا، مثلاً معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی صدی ہجری/ بارھویں صدی عیسوی کے وسط سے فارس میں یہ لقب سلغوریوں نے بھی، جو حقیقی اتابکوں کو شکست دے کر حکمران بنے تھے، اختیار کر لیا تھا، حالانکہ کوئی سلطان ان کی اتالیقی میں نہیں تھا۔ اتابکی خاندانوں میں سے سب سے زیادہ مشہور خاندان موصل کا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابن الاثیر نے، جو ان کا مؤرّخ اور ان کی رعیّت تھا، اپنی تصنیف ان سے منتسب کی ہے۔ نام نہاد اتابکوں کا ایک نیا خاندان ساتویں صدی ہجری/ تیرھویں صدی عیسوی میں لُرِستان میں نمودار ہوا (حمد اللہ المستوفی قزوینی: تاریخ گُزیدہ)۔

اتابک کا لقب سلجوقوں کے جانشینوں، بالخصوص شاہانِ خوارزم کے عہد میں بھی ملتا ہے، لیکن ان کے ہاں اتابکوں کو، جو محض نوجوان شہزادوں کے اتالیق ہوتے تھے، زیادہ اثر و رسوخ حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا گیا (جوینی، ۲: ۲۲، ۳۳، ۳۹، ۲۰۹)۔ آگے چل کر ایسی ریاستوں میں جو مغلوں کی فتح سے معرضِ وجود میں آئیں اتابک کا لقب کہیں کہیں شہزادوں کے غیر معیّن اتالیقوں کے لیے استعمال ہوتا نظر آتا ہے اور یا محض ان اعزازی القاب میں سے ایک لقب کے طور پر جو گزشتہ زمانے سے چلے آتے تھے (حوالہ جات کے لیے دیکھیے م - ف - کور پرُلُو: مقالۂ ''اتابک'' در [آ ترکی])۔ اس سے زیادہ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ لقب، جو فوجی اور باجگزار رؤسا کے لیے مخصوص تھا، گرجستان کی عیسائی مملکت میں بھی پہنچ گیا، جس نے بعض دیگر تاسیسات بھی آذربیجان سے اخذ کر لی تھیں۔ اس ریاست سے کبھی تو اس کی جنگ رہتی تھی اور کبھی شادی بیاہ کے تعلّقات قائم کر لیے جاتے تھے (کرسُٹ (J. Karst): *Le code géorgien du roi Vakhtang*، در *Commentaire*، ۱: ۲۱۱ بعد؛ (۲) M. F. Brosset: *Histoire de Géorgie*، ۱/ ۲ مواضع کثیرہ؛ (۳) ایلّن (Allen): *A History of the Georgian People*، ۱۹۳۲ء، باب ۲۳۔

ایشیائے کوچک کے سلجوقیوں کے یہاں اتابک کا وجود قِلیج آرسلان اوّل کے عہد سے مصدّق ہے، جس کا اتابک خُمر تاش السّلیمانی تھا (لہٰذا اس کے

باپ سلیمان بن قُتُلْمُش کا ایک آزاد شدہ غلام) (ابن الاَزْرَق، جس کا حوالہ ایمڈروز (Amedroz) کے حاشیے میں آیا ہے، جو اس نے ابن القَلانِسی کی تاریخ دِمشق، ص ۱۵۷، پر لکھا ہے۔ اس کے کچھ عرصے بعد مَلَطْیَہ کے کم سن سلجوقی سلطان کی ماں نے اپنے بیٹے کو اس کے بھائی سلطانِ قونیہ سے بچانے کی غرض سے اس کے لیے پے در پے کئی اتابک مقرر کیے اور ان کے ساتھ وہ شادی کرتی رہی۔ ان کا آخری اتابک اَرْتُقی بَلَک [رَکَ بآن] تھا (*Michael the Syrian*، ترجمہ از شابو (Chabot)، ص ۱۹۴، ۲۰۰)۔ ایشیاے کوچک کے سلجوقوں کی بڑی شاخ میں بھی چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی میں اتابکوں کی موجودگی کا ذکر ملتا ہے (*RCEA*، شمارہ ۳۳۷۶، ۳۳۷۷، ۳۴۳۳) اور بعد ازاں ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی میں بھی۔ حکمرانوں کا اقتدار ان [کے اختیارات] کی توسیع کے راستے میں حائل رہا اور صرف اس تباہی کے بعد جس کا نتیجہ [سلجوقی ریاست کے] مغلوں کے زیرِ حمایت آ جانے کی شکل میں برآمد ہوا یہ لقب ایسے لوگوں کے نام کے ساتھ ملتا ہے جو حکومت میں فیصلہ کُن اثر و رسوخ رکھتے تھے، مثلاً جلال الدین قرہ تائی؛ لیکن انقلاب سے جو حالات عملاً پیدا ہو گئے تھے ان کی وجہ سے قوت و اقتدار کسی ایک فرد کے نہیں بلکہ اعلٰی حکّام کی ایک جماعت کے ہاتھ میں آ گیا تھا، جس کے افراد صورتِ حال کے مطابق کبھی ایک دوسرے کے دوست ہوتے تھے کبھی دشمن؛ اور یہ بات یقینی ہے کہ اس جماعت میں اتابک کی حیثیت سب سے اہم نہیں تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے میں اتابک کا وجود ایلخانی عہد کے ساتھ ہی ختم ہو گیا اور عثمانی عہد میں تو اس کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔

تاہم دولتِ مملوکیہ (مصر) میں اتابک کا لقب بالاستقلال خاصے عرصے تک باقی رہا۔ ایوّبیوں نے بھی اپنی مملکت میں اس لقب کو رائج کیا تھا اور شاید اس کا آغاز اس عارضی اتالیقی سے ہوا ہو جو الافضل نے ۵۹۵ھ / ۱۱۹۸ء میں مصر میں اپنے کم سن بھتیجے، العزیز کے بیٹے، کے لیے اختیار کی۔ بہر کیف یہ لقب یمن اور بالخصوص حلب کے حکمرانوں کی صغر سنی کے ایام میں زیادہ باقاعدگی اور استحکام کے ساتھ استعمال ہوتا رہا (ابن العدیم کی تاریخ حلب، بمواضع کثیرہ)۔ اس طریقے سے یہ لقب مملوکوں تک پہنچا۔ سلطنتِ ممالیک کے بانی عزّ الدین ایبک کے نام کے ساتھ یہ لقب کسی شہزادے کا اتالیق ہونے کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ اسے یہ لقب الصالح ایوّبی کی مشہور بیوہ اور وارثہ شجرۃ الدر کا شوہر اور مدار المہام ہونے کی حیثیت سے ملا تھا۔ یہ لقب، کبھی معتدبہ اختیار و اقتدار کے ساتھ اور کبھی اس کے بغیر، خاندان ممالیک کے خاتمے تک قائم رہا۔ اگر ہم المقریزی (سلوک، ترجمہ Quatremère، ۱/۱: ۲) کے بیان کو صحیح سمجھیں تو ایبک کا لقب افواج کا اتابک تھا، لیکن اس کے معاصر مصنّفین میں سے کسی نے بھی اس منصب کو اس کے ساتھ منسوب نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ المقریزی کے ذہن میں اتابک العساکر [رَکَ بآن] کے لقب کے بارے میں کچھ التباس پیدا ہو گیا ہوگا، جو اس کے زمانے میں مروّج تھا۔ درحقیقت یہ لقب افواج کے سالارِ اعلٰی کے لقب سے مطابقت رکھتا تھا، اگرچہ اس لفظ کا یہ وسیع تر مفہوم بظاہر چرکسیوں کے عہد میں ہو گیا جب کہ نائب کا عہدہ منسوخ کر دیا گیا۔

مآخذ: (۱) اس موضوع کا عمومی مطالعہ صرف م - ف - کور پرولو: کتاب مذکور میں ہے جہاں تفصیلی حوالہ جات اور مزید معلومات مل سکتی ہیں؛ (۲) جن مآخذ و حوالہ جات کا ذکر مقالے میں آ چکا ہے ان کے علاوہ رَکَ بہ مادّۂ مملوک و سلجوقیہ؛ (۳) سلاجقۂ اعظم اور ان کے ایرانی اور عراقی جانشینوں کے بارے میں معلومات حسبِ ذیل مصنّفین سے لی گئی ہیں: ابن الاثیر، عماد الدین الاصفہانی اور الرّاوندی؛ (۴) نیز رَکَ بہ، ثناء اللہ: *The decline and fall of the Saldjukid Empire*، کلکتہ ۱۹۳۸ء؛ (۵) M. A. Köymen: بویوک سلجوق لو امپراطور لوغو تاریخی، ج ۲، انقرہ ۱۹۵۴ء؛ (۶) اوزون چارشیلی (I. H. Uzunçarşılı): عثمانلی دولتی تشکیلاتینہ مدخل، استانبول ۱۹۴۱ء، ص ۵۰ - ۵۱؛ (۷) ایشیاے کوچک کے بارے میں دیکھیے بالخصوص ابن بیبی اور آق سرائے کے وقائع، بمواضع کثیرہ؛ (۸) مملوکوں کے بارے میں دیکھیے مادّۂ مابعد [یعنی اتابک العساکر].

(CL. CAHEN)

---

* **اَتابک العَساکر**: عہدِ ممالیک میں نائب السلطنۃ کا عہدہ منسوخ کیے جانے پر اتابک العساکر (سپہ سالارِ اعظم) سلطنت کا اہم ترین امیر شمار ہونے لگا۔ اس کے وظائف ان سے کہیں زیادہ وسیع تر ہوتے تھے جو اس منصب کے نام سے ظاہر ہوتے ہیں، کیونکہ جملہ مقاصد و اُمور میں وہ سلطان کا نائب بن گیا تھا۔ بسا اوقات اس کے نام کے ساتھ مدبّر الممالک یا مدبّر الممالک الاسلامیہ کا لقب بھی شامل کر دیا جاتا تھا۔ یہ عام بات تھی، بالخصوص چرکسی مملوکوں کے عہد میں، کہ سلطان کے انتقال کے بعد وہ وارث تخت بن جاتا تھا (دیکھیے D. Ayalon: *Studies on the Structure of the Mamluk Army*، در *BSOAS*، ۱۹۵۴ء، ص ۵۸ - ۵۹ و حوالجات بر ص ۵۹، حاشیہ ۲).

(A. AYALON)

---

* **اَتابگ**: Atabeg، رَکَ بہ اَتابک.

---

* **اَتابِگ العساکر**: رَکَ بہ اَتابک العسَاکر.

⊗ **اَتاتُرک**: غازی مصطفٰی کمال (۱۸۸۱ - ۱۹۳۸ء) جمہوریۂ ترکی کے بانی اور اس کے پہلے صدر، ۱۸۸۱ء میں سلونیکا میں پیدا ہوے۔ ان کا اصلی نام مصطفٰی تھا، ان کے والد کا علی رضا افندی اور والدہ کا زبیدہ خانم۔ ان کے والد کُتّابِ اوقاف اور مامورینِ رسومات کے زمرے میں ۱۸۷۶ء میں سلونیکا کے

عسکر ملّیہ کے طابور (دفتر) میں ملازم تھے؛ بعد میں ملازمت ترک کر کے تجارت میں مشغول ہو گئے اور ابھی مصطفٰی چھوٹے ہی تھے کہ انھیں یتیم چھوڑ کر انتقال کر گئے۔ اب ان کی والدہ زبیدہ خانم ان کی پرورش کی کفیل ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے سلونیکا میں ''شمسی افندی مکتبی'' نامی درس گاہ میں حاصل کی۔ جدید اسلوب پر لکھنا پڑھنا سکھانے کے لیے سلونیکا میں یہ پہلا مکتب تھا۔ مصطفٰی کمال اپنے بچپن اور ابتدائی تعلیم کا ذکر یوں کرتے ہیں: ''اپنے بچپن کے زمانے کی ایک چیز جو مجھے اب تک یاد ہے میرے سکول جانے کا مسئلہ تھا۔ اس معاملے میں میرے والد اور والدہ کے درمیان شدید اختلاف تھا۔ والدہ تو یہ چاہتی تھیں کہ مجھے دینی تعلیم دی جائے اور اس غرض سے محلّے کے مدرسے میں داخل کیا جائے، لیکن میرے والد، جو ''رسومات'' میں مامور تھے، مجھے شمسی افندی کے مکتب میں بھیجنا چاہتے تھے، جو انھیں دنوں کھلا تھا، اور نئے اسلوب پر تعلیم دینے کے طرفدار تھے۔ آخر میرے والد نے اس مسئلے کو بہت خوش اسلوبی سے حل کر لیا۔

اپنی تعلیم کی ابتدا میں نے محلے کے مدرسے ہی میں کی اور اس طرح میری والدہ کی دل جمعی ہو گئی۔ چند دن کے بعد ہی میں اس محلے کے مدرسے سے نکل آیا اور شمسی افندی کے مکتب میں داخل ہو گیا۔ تھوڑے عرصے بعد میرے والد انتقال کر گئے اور میری والدہ میرے ماموں کے پاس گاؤں میں جا کر رہنے لگیں، وہاں کی زندگی بالکل دیہاتیوں کی سی تھی اور مجھے بھی اسی زندگی سے واسطہ پڑا۔ میرے ماموں مجھے مختلف طرح کے کام دے دیا کرتے تھے اور میں انھیں انجام دیتا تھا۔ ان میں سے ایک کھیتوں کی رکھوالی کرنا بھی تھا۔ اپنے ایک ساتھی بیان مقبولہ بویسان (Bayan Makbule Boysan) نامی کے ساتھ باقلا کے کھیتوں کے کنارے ایک جھونپڑی میں بیٹھنا اور کوّوں کو ہنکانے کا شغل میں اب تک نہیں بھولا۔ دیہاتی زندگی کے اَور کام بھی میں انجام دیتا رہا۔ اس طرح میری والدہ کو میرے ان پڑھ رہ جانے کے متعلّق اندیشہ پیدا ہونے لگا اور آخر انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں سلونیکا میں اپنی خالہ کے پاس جاؤں اور وہاں مکتب میں اپنی پڑھائی جاری رکھوں۔ میں سلونیکا میں ملکیہ اعدادیہ (Mülkiye İdadisine) میں داخل ہو گیا۔ اس مکتب میں قایمق حافظ نامی ایک معلّم تھے۔ ایک روز میں درس کے دوران میں ایک لڑکے سے جھگڑ پڑا وہ بہت ناراض ہوے۔ انھوں نے مجھے سرزنش کی اور بہت پیٹا؛ میرا تمام جسم خون میں لت پت ہو گیا۔ میرے نانا پہلے ہی سے میرے اس مکتب میں پڑھنے کے مخالف تھے؛ اس واقعے کے بعد انھوں نے فوراً مجھے وہاں سے اُٹھا لیا۔ ہمارے ہمسائے میں بنباشی قدری بے نامی ایک صاحب رہتے تھے۔ ان کا بیٹا احمد بے عسکری رُشدیہ میں تعلیم پاتا تھا اور اپنے سکول کے مخصوص کپڑے پہنا کرتا تھا۔ اسے دیکھ دیکھ کر مجھے بھی ایسے ہی کپڑے پہننے کی ہوس پیدا ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ سڑکوں پر میں پولیس کے افسروں (ضابطوں) کو بھی رشک سے دیکھا کرتا تھا۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس مرتبے کو پہنچنے کا ذریعہ عسکری رُشدیہ میں داخلہ ہے۔ ان دنوں میری والدہ بھی سلونیکا میں آئی ہوئی تھیں۔ میں نے ان سے اپنی عسکری رُشدیہ میں داخلے کی خواہش کا ذکر کیا، لیکن میری والدہ فوجی ملازمت سے متنفّر تھیں اور سپاہی بننے کی مجھے شدّت سے ممانعت کیا کرتی تھیں؛ اس لیے امتحان کے داخلے کا زمانہ آیا تو میں نے ازخود عسکری رُشدیہ میں جا کر امتحان دے دیا اور اس طرح اپنی والدہ کی مرضی کے خلاف ایک اہم امر کا مرتکب ہوا (۱۸۹۳ء)''۔

اس سکول میں مصطفٰی نے ریاضی سے بہت دلچسپی ظاہر کی اور اتنی مہارت بہم پہنچائی کہ اپنے درجے کے اوپر کے نصاب کے سوالات بھی حل کر لیتے تھے۔ ایک روز ان سے ان کے ایک استاد نے کہا: ''دیکھو بیٹا تمھارا نام بھی مصطفٰی ہے اور میرا بھی، اس طرح کام نہیں چلے گا۔ دونوں کے نام میں کچھ فرق ہونا چاہیے۔ آج سے تمھارا نام مصطفٰی کمال ہوگا''۔ اس طرح اس دن سے نوعمر مصطفٰی کا نام مصطفٰی کمال ہو گیا۔

سلونیکا کے عسکری رُشدیہ کی تعلیم ختم کرنے کے بعد مصطفٰی کمال مناستر کے عسکری اِعْدادِیہ میں داخل ہوے (۱۸۹۵ء)۔ یہاں ریاضی میں انھیں بالکل کوئی دقّت پیش نہیں آئی، صرف فرانسیسی میں کچھ کمزور تھے اور اس سے وہ پریشان رہتے تھے۔ آخر دو تین مہینے تک خفیہ طور پر سلونیکا کے فریلر (Frerler) سکول میں فرانسیسی پڑھتے رہے اور اس زبان میں انھوں نے خاصی مہارت پیدا کر لی۔ اس سکول میں ان کے ایک ہم جماعت ساتھی عمر ناجی کو شاعری اور ادب کا شوق تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی انھیں بھی شوق پیدا ہوا، لیکن سکول کے ایک نئے سکرٹری (کاتب) نے انھیں فہمائش کی کہ شعر و شاعری میں مشغولیت فوجی تعلیم سے مناسبت نہیں رکھتی، اس لیے مصطفٰی کمال کو یہ خیال ترک کرنا پڑا، لیکن اچھا بولنے اور اچھا لکھنے کی خواہش انھیں ہمیشہ رہی۔ مناستر میں تعلیم ختم کر کے مصطفٰی کمال استانبول گئے اور وہاں مدرسۂ حربیہ کی پیادہ (Infantry) کلاس میں داخل ہو گئے (۱۳ مارچ ۱۸۹۹ء)۔ یہاں بقول ان کے انھوں نے شروع میں پڑھائی میں بے پروائی برتی، لیکن دوسری کلاس تک پہنچنے پر فوجی تعلیم کا شوق بڑھ گیا۔ لکھنے اور بولنے کا شوق اب بھی برابر رہا اور اوقاتِ فرصت میں اپنے دوستوں کے ساتھ بحث و مباحثہ کر کے خطابت کی مشق کرتے رہے۔

اسی زمانے میں مصطفٰی کمال سیاسی افکار کی جانب بھی متوجہ ہوے۔ یہ سلطان عبدالحمید کے دورِ حکومت کے آخری ایام تھے۔ مدرسۂ حربیہ کے طالب علم مشہور وطن پرست شاعر نامق کمال کے اشعار بہت ذوق و شوق سے پڑھا کرتے تھے، بلکہ سکول کے قواعد کی خلاف ورزی کر کے اکثر شب میں بھی اس کی نظمیں پڑھتے رہتے تھے۔ ان اشعار سے ان کے نوجوان دماغوں میں شبہات پیدا ہونے شروع ہوے اور حکومتِ وقت کی نااہلیت کا احساس بڑھتا گیا۔ مدرسۂ حربیہ کی تعلیم ختم کر کے وہ ارکانِ حرب کے درجے میں داخل ہوے (مدرسۂ حربیہ، ۱۹۰۳ء)۔ ملک کے انتظام اور سیاست سے بے اطمینانی میں مزید اضافہ ہوا تو آخر کار مصطفٰی کمال اور ان کے ساتھیوں نے خفیہ طریقے پر ہاتھ سے لکھا ہوا ایک

اخبار سکول میں جاری کر دیا تا کہ اَور طالب علم بھی اپنے خیالات اور تأثّرات کی اشاعت کریں۔ لیکن مدرسے کے مفتّش اسمٰعیل پاشا کو اس کی خبر ہوگئی اور انھوں نے اس پر سرزنش کی۔ ان دنوں سکول کے مدیر رضا شاہ پاشا تھے۔ انھوں نے اسمٰعیل پاشا کی جانب سے سلطان کے پاس شکایت پہنچائی کہ مکتب میں اس قماش کے طلبہ موجود ہیں؛ لیکن رضا پاشا نے اس معاملے میں زیادہ سختی نہیں برتی، بلکہ اسے ٹال دیا؛ صرف طلبہ سے اتنا کہا کہ زمانۂ تعلیم میں دوسری چیزوں میں مشغول رہنا ٹھیک نہیں ہے؛ تاہم مصطفٰی کمال کا سیاسی شغف اپنے اسباق کی تیاری کے ساتھ ساتھ جاری رہا۔

مدرسۂ حربیہ سے نکلنے کے بعد مصطفٰی کمال اور ان کے ساتھیوں نے استانبول میں ایک مکان کرائے پر لے لیا، جہاں وہ سب جمع ہو کر ملکی مسائل پر اظہارِ خیال کیا کرتے تھے۔ سلطان عبدالحمید کے خفیہ کارکنوں کو اس کی خبر ہوئی اور انھوں نے ان لوگوں کی نقل و حرکت پر نگرانی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فتحی بے کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ ان سب نوجوان افسروں کی خواہش یہ تھی کہ وہ سب ایک ساتھ دوسری یا تیسری فوج (اردو) میں متعیّن ہو جائیں، لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ مصطفٰی کمال کو پانچویں فوج میں مامور کر کے شام بھیج دیا گیا اور وہاں نویں سوار رجمنٹ (آلای) کا نظم و نسق (ستاج) ان کے سپرد کیا گیا۔ شام کے قیام کے دوران میں مصطفٰی کمال کو بہت سے قیمتی تجربات حاصل ہوئے اور حکومت کی بے ترتیبی اور بے پروائی اور لوگوں کی بے چینی اور اضطراب ان پر بخوبی عیاں ہو گیا۔ ان حالات سے متأثّر ہو کر مصطفٰی کمال نے اپنے دوستوں کی مدد سے شام میں ''وطن و حریت'' کے نام سے ایک جمعیت قائم کی اور اس خفیہ انجمن کے اغراض و مقاصد کی اشاعت کا کام مصطفٰی کمال کے سپرد ہوا۔ وہ فوجی نظم و نسق (ستاج یا یمق) کے سلسلے میں اطراف ملک میں دورہ کرتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ کام بھی انجام دیتے رہے؛ لیکن شام کی سرزمین اس کے لیے زیادہ مساعد نہ تھی اور اس لیے مصطفٰی کمال یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح مقدونیہ پہنچ جائیں؛ چنانچہ یوزباشی جمیل بے کی معاونت سے، جو سلونیکا مرکز کے نائب کمانڈر (قپوتان معاونی) تھے، وہ آخر کار سلونیکا پہنچ گئے اور تبدیلی آب و ہوا کے بہانے وہاں کوئی چار مہینے مقیم رہے۔ وہاں وہ اپنی والدہ سے ملے اور ''انجمن وطن و حریت'' کی ایک شاخ وہاں بھی قائم کر دی، جو بعد میں ''انجمن اتحاد و ترقی'' میں ضم ہوگئی۔ چار ماہ کے بعد مصطفٰی کمال یافہ واپس چلے گئے اور بیرشیبہ کی طرف فوجوں کے معائنے کے لیے بھیجے گئے۔ پھر توپخانے کے نظم و نسق (ستاج یا یمق) کے لیے انھیں شام ہی میں مامور کیا گیا۔ اب انھیں گُل آغا (لیفٹیننٹ) کے رتبے پر ترقی مل گئی اور شام کے ''اردو ارکان حربیہ'' میں متعیّن ہو گئے (۲۰ جون ۱۹۰۷ء)۔ ۱۹۰۷ء کے ستمبر میں انھیں مقدونیہ میں متعیّن کیا گیا، جہاں وہ پہلے مناستر میں رہے اور پھر سلونیکا میں۔ اس اثنا میں سلونیکا سے اسکوپ (Üsküp) ریلوے کے مفتّش کا عہدہ بھی ان سے متعلّق رہا۔

کچھ عرصے بعد (۲۳ جولائی ۱۹۰۸ء) مشروطیہ کا اعلان ہوا۔ مصطفٰی کمال اس سے مطمئن نہیں ہوئے، اس لیے کہ وہ حکومت میں زیادہ بنیادی تبدیلی کے خواہاں تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے جرمن جنرل لِٹسمان (Litzmann) کی کتاب کا ترکی ترجمہ تکمن محاربہ تعلیمی کے نام سے پیادہ فوج کے فائدے کے لیے شائع کیا (۲۳ فروری ۱۹۰۹ء)۔ ۱۳ اپریل ۱۹۰۹ء کے اہم واقعے کے بعد ترکی میں ''حرکت اردو'' کے نام سے جو فوج بنائی گئی اس کے متعلّق انھوں نے ایک بیان بھی تحریر کیا۔ اس کے بعد انھیں ایک اہم کام پر طرابلس الغرب روانہ کیا گیا۔ اگست ۱۹۰۹ء میں وہ کوپرلُو (Köprülü) کے نواح میں شمالی سوار فوج کے کمانڈر کی معیت میں رہے اور شمالی اردوگاہ کے متعلّق انھوں نے کچھ ملاحظات (نوٹ) لکھے۔ یہ کہہ کر کہ ''فوجی کا ہدیہ فوجیوں میں مقبول ہوتا ہے'' انھوں نے ان ملاحظات کی نقلیں اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیں۔ اس کے بعد انھیں سلونیکا کے افسروں کی تربیت گاہ میں بحیثیت کمانڈر مقرر کیا گیا (۶ ستمبر ۱۹۰۹ء)۔ یہاں انھوں نے بہت قابلیت سے کام کیا اور ان کی تنقید و تفتیش سے بالا دست افسروں میں ان کے خلاف حسد و رقابت پیدا ہو گئی۔ اسی سال وہ ۳۸ ویں پیادہ رجمنٹ کے کمانڈر بنا دیے گئے اور اس عہدے پر انھوں نے جو کارہاے نمایاں سرانجام دیے ان سے ان کی فوجی قابلیت کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا اور دوسرے فوجی افسروں کے لیے وہ ایک نمونہ بن گئے؛ چنانچہ اکثر صلاح و مشورے کے لیے یہ لوگ ان کے پاس جمع رہتے تھے۔ اسی زمانے میں ارناؤط (البانیا) کی بغاوت رونما ہوئی۔ محمود شوکت پاشا اس بغاوت کو فرو کرنے کے کام پر مامور ہوئے اور وہ اپنے ساتھ مصطفٰی کمال کو بھی البانیا لے گئے، جہاں ایپک (Ipek) کے متصرّف فوزی بے (بعد میں مارشل فوزی چقماق) سے ان کی پہلی بار ملاقات ہوئی۔ ۱۹۱۰ء میں فرانس کے شہر Picardie میں فوجی نقل و حرکت کی جو بڑی نمائش (Manouvres) ہوئی اس میں شریک ہوئے اور اسی اثنا میں انھوں نے لِٹسمان (Litzmann) کی کتاب کے دوسرے حصّے کا ترجمہ بنام بولوغون محاربہ تعلیمی بھی شائع کیا۔

سلونیکا سے مصطفٰی کمال کو استانبول بھیجا گیا (۱۳ ستمبر ۱۹۱۱ء)۔ تھوڑے ہی دن بعد اطالویوں نے طرابلس پر حملہ کر دیا (۲۷ ستمبر ۱۹۱۱ء)۔ مصطفٰی کمال اپنے چند دوستوں کے ہمراہ خفیہ طریقے پر مصر کے راستے طَبُروق (Tobruk) پہنچ گئے اور ادہم پاشا کی، جو اطالویوں کا مقابلہ کر رہے تھے، مدد کی۔ انھوں نے طبروق کی جنگ میں نمایاں حصّہ لیا اور سال بھر تک طرابلس میں مقیم رہے۔ یہیں انھیں بِکباشی (میجر) کے عہدے پر ترقی ملی (۲۷ نومبر ۱۹۱۱ء) اور ابھی وہیں تھے کہ بلقان کی جنگ شروع ہوگئی۔ یہ خبر سن کر مصطفٰی کمال ۲۴ دسمبر ۱۹۱۱ء کو رومانیا کے راستے استانبول واپس آئے۔ یہاں آ کر انھیں سلونیکا کے سقوط اور بلغاریوں کی شتالجہ تک پیش قدمی کی اطلاع ملی۔ اس جنگ کے دوران میں انھیں گیلی پولی اور بولایر (Bolayir) میں اہم عہدوں پر مقرر کیا گیا اور انھوں نے چناق قلعہ کی محافظت

اور دشمن کی مدافعت کی ضروری تدابیر اختیار کیں.

بلقان کی جنگ کے اختتام پر مصطفٰی کمال کو صوفیا میں ملٹری اتاشی مقرر کیا گیا (۱۲ اکتوبر ۱۹۱۳ء) اور بعد ازاں بخارسٹ، بلغراد اور چتینا (Četina) میں وہ اسی عہدے پر مامور رہے اور انھیں یار بای (لیفٹیننٹ کرنل) کے عہدے پر ترقی مل گئی (یکم مارچ ۱۹۱۴ء)۔ ۲۸ جولائی ۱۹۱۴ء کو جنگِ عظیم شروع ہوگئی اور ۲ اگست ۱۹۱۴ء کو جرمنی سے اپنے معاہدے کی پابندی کرتے ہوے ترکی بھی جنگ میں شریک ہوگیا۔ مصطفٰی کمال شروع ہی سے اس شرکت کے مخالف تھے اور بخوبی جانتے تھے کہ اس کا نتیجہ خراب ہوگا، لیکن اس سے ان کی سرگرمی میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ جنگ میں عملی حصّہ لینے کے لیے بے چین تھے؛ چنانچہ ان کے اصرار پر ہائی کمانڈ (باش قموتان وکیللغی) کی طرف سے انھیں تکِرداغ (Tekirdāg) میں ایک رجمنٹ (آلای) کی کمان دی گئی (۲ فروری ۱۹۱۵ء)۔ انیسویں فوج (فرقے) کے نام سے اس رجمنٹ نے ان کی قیادت میں کئی کارہاے نمایاں سرانجام دیے اور شہرت حاصل کی۔ بعد ازاں مصطفٰی کمال کو میڈوس (Maydos) میں متعیّن کیا گیا۔ جرمن ہائی کمان کے خیال میں سب سے زیادہ خطرہ بولایر (Bolayir) پر دشمن کے حملہ آور ہونے کا تھا، جہاں سے اسے بحر مارمورا تک پہنچنے کا راستہ مل سکتا تھا، اس لیے وہ زیادہ تر ترکی فوج کو اسی محاذ پر جمع کرنا چاہتی تھی، لیکن ترکی ہائی کمان اس سے متفق نہ تھی۔ مصطفٰی کمال پاشا کے سپرد چند پیادہ رجمنٹیں اور توپ خانہ تھا اور منطقۂ میڈوس کے کماندار کی حیثیت سے رومیلی (Rumeli) سے لے کر سدّالبحر اور مورتو (Morto) تک پورے محاذ کی محافظت ان کے ذمّے تھی۔ مصطفٰی کمال نے خود یہ لکھا ہے کہ ان کے خیال میں دشمن کے دو جگہ سے حملہ آور ہونے کا زیادہ امکان تھا، یعنی یا تو سدّالبحر کی طرف سے یا قباتپہ (Kabatepe) کی سمت سے اور اسی کے مطابق انھوں نے سخت نگرانی شروع کی۔ جب دشمنوں کو بحر مارمورا تک سمندر کے راستے پہنچنے میں ناکامی ہوئی (۱۸ مارچ ۱۹۱۵ء) تو انھوں نے خشکی کا راستہ اختیار کیا اور چناق قلعہ بوغاز کی سمت دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ انگریزی فوجوں نے اری بورنو (Ariburnu) سے آگے بڑھ کر ''کمال یری'' نامی مقام تک پیش قدمی کی اور ستائیسویں رجمنٹ (آلای) سے ان کا مقابلہ ہوا۔ مصطفٰی کمال نے حکام بالادست کے احکام کا انتظار نہیں کیا اور کونک بایری (Conk- bayiri) تک آگے بڑھ گئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ ترکی فوجیں پسپا ہو رہی ہیں اور دشمن ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''میں نے بھاگتے ہوے سپاہیوں سے پوچھا، تم لوگ کیوں بھاگ رہے ہو؟''۔ انھوں نے جواب دیا: ''آفندم! دشمن!'' میں نے پوچھا: ''کہاں؟'' ''وہ دیکھو'' کہہ کر انھوں نے پہاڑی نمبر ۲۶۱ کی طرف اشارہ کیا۔ اس نازک موقع پر مصطفٰی کمال نے اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھا اور بھگوڑے سپاہیوں کو مخاطب کر کے کہا: ''دشمن سے بھاگتے نہیں''۔ انھوں نے جواب میں گولہ بارود ختم ہوجانے کا عذر کیا۔ اس پر مصطفٰی کمال نے ان سے کہا: ''اگر تمھارے پاس گولہ بارود نہیں رہا تو سنگینیں تو موجود ہیں!'' اور اس طرح فوج کی ہمّت بندھا کر دشمن کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ بڑی سخت جنگ کے بعد دشمن رات کی تاریکی میں میدانِ جنگ سے فرار ہوگیا۔ اَری بُورنُو کا یہ معرکہ گیلی پولی کی لڑائی کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ چنانچہ اب اری بُورنُو کی فوجوں کی پوری کمان بھی مصطفٰی کمال کو مل گئی (۸ مئی ۱۹۱۵ء)۔ اس کے بعد جو معرکے ہوے ان میں ان کی صفات بحیثیت ایک بڑے کمانڈر کے واضح ہوگئیں۔ ۱۹ مئی تک برابر مدافعت جاری رہی اور مصطفٰی کمال کو البای (کرنل) کے عہدے پر ترقی دی گئی (یکم جون ۱۹۱۵ء)۔ اب دشمن نے دوسری سمت یعنی کونک بایری۔ کوچہ چمن (Conk-bay iri- Koca-Cimen) کے محاذ کی طرف حملہ کیا۔ اس وقت ساروس (Saros) گروپ کی قیادت البای فوزی کے ہاتھ میں تھی۔ موقع کی نزاکت کے پیشِ نظر مصطفٰی کمال کی درخواست پر انھیں ''انفرتہ لر گروپ'' کی کمان دے دی گئی اور نئے عہدے کا چارج سنبھالتے ہی مصطفٰی کمال نے دشمن کو پیچھے دھکیل دیا۔ دشمن نے کونک بایری پر خشکی اور سمندر سے گولہ باری شروع کی اور ایک گولے کا ٹکڑا، جو مصطفٰی کمال کے قریب پھٹا، ان کے بھی آ لگا۔ خدا کی قدرت سے ان کے کوٹ کی داہنی جیب میں جو گھڑی تھی یہ ٹکڑا اس پر لگا اور مصطفٰی کمال کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ جرمن جنرل لیمان پاشا (Liman von Liman Saunders) نے یہ تاریخی گھڑی بطور یادگار مصطفٰی کمال سے لے لی اور اس کے بدلے انھیں اپنی گھڑی دے دی۔ سخت جنگ کے بعد آخر کار دشمن پسپا ہوگیا اور اس طرح مصطفٰی کمال نے کونک بایری کو دوسری دفعہ بچالیا (۲۱ اگست ۱۹۱۵ء).

ان معرکوں کے دوران میں مصطفٰی کمال محض دفاعی جنگ لڑتے رہے اور اس سلسلے میں انھوں نے ہائی کمان کی ہدایت پر عمل ضروری نہیں سمجھا، اس لیے کہ ان کا خیال یہ تھا کہ ''بیکار ضائع کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک آدمی بھی نہیں ہے''۔ جب یہ مخالفت زیادہ بڑھی تو مصطفٰی کمال نے ملازمت سے استعفا دے دیا (۱۰ دسمبر ۱۹۱۵ء)؛ لیکن لیمان پاشا نے استعفا قبول نہیں کیا بلکہ انھیں تبدیلِ آب و ہوا کے لیے رخصت دے دی۔ مصطفٰی کمال اب استانبول آ گئے۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۱۵ء کو دشمن چناق قلعہ سے پسپا ہوگیا۔ مصطفٰی کمال کی شہرت اب دور دور تک ہوگئی تھی اور جب کل اردو قومتان (سپریم کمانڈر) کی حیثیت سے انھیں اِدِرنہ (Adrianople ‘Edirne) بھیجا گیا تو وہاں کے لوگوں نے ان کا بہت پُرجوش استقبال کیا۔ اِدِرنہ سے ۲۷ فروری ۱۹۱۶ء کو مصطفٰی کمال کو راس التّین بھیج دیا گیا اور سلوان میں انھوں نے اپنے نئے عہدے کا چارج لیا۔ ۱۰ اپریل ۱۹۱۶ء کو انھیں لِوالیغ (جنرل) کے منصب پر ترقی ملی اور اس کے بعد انھیں قفقاز کے محاذ پر متعین کیا گیا۔ وہاں جا کر انھوں نے بِطلِیس اور موسوَ (Mus’u) کو دشمن سے چھین لیا (۶ و ۷ اگست ۱۹۱۶ء)۔ اس کارنامے کے صلے میں انھیں ''اُلتُون قِلیچلی'' (شمشیر زرّیں) تمغہ عطا ہوا اور وہ دوسری فوج کے بای وکیل مقرر ہوگئے۔ سِکِرَت (Sekerat) میں مصطفٰی کمال اور عصمت پاشا کا پہلی مرتبہ ساتھ

ہوااور یہ دونوں ملک کی فلاح وبہبود کے لیے تدابیر سوچتے رہے۔

اس کے کچھ عرصے بعد ''حجاز قوۂ سفریہ'' کے نام سے جونئی فوج مرتّب کی گئی مصطفٰی کمال اس کے کمانڈر بنائے گئے اور اس سلسلے میں انھوں نے حجاز سے شام تک سفر کیا۔ شام میں ان کی انور پاشا سے ملاقات ہوئی، جو اس نئی فوج کے سپریم کمانڈر کے وکیل (باش قمومتان وکیل) تھے اور مصطفٰی کمال نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ حجاز سے ترکی فوجوں کو ہٹا کر شام کی فوجوں کو تقویت دی جائے؛ لیکن انور پاشا اس پر راضی نہیں ہوے۔ اس مخالفت کا یہ نتیجہ ہوا کہ مصطفٰی کمال کو دوبارہ دوسری فوج کا کمانڈر بنا کر مشرقی اضلاع میں بھیج دیا گیا۔ ۵ جولائی ۱۹۱۷ء کو وہ نئی ساتویں فوج کے کمانڈر مقرر ہوے۔ اس اثنا میں حلب میں جنرل فاکن ہائن (Falkenhayn) ''یلدِرِم اردوُ'' [yildirim= برق ورعد] کی تشکیل میں مصروف تھا تاکہ بغداد کا محاصرہ کیا جاسکے۔ مصطفٰی کمال کی راے میں یہ کوشش بے سود تھی اور اسی طرح فاکن ہائن کی یہ تجویز کہ بیرشیبہ سے حملہ کر کے انگریزوں کو سمندر میں دھکیل دیا جائے ان کے نزدیک ممکن العمل نہ تھی۔ اسی زمانے میں مصطفٰی کمال اور عصمت پاشا نے ایک متفقہ رپورٹ تیار کی، جس میں ملک کی خراب وخستہ حالت کی طرف حکومت کو متوجہ کیا گیا تھا اور فوجوں کی قیادت اجنبی جنرلوں کے ہاتھ میں چھوڑ دینے کی مخالفت کی گئی تھی؛ نیز اس پر بھی زور دیا گیا تھا کہ فوجوں کی از سرِ نو تنظیم اور ترتیب بہت ضروری ہے۔ موجودہ حالات سے برداشتہ خاطر ہوکر مصطفٰی کمال نے دوبارہ اپنا استعفا پیش کیا، لیکن منظور نہیں ہوا اور پھر انھیں دوسری فوج کا کمانڈر بنا دیا گیا؛ لیکن مصطفٰی کمال نے یہ عہدہ بھی نامنظور کیا اور رخصت لے کر اکتوبر ۱۹۱۷ء میں استانبول چلے گئے۔ ادھر فلسطین میں وہی ہوا جس کی مصطفٰی کمال نے پیش گوئی کی تھی؛ جنرل فاکن ہائن کو اپنی مہم میں ناکامی کا سامنا ہوا اور اس طرح مصطفٰی کمال کی فوجی بصیرت کی مزید تصدیق ہوگئی۔

کچھ عرصے بعد قیصرِ جرمنی سلطان سے ملنے قسطنطینیہ آیا اور سلطان نے ملاقات بازدید کے لیے ولی عہد سلطنت شہزادہ وحید الدین کو جرمنی بھیجا۔ مصطفٰی کمال کو بھی ان کے ہمراہ جانا پڑا (۱۵ دسمبر ۱۹۱۷ء-۵ جنوری ۱۹۱۸ء)۔ جرمنی میں مصطفٰی کمال کو قیصر ولیم، جنرل ہنڈنبُرگ (Hindenburg) اور جنرل لوڈنڈراف (Ludendroff) سے ملنے کا موقع ملا اور ان ملاقاتوں سے مصطفٰی کمال کو یہ یقین ہوگیا کہ جنگ میں جرمنوں کی کامیابی ممکن نہیں ہے۔ جرمنی میں ان کی طبیعت ناساز ہوگئی اور انھیں قسطنطینیہ واپس آنا پڑا، یہاں ایک دو ماہ کے قیام کے بعد وہ بغرض علاج وی اَنا اور کارلزباد (Karlsbad) کو روانہ ہوگئے، اس اثنا میں جنرل فاکن ہائن کو اس کے عہدے سے برطرف کر کے جنرل لیمان کو فلسطین میں متعین کیا گیا اور کچھ عرصے بعد، یعنی ۵ جولائی ۱۹۱۸ء کو، سلطان محمد رشاد کا انتقال ہوگیا اور وحید الدین ان کی جگہ تخت نشین ہوے۔ مصطفٰی کمال کو یورپ سے قسطنطینیہ واپس بلایا گیا اور فلسطین میں دوبارہ انھیں ساتویں فوج کا کمانڈر بنایا گیا (۷ اگست ۱۹۱۸ء)۔ ساتویں فوج اس وقت نابلُس اور شریہ نہر کے مابین متعین تھی۔ اس کے داہنے بازو پر آٹھویں فوج، بائیں جانب شریہ نہر اور پشت پر چوتھی فوج تھی۔ انگریزوں نے بڑی تیّاری کے بعد پہلے ساتویں فوج پر حملہ کیا، لیکن منہ کی کھائی۔ پھر وہ آٹھویں فوج پر حملہ آور ہوے اور اسے شکست دینے میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس طرح مصطفٰی کمال کی ساتویں فوج کا داہنا بازو کھل گیا اور اسے نرغے میں گھر جانے کا اندیشہ پیدا ہوگیا۔ پسپائی صرف شریہ نہر کی جانب ممکن تھی اور اس پر کوئی پل نہیں تھا؛ اس لیے مجبوراً مصطفٰی کمال کو درعہ کا رخ کرنا پڑا۔ درعہ سے وہ شام کے مقام کسوہ کی طرف آئے اور پھر فوجوں کو از سرِ نو اطمینان سے ترتیب دینے کے خیال سے رأق کی سمت ہٹ آئے۔ عربوں کی مدد سے انگریزوں نے ۳۰ ستمبر ۱۹۱۸ء کو شام (دمشق) پر قبضہ کرلیا۔ اب ترکی فوجوں کا مرکز حلب مقرر ہوا۔

اسی زمانے میں جرمنوں کے حلیف بلغاریا نے ہتھیار ڈال دیے (۲۹ ستمبر ۱۹۱۸ء) اور اس طرح ترکی کا جرمنی اور آسٹریا سے آمد ورفت کا خشکی کا راستہ مسدود ہوگیا۔ اس واقعے سے ترکی میں ایک سیاسی بحران رونما ہوگیا؛ چنانچہ طلعت پاشا کی وزارت مستعفی ہوگئی اور توفیق پاشا کو نئی وزارت بنانے کا کام سپرد ہوا۔ مصطفٰی کمال نے اس دوران میں یہ کوشش کی کہ نئی وزارت میں فتحی بے، تحسین بے، رؤف بے، جان بولات (Canbolal) [جانبلاط؟]، عظمی بے، شیخ الاسلام خیر الدین افندی اور خود انھیں شامل کیا جائے؛ چنانچہ اس غرض سے انھوں نے سلطان کو تار دیا۔ اس کے جواب میں انھیں عزت پاشا ناظر حرب کا تار ملا کہ انھیں وزارت میں شامل کرلیا گیا ہے۔ اب مصطفٰی کمال کو کام کرنے کا زیادہ موقع ملا اور انھوں نے عصمت پاشا اور علی فؤاد پاشا کے ساتھ مل کر ترکی فوجوں کی از سرِ نو ترتیب وتنظیم شروع کردی۔ ادھر انگریزوں نے بیروت سے بڑھ کر حلب اور اسکندرونہ پر یورش کردی اور عربوں کی معاونت سے وہ حلب میں داخل ہوگئے۔ اگرچہ شہر کے گلی کوچوں میں ان کی بہت سخت مزاحمت کی گئی لیکن ساتویں فوج پسپا ہونے پر مجبور ہوگئی اور ۲۶ اور ۲۷ اکتوبر کی درمیانی رات کو اس نے شہر کو چھوڑ دیا۔ ترکوں کی انگریزوں سے یہ آخری بڑی جنگ تھی اور اسے ان کی قومی آزادی کی پہلی جنگ کہا جاسکتا ہے؛ اس لیے کہ اس کے بعد جو واقعات رونما ہوے وہ ان تجاویز کے ممدّ ومعاون ہوتے رہے جو مصطفٰی کمال نے حرّیت وطن کے متعلّق سوچی تھیں۔

۳۰ نومبر ۱۹۱۸ء کو موندروس (Mondros) کا متارکۂ جنگ طے پایا اور اس کی رُو سے جرمن فوجوں کو ترکی سے خارج کردیا گیا۔ اب مصطفٰی کمال ''یلدِرِم اردوگروپ'' کے کمانڈر مقرر ہوے اور اس فوج کی قرارگاہ (ہیڈکوارٹرز) اَدنہ (Adana) کی طرف روانہ ہوگئے اور وہاں جا کر انھوں نے فان لیمان سے عہدے کا چارج لے لیا۔ مصطفٰی کمال کو چارج دیتے وقت فان لیمان نے ان کی فوجی قابلیت اور جنگی مہارت کو بہت سراہا اور کہا کہ ''آج سے میں یلدرم گروپ کی کمان ایک قابلِ فخر اور بہت سی جنگوں میں امتیاز حاصل کرنے والے شخص، یعنی

حضرت مصطفٰی کمال، کو سپرد کرتا ہوں''۔ مصطفٰی کمال نے اب اپنی تمام تر کوشش دو باتوں کی جانب مبذول کی: ایک تو انگریزوں کے ناجائز مطالبات کی مخالفت اور حدودِ ملّیہ کو برقرار رکھنے میں، دوسرے موصل کی چھٹی فوج کو اور دوسری پراگندہ فوجوں کو یکجا کرنے اور ان کا نظم ونسق درست کرنے میں۔ استانبول کی حکومت چاہتی تھی کہ بلدرم اردو اور ساتویں فوج کی کمان توڑ کر مصطفٰی کمال کو نظارت حربی کے ماتحت رکھ دیا جائے (۷ نومبر ۱۹۱۸ء)۔ مصطفٰی کمال تعمیلِ حکم سے روگردانی نہ کر سکتے تھے، لیکن ان کی کوشش سے اس فوج کا نام باقی رہا اور ان کی اناطولیہ (ترکی: Anadolu) میں رہنے کی خواہش بھی پوری ہوگئی؛ لیکن چند روز بعد عزت پاشا مستعفی ہوگئے (۱۴ نومبر ۱۹۱۸ء) اور توفیق پاشا نئے وزارت مرتّب کی۔ اس زمانے میں مصطفٰی قسطنطینیہ آئے اور انھوں نے مجلس مبعوثین میں شرکت کی؛ وہ سلطان سے بھی ملے (۲۲ نومبر ۱۹۱۸ء)۔ سلطان کی گفتگو سے انھیں یہ اندازہ ہوا کہ انھیں فوجی بغاوت کا اندیشہ ہے۔ استانبول میں عام طور پر ایک انتشاری کیفیت طاری تھی۔ پانچ پانچ دس دس آدمیوں کی مختلف سیاسی جماعتیں ہوگئی تھیں اور سب نے اپنے علٰیحدہ علٰیحدہ پروگرام بنا رکھے تھے۔ انجمن اتحاد وترقی کی مخالفت زوروں پر تھی اور داماد فرید پاشا کی جماعت ''حریت اوائتلاف فرقہ سی'' کو سب سے زیادہ قوت واقتدار حاصل تھا۔ علاوہ ازیں جگہ جگہ ''مدافعۂ حقوق ملیہ سی'' کے نام سے جماعتیں موجود تھیں۔ مصطفٰی کمال پیرا پلاس (Perapalas) کے ایک ہوٹل میں مقیم تھے اور یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے۔ پھر انھوں نے شیشلی (Şişli) میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا، جو اب ''استانبول شہری اتاترک موزہ سی'' کے نام سے مشہور ہے۔ مصطفٰی کمال کا یہ گھر جلد ہی مجادلۂ ملّی کا مرکز بن گیا۔ یہاں ان کے ہم خیال احباب کا مجمع رہتا تھا اور آپس میں مبادلۂ خیالات ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں انھوں نے ''ضابط و کماندان له حسب حال'' نام کی چھوٹی سی کتاب کو، جسے انھوں نے ۱۹۱۴ء میں صوفیا میں ملٹری اتاشی ہونے کی حالت میں لکھنا شروع کیا تھا، مکمل کر کے شائع کیا۔ فوجی چالوں پر یہ ایک قابلِ قدر تصنیف سمجھی جاتی ہے۔

مصطفٰی کمال نے ملک کی فلاح وبہبود کی جو تدابیر سوچی تھیں وہ اسی زمانے میں انھوں نے عصمت پاشا پر ظاہر کیں اور عصمت پاشا نے ان کی مکمل تائید کی۔ استانبول کی منفی سیاست سے وہ دل گرفتہ ہو چکے تھے اور اناطولیہ جانا چاہتے تھے۔ آخر ۳۰ اپریل ۱۹۱۹ء کو نویں فوج (بعد کو دسویں فوج) کے دستوں (قطعات) کے مفتّش مقرّر ہوے اور سیواس، وان اور طربزون (ترکی: Trabzon) کا علاقہ انھیں سپرد کیا گیا، یہاں پہنچ کر وہ قرارگاہ کی تشکیل اور کارآمد ساتھیوں کی تلاش میں مشغول ہوگئے۔ استانبول چھوڑنے سے پہلے ایک ضیافت میں ان کی داماد فرید پاشا سے ملاقات ہوئی۔ وہاں جواد پاشا رئیس ارکان حربیہ عمومیہ بھی موجود تھے۔ انھوں نے مصطفٰی کمال سے سوال کیا کہ ''کمال! تم کچھ کر سکتے ہو؟'' اس کا انھوں نے فوراً یہ جواب دیا کہ ''ہاں آفندم! میں کچھ کر کے دکھاؤں گا''۔ اس ملاقات کے دوسرے ہی دن خبر ملی کہ یونانیوں نے ازمیر (سمرنا) پر حملہ کر دیا ہے (۱۵ مئی ۱۹۱۹ء)۔ مصطفٰی کمال نے فوراً ارکانِ نظارتِ حربیہ کو تار دیا کہ ''صبر وتحمل سے کام لو''۔ یہ ان کا رخصتی پیغام تھا۔ ۱۶ مئی کو وہ سلطان سے بھی ملے، جسے انھوں نے بہت مایوس پایا۔ محل شاہی کے گرد جو برطانوی زرہ پوش گاڑیاں متعین تھیں ان کی طرف اشارہ کرتے ہوے سلطان نے کہا: ''تم دیکھتے ہو مجھے تو ملّت اور مملکت کو رہائی دلانے کے تصوّر سے بہت تردّد کا سامنا ہو رہا ہے''۔ پھر ہاتھ بلند کر کے کہا: ''ان شاء اللہ ملت متنبہ اور بیدار ہوگی اور اس حالت کے رنج والم سے ہمیں اور خود اپنے آپ کو رہائی دلائے گی''۔ مصطفٰی کمال نے سلطان کو بہت تسلی وتشفّی دی اور غدّاروں سے ہشیار رہنے کی نصیحت کی۔

اس کے باوجود کہ ان دنوں سمندر کا راستہ بہت مخدوش تھا مصطفٰی کمال استانبول سے ایک چھوٹے سے دخانی جہاز (سٹیمر) میں ۱۹ مئی ۱۹۱۹ء کو مع اپنے ہمراہیوں کے خدا پر توکل کر کے روانہ ہوے اور سَمسُون بخیریت پہنچ کر اناطولیہ کی سرزمین میں داخل ہوگئے۔ اس وقت کی نازک حالت کا مصطفٰی کمال نے یوں نقشہ کھینچا ہے: ''عثمانلی حکومت کا حلیف گروپ جنگ میں مغلوب ہو چکا تھا۔ عثمانلی فوجیں چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں محصور تھیں۔ متارکۂ جنگ کی کڑی شرائط نافذ ہو چکی تھیں۔ خراب وخستہ ملّت کو دشمن کے رحم وکرم پر چھوڑ کر وہ لوگ جنھوں نے اسے جنگ کی آگ میں جھونک دیا تھا ملک سے فرار ہو گئے تھے۔ سلطان وحید الدین، جو منصب سلطنت وخلافت پر فائز تھے، محض اپنے تخت وتاج کی حفاظت میں مصروف تھے۔ داماد فرید پاشا کی وزارت سلطان کے حکم اور مرضی کے تابع تھی اور اپنے عہدوں اور جانوں کی محافظت کی تدابیر سوچنے میں منہمک۔ فوجیوں کے پاس ہتھیار اور گولہ بارود مفقود ہو چکا تھا۔ اتحادی سلطنتیں ترکی کے حصّے بخرے کرنے کے لیے کوشاں تھیں اور دارالسلطنت میں ان کی فوجوں کا ہجوم تھا۔ اَدَنہ کی ولایت پر فرانسیسی قابض تھے، مَرعَش، عَینتاب اور عُرفہ پر انگریز، اَنطالیہ اور قونیہ میں اطالوی فوجیں موجود تھیں۔ مَرزِیفون اور سَمسُون میں بھی انگریزی سپاہی نظر آتے تھے۔ ہر سمت اجنبی ضابطہ، مامور اور جاسوس کارفرما تھے اور اب سے چار روز پہلے اتحادیوں کی شہ سے یونانیوں نے ازمیر (Izmir= سمرنا) پر قبضہ جما لیا تھا''۔ حکومت، سلطنت اور خلافت سب الفاظ بے معنی ہو چکے تھے، چنانچہ مصطفٰی کمال کے نزدیک ان سب مصائب سے رہائی کا ایک ہی طریقہ تھا، یعنی ایک نئی آزاد دولت ترکیہ کی تاسیس؛ اس لیے کہ بغیر آزادی کے زندگی قابلِ نفرت تھی اور غیروں کی حمایت میں خوشحالی بیکار۔ پس ترکی کے لیے دو ہی صورتیں ممکن تھیں۔ آزادی یا موت! اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر مصطفٰی کمال نے فوراً ضروری اقدامات شروع کر دیے۔

پہلا کام انھوں نے یہ کیا کہ حوضہ (Houza) میں امن امان اور آرام و سکون قائم کرنے کی سعی کی اور فوجی قائدوں اور آزادی کے لیے کوشاں جماعتوں کو صحیح صورتِ حال سے باخبر کیا۔ اس اثنا میں قسطنطینیہ میں ایک بڑی مجلسِ شوریٰ

طلب کی گئی، لیکن یہ مجلس کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکی۔ ادھر حکومتِ وقت نے یہ فیصلہ کر دیا کہ ترکی کو کسی بڑی سلطنت کی محافظت (Mandate) میں رکھ دیا جائے (۲۶ مئی ۱۹۱۹ء)۔ مصطفٰی کمال کو جب اس ارادے کی خبر ہوئی تو انھوں نے فوراً صدرِاعظم کو احتجاجی تار روانہ کیا۔ کچھ دن بعد پیرس کانفرنس میں شرکت کے لیے داماد فرید پاشا ترکی کے نمائندے کی حیثیت سے روانہ ہوگئے۔ مصطفٰی کمال برابر اس پر زور دیتے رہے کہ ترکی کی مکمل آزادی برقرار رکھنا چاہیے۔ حکومت سے ان کی مخالفت بڑھتی گئی اور آخر کار سرگرمیوں سے خائف ہوکر ناظرِ حرب کی طرف سے ان کی استانبول میں طلبی ہوئی، لیکن انھوں نے تعمیلِ حکم سے انکار کیا اور اپنی طرف سے ارض روم (ترکی: Erzurum) میں محبانِ وطن کی ایک کانگرس منعقد کی، جس میں حریت و آزادی کا پروگرام سوچا گیا اور ایک لائحۂ عمل مرتّب کر کے اسے اطرافِ ملک میں شائع کیا گیا۔ استانبول میں اپنے ہوا خواہوں اور رازدانوں کو بھی مصطفٰی کمال نے اس پروگرام سے مطلع کیا اور جگہ جگہ دورہ کر کے ملّی جماعتوں کی تشکیل کی۔ اس اثنا میں استانبول واپس آنے کے متعلّق انھیں حکومت کی طرف سے کئی تار ملے، لیکن انھوں نے ہر مرتبہ انکار کیا۔ ان کی اس سعی میں اِلاذِق (Elaziq) (لاذق؟) کے والی علی غالب بھی شریک ہوگئے۔ مصطفٰی کمال نے اناطولیہ اور رومیلیہ کے سپاہیوں کو بھی غیرت اور ہمت دلائی اور جب نظارتِ حربیہ اور سلطان کی طرف سے ان کی واپسی پر زیادہ اصرار ہوا تو انھوں نے ملازمت سے استعفا دے دیا اور یہ لکھا کہ ''جس عہدے پر میں مامور ہوں اس کے ساتھ اپنے عزیز اور مبارک عسکر سے بھی علٰیحدگی چاہتا ہوں'' اپنے اس فیصلے کی اطلاع انھوں نے سب لوگوں کو کر دی۔

بہت انتظام اور اہتمام کے بعد ارض روم میں ۲۳ جولائی ۱۹۱۹ء کو نئی تشکیل شدہ کانگرس کا پہلا باقاعدہ اجلاس ہوا اور مصطفٰی کمال متفقہ طور پر کانگرس کے صدر منتخب ہوے۔ اجلاس میں انھوں نے ایک فصیح و بلیغ تقریر کی اور ایک شورٰی ملّیہ کی تاسیس پر زور دیا۔ دوسری طرف داماد فرید پاشا کی جانب سے مصطفٰی کمال کے باغی ہونے کا اعلان کیا گیا۔ یہ کانگرس ۷ اگست ۱۹۱۹ء کو ختم ہوئی اور اس میں حسبِ ذیل اہم قراردادیں منظور ہوئیں: (۱) حدودِ ملّیہ کے اندر وطن ایک پوری چیز ہے، کسی طرح کی تقسیم قبول نہ ہوگی؛ (۲) اگر اجنبی مداخلت اور مخالفت کی وجہ سے عثمانلی حکومت معطل ہوجائے تو تمام ملت پورے اتفاق کے ساتھ مدافعت اور مقاومت کے لیے تیار ہوجائے گی؛ (۳) اگر مرکزی حکومت آزادی وطن کو برقرار رکھنے کے قابل نہ رہے تو اس مقصد کی تامین کے لیے ایک عارضی حکومت قائم کی جائے۔ اس حکومت کی تاسیس ملّی کانگرس کرے گی اور جب کانگرس کا اجلاس نہ ہو رہا ہو تو اس کی جگہ ایک منتخب ہیئت تمثیلیہ کام کرے گی؛ (۴) اس حکومت کی بنیاد قوۂ ملّیہ کے عامل اور ارادۂ ملّیہ کے حاکم ہونے پر ہوگی؛ (۵) یوروپی ممالک کے باشندوں کو ایسے حقوق قطعًا حاصل نہ ہوں گے جو سیاسی حاکمیت اور موازنۂ اجتماعی میں خلل انداز ہوں؛ (۶) کوئی ''مانڈیٹ'' یا حمایت قبول نہ کی جائے گی؛ (۷) سب مبعوثین کانگرس ملّی کے فوری اجلاس اور مفادِ ملّی کا خیال رکھتے ہوے کاروبار حکومت کو انجام دینے کی سعی کریں گے۔

ان قراردادوں کے مطابق ہیئتِ تمثیلیہ قائم کر دی گئی اور اس کے صدر بھی مصطفٰی کمال منتخب ہوے۔ مصطفٰی کمال نے دوسری فوج کے کمانڈروں کو اپنے ساتھ ملا کر انھیں ذمہ دار عہدوں پر مامور کر دیا۔ اس کے بعد کانگرس کا اجلاس سیواس میں ہوا اور اس میں بھی مصطفٰی کمال نے ایک مؤثّر اور زوردار تقریر کی۔ رومیلیہ اور اناطولیہ کی سب ''مدافعۂ حقوق'' جماعتوں کو ایک مرکز پر جمع کر دیا گیا اور تشکیلاتِ ملّی ملک کے ہر حصّے میں قائم ہوگئیں۔ اب استانبول کی حکومت کو مزید تشویش پیدا ہوئی اور علی غالب والیِ ایلا ذغ (ایلا ذق) کو مصطفٰی کمال کی گرفتاری کے خفیہ احکام بھیجے گئے؛ لیکن مصطفٰی کمال کی بیدار مغزی کے آگے علی غالب کی ایک نہ چلی اور وہ اناطولیہ سے فرار ہونے پر مجبور ہوگیا۔ مجلس کے نئے مبعوثین کا باقاعدہ انتخاب عمل میں آیا اور استانبول کی حکومت سے قطع تعلّق کا فیصلہ کر دیا گیا (۱۲ ستمبر ۱۹۱۹ء)۔ سیواس میں ایک اخبار ارادۂ ملّیہ کے نام سے جاری کیا گیا اور ۱۳ اور ۱۴ ستمبر ۱۹۱۹ء کی درمیانی رات کو سب فوجی افسروں کے نام اور والیوں کے نام احکام جاری کیے گئے کہ آئندہ وہ اپنے آپ کو صرف ہیئتِ تمثیلیہ کا تابع سمجھیں اور اس اقدام کی اطلاع کانگرس کی طرف سے سلطان کو بھی دے دی گئی۔

اسی زمانے میں جنرل ہاربورڈ (Harbord) کی سرکردگی میں ایک امریکی ہیئت سیواس میں آئی۔ جنرل ہاربورڈ نے مصطفٰی کمال سے پوچھا کہ ''اگر کانگرس اپنے مقصد میں ناکام رہی تو کیا ہوگا؟'' اس کا مصطفٰی کمال نے یہ پُرمغز جواب دیا کہ ''ہر قوم اپنے وجود اور آزادی کی تامین [ضمانت] کے لیے قابلِ تصوّر تدابیر اختیار کرتی ہے اور اس کے بعد وہ کامیاب ہوتی ہے؛ اگر کامیاب نہ ہو تو گویا وہ قوم مر چکی ہے اور اسے مردہ تصوّر کرنا چاہیے؛ اس لیے جب تک کوئی زندہ ہے اور اس کی سعی جاری ہے اس کی ناکامی پر بحث مناسب نہیں ہے''۔

یکم اکتوبر ۱۹۱۹ء کو فرید پاشا کی وزارت مستعفی ہوگئی اور علی رضا پاشا نئے صدر مقرر ہوے۔ نئی حکومت سے مصطفٰی کمال نے مطالبہ کیا کہ وہ ارض روم اور سیواس کانگرس کو تسلیم کر لے۔ اس کے جواب میں علی رضا پاشا نے صالح پاشا کو دریافتِ حالات کے لیے اناطولیہ روانہ کیا؛ اماسیہ (Amasya) میں ان کی مصطفٰی کمال سے ملاقات ہوئی اور آپس میں یہ شرائط طے ہوئیں (۱) مرکزی حکومت اور تشکیلاتِ ملّی میں اتفاق رہے گا اور آئندہ کوئی مناقشت نہ ہوگی؛ (۲) وکلاے ملّت کا انتخاب آزادانہ اور بلا کسی مداخلت کے ہوگا؛ (۳) مرکزی حکومت کے موافق یا مخالف کوئی چیز نہ لکھی جائے گی؛ (۴) سیواس کانگرس کی قراردادیں، بشرطیکہ مجلسِ مبعوثین انھیں قبول کر لے، اساسی اعتبار سے درست سمجھی جائیں گی؛ (۵) چونکہ فی الحال استانبول میں امن و امان نہیں ہے اس لیے مجلسِ ملّی کا پہلا اجلاس وہاں نہیں ہوگا؛ لیکن علی رضا پاشا آخری شرط ماننے کو تیار نہ تھے اور مصالحت کے خیال سے مصطفٰی کمال مجلسِ ملّی کے قسطنطینیہ میں افتتاح پر راضی ہوگئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ

وہاں مجلسِ ملّی اور ہیئتِ تمثیلیہ کا ایک متّحدہ اجلاس ہوا اور (۲۹ اکتوبر ۱۹۱۹ء) اس میں شرکت کے لیے مصطفٰی کمال ارض روم کی طرف سے وکیلِ ملّت منتخب ہوے۔

۶ نومبر ۱۹۱۹ء کو سیواس میں کانگرس کا اجتماع ہوا۔ اس میں کچھ اہمّ قرار دادیں منظور ہوئیں، جن میں خاص طور پر قابلِ ذکر یہ تھی کہ اگر صلح پیرس کی شرائط کو حکومت اور مجلسِ ملّی منظور کرلے اور ملّت و ملک کے مفاد کو پسِ پشت ڈال دے تو اس نظام نامے پر عمل کیا جائے گا جو لوگوں کی خواہش کے مطابق بنایا گیا ہے۔ اسی اثنا میں ہیئتِ تمثیلیہ کا مرکز سیواس سے انقرہ میں، جو زیادہ محفوظ اور مرکزی مقام تھا، منتقل کر دیا گیا (۱۸ دسمبر ۱۹۱۹ء) اور مصطفٰی کمال نئے مرکز کی سمت سرکش، قیصریہ اور قیر شہر کے راستے روانہ ہوے۔ قیر شہر میں نوجوانوں کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوے انھوں نے جدید نظریۂ حکومت یعنی قوۂ ملّیہ عامل ارادۂ ملّیہ حاکم کی تشریح کی اور اس پر عمل کرنے پر زور دیا اور رات کو ایک جشنِ عام میں لوگوں کو مخاطب کر کے کہا: ''اس ملّت میں پیدا ہونے والے ایک کمال (یعنی مشہور شاعر نامق کمال بے) نے کہا تھا کہ 'وطن کے گلے پر دشمن نے اپنا خنجر رکھ دیا ہے، اس سیہ بخت ماں کو نجات دلانے والا کوئی بھی نہیں' ('وطنک باشینہ دشمن طیادی خنجرینی یوق ایمش قورتارہ جق بختی قرہ مادرینی')۔ اب اسی ملّت میں پیدا ہونے والا کمال کہتا ہے کہ 'وطن کے گلے پر دشمن نے اپنا خنجر رکھ دیا ہے، ضرور اس سیہ بخت ماں کو رہائی دلانے والا کوئی مل جائے گا' ('البتّہ بولنور قورتارہ جق بختی سیہ مادرینی')''۔ قیر شہر سے وہ ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو جمعرات کے دن دو بجے پہلی مرتبہ انقرہ میں داخل ہوے اور وہاں کے زراعتی سکول کی عمارت میں اپنا دائرہ (دفتر) قائم کیا۔ اس طرح ۲۷ دسمبر سے انقرہ مجادلۂ ملّی کا محور اور حکومتِ ملّی کا مرکز بن گیا۔ اَنقرہ میں انھوں نے حاکمیت ملیہ نامی ایک جریدہ (گزٹ) جاری کیا (۱۰ جنوری ۱۹۲۰ء)۔ اسی اثنا میں عصمت پاشا استانبول سے آ کر ان کے شریک کار بنے۔

اَنقرہ پہنچ کر مصطفٰی کمال نے میثاقِ ملّی کی تشکیل شروع کی۔ ابھی تک استانبول کی مجلسِ ملّی سے بالواسطہ تعلّق قائم تھا، لیکن اس شہر کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ ہر چیز میں اتحادیوں کی مداخلت بڑھتی جا رہی تھی، اس لیے مصطفٰی کمال مجلسِ ملّی کا اجلاس اَنقرہ میں کرنا چاہتے تھے۔ پیرس اور سیورے (Sevrés) کے معاہدوں کے بعد اتحادیوں کا تشدّد اور بڑھ گیا تھا، ادھر یونانیوں کی دراز دستی ترقی پر تھی اور انزاور نے بھی شورش برپا کر رکھی تھی۔ ترکی حکومت کی بار بار درخواستوں کے باوجود اتحادی یونانیوں کی روک تھام کرنے سے انکار کرتے رہے؛ نتیجہ یہ ہوا کہ علی رضا کی وزارت مستعفی ہوگئی۔ مصطفٰی کمال کی کوشش کی وجہ سے داماد فرید پاشا صدر نہ بن سکے بلکہ صالح پاشا نے نئی وزارت بنائی۔ اس اثنا میں پیرس کی مجلس اقوام کی جانب سے قسطنطینیہ پر رسمی طریقے سے قبضہ کرلیا گیا، اتحادی کمشنروں نے قوم پرست وکلاے مجلس کو برطرف کر دیا اور اتحادی کمانڈر نے طرح طرح کی سختیاں شروع کیں۔ ان سب باتوں کی اطلاع مصطفٰی کمال کو مناستر کے حمدی آفندی کے ذریعے ملی اور انھوں نے ملک بھر میں ان کی اشاعت کی۔ اس کے بعد انھوں نے تمام بیرونی ملکوں سے اناطولیہ کا قطع تعلّق کرلیا اور فرانس، اٹلی اور انگلستان کے وزراے خارجہ کو احتجاجی تار روانہ کیے۔ مجلس ملّی کو باقاعدہ انقرہ میں قائم کر دیا گیا اور فوزی پاشا اور عصمت پاشا (جو کسی کام سے استانبول چلے گئے تھے) انقرہ آ گئے۔ عصمت پاشا نے انقرہ کی مجلس میں اِدرنہ ملت وکیل کے طور پر شرکت کی۔ ادھر داماد فرید پاشا پھر استانبول میں صدرِ اعظم بننے میں کامیاب ہوگئے اور انھوں نے انقرہ کی نئی حکومت کے خلاف زور شور سے پروپیگنڈا شروع کر دیا اور علما سے مصطفٰی کمال کے خلاف فتوے لے کر شائع کیے گئے؛ مجلس مبعوثین کو فسخ کر دیا گیا (۱۱ اپریل ۱۹۲۰ء) اور قوۂ انضباطیہ کے نام سے استانبول میں ایک مخالف فوج کی تشکیل کی گئی۔ ان سب کارروائیوں کے جواب میں مصطفٰی کمال نے بھی ضروری تدابیر اختیار کیں۔ اناطولیہ کے ۱۵۰ علما سے استانبول کی حکومت کے خلاف ایک فتوٰی حاصل کیا، یونانیوں کو روکا اور اَنقرہ میں بیوک [یا بویوک؛ جدید رسم الخط میں Büyük، بمعنی اَعظم، اعلٰی] ملّت مجلسی کے افتتاح کی تیاری شروع کر دی۔ اس مجلس کا افتتاح بہت شاندار طریقے پر ۲۳ اپریل ۱۹۲۰ء کو عمل میں آیا اور اس میں صدرِ مجلس نے اعلان کیا کہ اب سے یہی مجلس ترکی حکومت کی تنہا ذمّہ دار ہے۔ افتتاحی جلسے میں تقریر کرتے ہوے مصطفٰی کمال نے ان باتوں کو واضح کیا: (۱) نئی حکومت بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؛ (۲) خواہ عارضی طور پر کیوں نہ ہو حکومت کے لیے ایک رئیس یا سلطان کا قائم مقام بنانے کی ضرورت؛ (۳) بیوک مجلس کے مقابلے میں کسی اَور حکومت کو تسلیم نہ کیا جائے گا؛ (۴) ایک چھوٹی مجلس (مع ایک صدر) کے قیام کا لزوم؛ (۵) جب سلطان اور خلیفہ آزاد ہو جائیں گے تو بیوک مجلس کے وضع کردہ قوانین دائرۂ اساس (constitution) کی حیثیت حاصل کرلیں گے۔ مصطفٰی کمال بیوک مجلس کے پہلے صدر منتخب ہوے۔ عارضی طور پر سات آدمیوں پر مشتمل ایک اِجراء ہیئتی (ایگزیکٹو کونسل) بنا دی گئی، جس میں عصمت پاشا بھی بحیثیت ارکانِ حربیہ عمومیہ شریک تھے۔ علاوہ ازیں ایک لائحہ انجمنی [مقنّنہ] (Legislative Assembly) بھی بنائی گئی۔ مصطفٰی کمال ان دونوں میں شامل تھے۔

۱۱ مئی ۱۹۲۰ء کو ماسکو کی طرف ایک ترکی وفد روانہ کیا گیا اور فرانسیسیوں سے بھی گفت و شنید شروع کی گئی۔ استانبول کی حکومت نے اس اثنا میں مصطفٰی کمال کے قتل کا حکم جاری کر دیا تھا (۱۱ مئی ۱۹۲۰ء)، لیکن مصطفٰی کمال نے اس کی کچھ پروا نہ کی اور اپنا کام جاری رکھا۔ مشرق میں ارمنیوں نے سرکشی اختیار کر رکھی تھی، جن کی سرکوبی کے لیے جنرل کاظم قرابکو کو قارص (Kars)، اَرْدَہان (Ardahan) اور اَرتوِین (Artvin) کے اضلاع کی کمان دے کر روانہ کیا گیا۔ استانبول کی حکومت نے مجبوراً سیورے کی ناموافق شرائط کو منظور کرلیا تھا اور یونانیوں نے ۲۲ جون ۱۹۲۰ء کو صالح لی، آق حصار، سُوما (Suma)، آیدین (Aydin)، نازِلّی (Nasilli) کے محاذ پر پیش قدمی شروع کر دی، ان کے مقابلے کے لیے بیوک

مجلس نے بیسویں کور (Corps) کے کمانڈر علی فُواد کو نامزد کیا۔ ۳۰ جون کو یونانیوں نے بالق حصار پر قبضہ کرلیا۔ ۸ جولائی کو وہ بروسہ میں داخل ہوگئے اور تِکِرْ داغ کی طرف بڑھ کر ترکی فوجوں کو بلغارستان کی طرف دھکیلنے میں کامیاب ہوگئے۔ ترکی سپاہیوں کے ہتھیار چھین لیے گئے اور تراکیہ (Tarakya) پر بھی یونانی قبضہ ہوگیا (۲۰-۲۷ جولائی ۱۹۲۰ء)۔ ان واقعات کی وجہ سے بعض لوگوں نے مصطفٰی کمال پر بیوک مجلس کے اجلاس میں اعتراضات کیے، لیکن مصطفٰی کمال نے انھیں صورتِ حال سے واقف کرتے ہوے یوں تسلی وتشفی دی کہ ہماری مملکت کے اگر ایک نہیں سب علاقے بھی ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں اور نذرِ آتش ہوجائیں تو ہم اس سرزمین کی کسی پہاڑی پر چڑھ کر برابر مدافعت کرتے رہیں گے؛ لیکن باوجود مصطفٰی کمال کے اطمینان دلانے کے بعض لوگوں نے ''ریشیل اردو'' (فوج سبز) کے نام سے ایک نئی فوج بنانے کی کوشش کی، اگرچہ اس میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ یونانیوں نے صالح لی سے بڑھ کر ۲۶ اگست کو عُشّاق پر بھی قبضہ کرلیا اور آیدین سے پیش قدمی کرکے نازِلْلی تک پہنچ گئے، بلکہ ان کی فوج کا ایک دستہ گِدی (Gedi) تک بڑھ آیا۔ مصطفٰی کمال یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور اپنی تیاریوں میں مصروف تھے۔ سب سے ضروری کام سامانِ حرب کی فراہمی تھا۔ اتحادی بیڑے کی آنکھوں میں خاک جھونک کر وہ انبولو کے راستے سَمسُون پہنچے اور وہاں فوجوں کو مجتمع کرنا شروع کیا۔ مجادلۂ ملّی کا یہ سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ اُدھر پیرس کانفرنس میں جو عثمانلی نمائندے شریک ہوے تھے انھوں نے سیورے کی شرائطِ صلح کو منظور کرلیا اور سلطان کے ایما سے شورٰیِ سلطنت نے بھی ان کی تصدیق کردی، لیکن بیوک مجلس نے ان شرائط کو ماننے سے صاف انکار کردیا۔

مصطفٰی کمال نے ترکی حدود کی حفاظت کے لیے جو میثاقِ ملّی مرتّب کیا تھا اس کی رُو سے اَرمینیہ سے جنگ کرنا پڑی۔ اس جنگ میں ۲۸ ستمبر ۱۹۲۰ء کو ترکوں کو فتح حاصل ہوئی اور ساری قمیش (Sarikamiş)، قارص اور گومرو (Gümrü) پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو ارمنیوں نے صلح کی درخواست کی اور اس طرح جو صلح نامہ تیار ہوا وہ ترکی قومی حکومت کا پہلا معاہدۂ صلح تھا۔ اس کی رُو سے ۱۷۷۷-۱۷۷۸ء کی ترکی حدود دوبارہ قائم ہوگئیں۔ جب انگریزوں نے باطوم کو ۱۹۲۰ء میں خالی کیا تو اس شہر پر گرجی قابض ہوگئے تھے۔ ۲۳ فروری ۱۹۲۰ء کو اَنقرہ کی حکومت نے گرجیوں کو اس شہر کے خالی کردینے کا الٹی میٹم دے دیا اور باطوم کے علاوہ اردَہان اور اَرْتوِین کا علاقہ بھی ترکوں کے تصرُّف میں آگیا۔ یکم اگست ۱۹۲۰ء کو گرجیوں اور روسیوں سے معاہدے کی بات چیت شروع ہوئی۔ اس گفتگو سے دو ماہ قبل موسیو شِچرین (Chicherin) نے ترکی میثاقِ ملّی کو تسلیم کرلیا تھا (۳ جون ۱۹۲۰ء)۔ ۲۴ اگست کو معاہدہ مکمل ہوگیا، اگرچہ اس کی باقاعدہ منظوری ۱۶ مارچ ۱۹۲۱ء کو ہوئی۔ یہ معاہدہ مصطفٰی کمال کی پہلی بڑی خارجی سیاسی کامیابی تھی۔ اس کی بدولت ۱۷۷۷-۱۸۷۸ء کی ترکی حدود دوبارہ قائم ہوگئیں اور ترکی کو ایک طاقتور ہمسایہ ملک کی دوستی حاصل ہوگئی۔

اب ایک انجمن ''حقوق اساسیہ'' قائم کی گئی، جس کا کام یہ تھا کہ بیوک مجلس کی شکل و ماہیت کے متعلّق قانونی مواد تیار کرے اور استقلال خلافت وسلطنت اور استحصال وطن وملت کا پروگرام بنائے۔ اس سلسلے میں مصطفٰی کمال نے ۲۵ ستمبر ۱۹۲۰ء کو مجلس کے ایک اجلاس میں تقریر کی اور خلافت وسلطنت کے مسئلے کو فی الحال معلّق رکھنے کا مشورہ دیا۔ ۲۰ جنوری ۱۹۲۱ء کو مجلس نے فیصلہ کیا کہ حاکمیت بلا قید وشرط ملّت کا حق ہے اور صرف بیوک مجلس ہی ملک میں حکومت کرسکتی ہے۔ اس دوران میں دشمنوں کی مخالفانہ سرگرمیاں برابر جاری تھیں؛ چنانچہ ایک ہندوستانی جاسوس مصطفٰی صغیر بھی اس سلسلے میں اَنقرہ پہنچا، لیکن مصطفٰی کمال اسے پہلی ہی ملاقات میں بھانپ گئے۔ اسے گرفتار کرلیا گیا اور اَنقرہ کے محکمۂ استقلال کے فیصلے کے مطابق اسے سزاے موت دی گئی۔ اسی اثنا میں ایک فوجی سردار ادہم چرکس نے سرکشی اختیار کی اور ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو کوتاہیہ میں بغاوت کردی۔ عصمت پاشا، جو علی فُواد کی جگہ سپہ سالار مقرر ہوے تھے، اس کی سرکوبی کے لیے متعیّن ہوئے اور ادہم چرکس کو بھاگنا پڑا۔ ۲۲ نومبر کو استانبول میں فرید پاشا پھر مستعفی ہوگئے اور توفیق پاشا دوبارہ منصب صدارت پر فائز ہوے، انھوں نے مصطفٰی کمال کی حکومت سے مصالحت کی کوئی سبیل نکالنے کے لیے ناظرِ داخلیہ عزت پاشا اور ناظرِ بحریہ صالح پاشا کو اَنقرہ روانہ کیا، لیکن کوئی مفید نتیجہ مرتّب نہ ہوسکا اور وہ دونوں ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو واپس قسطنطینیہ چلے گئے۔

چرکس ادہم عصمت پاشا سے شکست کھا کر یونانیوں کے پاس بھاگ گیا تھا۔ اِسکی شہر (Eskishahir) سے یونانیوں نے بروسہ اور عشاق (Usak) کی استقامتوں (ضلعوں) سے اِسکی شہر اور اَفْیون (Afyon) کی سمت پیش قدمی شروع کی اور بڑھتے ہوے وہ اینونُو (Inonü) اور دُملو پنار (Dumlupinar) تک آپہنچے؛ لیکن اب ترک فوجیں ان کے مقابلے کے لیے تیار ہوچکی تھیں، چنانچہ عصمت پاشا کی قیادت میں اینونُو کی پہلی جنگ (۱۰ جنوری ۱۹۲۱ء) میں انھیں سخت ہزیمت اٹھانا پڑی اور وہ بروسہ کی طرف پسپا ہوگئے۔ ترکوں کی اس کامیابی کا بیرونی ممالک پر بہت اچھا اثر ہوا۔ اٹلی اور فرانس میں ان کے بہت سے ہمدرد پیدا ہوگئے اور لنڈن کانفرنس میں انقرہ کی حکومت کے نمائندوں کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ ترکی وفد کی قیادت بکر سامی نے کی۔ چونکہ ترک اس بات پر مصر تھے کہ تمام اناطولیہ کا تخلیہ ہو اور یونانی اس پر راضی نہ تھے، اس لیے دس دن بعد ترک نمائندے واپس آگئے اور جنگ پھر چھڑ گئی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۲۱ء کو دوبارہ یونانی اینونُو اور افیون کی طرف بڑھے، لیکن ۳۱ مارچ کو انھیں پھر ہزیمت نصیب ہوئی۔ اس فتح کی خوشی میں عصمت پاشا نے مصطفٰی کمال کو مبارکباد کا تار دیا اور انھوں نے جوابی تار میں عصمت پاشا اور ترکی فوجوں کو ان کی کارگزاری پر بہت بہت مبارکباد اور شاباش دی۔ لنڈن کانفرنس کی جو شرائط استانبول کی حکومت نے منظور کرلی تھیں انھیں انقرہ کی بیوک مجلس نے رد کردیا، اس شرط کے سوا جو انگریزی اور ترک قیدیوں کے تبادلے سے متعلّق تھی اور اناطولیہ اور رومیلیہ مدافعہ حقوق گروپ کی ازسرِنو تنظیم

عمل میں آئی اور دونوں کو آپس میں متحد کر دیا گیا۔ ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء کو یونانیوں نے کوتاہیہ (Kutahya)، اینونو وغیرہ کی طرف دوبارہ حملہ کیا اور سید غازی کی استقامت میں ترکی فوج پر یورش کر دی۔ مصطفٰی کمال نے ترکی فوج کو سَقاریہ (Sakarya) کی سمت بڑھنے کا حکم دیا (۲۵ جولائی ۱۹۲۱ء) اور ایک فوج اِسکی شہر کی جانب بھی روانہ کی۔ ترکی فوج کے بیشتر حصّے کو اس طرح دارالحکومت سے دور بھیج دینے سے بعض لوگوں کو شبہات اور اندیشے پیدا ہو گئے اور بیوک مجلس کے اجلاس میں مصطفٰی کمال کی کارروائی پر سخت تنقید کی گئی، لیکن آخر کار مجلس نے ان کے احکام کی منظوری دی۔ لوگ ان کے کمانڈر بننے پر بھی معترض تھے، لیکن مجلس نے اس کی بھی اجازت دے دی اور انھوں نے بہ نفسِ نفیس ۱۲ اگست ۱۹۲۱ء کو پُولا دلی میں فوجوں کی قیادت سنبھال لی۔ ۲۳ اگست ۱۹۲۱ء کو یونانی آگے بڑھے اور ترکی فوج سے خونریز معرکہ شروع ہو گیا۔ بائیس دن کی مسلسل جنگ کے بعد یونانیوں کو اس جنگ میں، جو جنگِ سقاریہ کہلاتی ہے، مکمل شکست ہوئی۔ عصمت پاشا نے اس جنگ میں بھی نمایاں حصّہ لیا اور ان کی جانبازی اور فوجی قابلیت کی مصطفٰی کمال نے بہت تعریف کی۔ اس فتح کی خوشی میں مجلس نے مصطفٰی کمال کو مشیر (مارشل) کا منصب عطا کیا اور غازی کا خطاب دیا (۱۹ ستمبر ۱۹۲۱ء)۔ اس فتح سے ترکی کی ساکھ اَور بڑھ گئی، جس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو سوویٹ روس، ارمنستان، گرجستان اور آذربیجان نے عہد نامۂ قارص پر دستخط کر دیے اور دوسرے فرانسیسی جنرل فرانکلن بویولون (Franklin Bouillon)، جس نے غیر رسمی طور پر اَنقرہ میں آ کر مصطفٰی کمال سے ملاقات کی تھی (۱۹ اپریل ۱۹۲۱ء)، کی سعی وسفارش سے ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو فرانس اور ترکی میں ایک ائتلاف نامے پر دستخط ہو گئے اور اس طرح اتحادی قوتوں کے ایک بڑے رکن نے ترکی میثاقِ ملّی کو تسلیم کر لیا۔ یہ مصطفٰی کمال کی ایک اَور بڑی سیاسی کامیابی تھی۔

اب مصطفٰی کمال نے یونانیوں کے خلاف آخری اور فیصلہ کن جنگ کی تیاری شروع کر دی اور بیوک مجلس نے انھیں مزید تین ماہ کے لیے فوجوں کی قیادت سپرد کر دی (۳۱ اکتوبر ۱۹۲۱ء)۔ مصطفٰی کمال اس زمانے میں ''پین اسلامزم'' اور ''پین تورانزم'' قسم کی جو تحریکیں شروع کی گئی تھیں ان کے سخت مخالف تھے اور ان کا واحد مقصد یہ تھا کہ ترکی کی حدودِ ملیہ کی محافظت کی جائے۔ ۲ جنوری ۱۹۲۲ء کو انھوں نے یوکرائن (Ukraine) سے بھی ایک معاہدہ کر لیا اور مخالفین کے علی الرغم ۴ فروری ۱۹۲۲ء کو پھر تین مہینے کے لیے ترکی فوج کے سپہ سالار مقرر ہوے۔ اس اثنا میں وزیرِ خارجہ یوسف کمال کو یونانیوں سے مزید گفتگو کے لیے لنڈن روانہ کیا گیا، لیکن شرائطِ صلح طے نہ ہو سکیں، اس لیے کہ ترکی اس پر بدستور مصر تھا کہ پورا اناطولیہ خالی کر دیا جائے۔ اس مسئلے پر مجلسِ اقوام کی وساطت سے بھی بات چیت ہوتی رہی، لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ حکومتِ انقرہ کا یہ مطالبہ بھی تھا کہ قسطنطنیہ کو واگزار کر دیا جائے۔ مصطفٰی کمال جانتے تھے کہ گفت وشنید سے کام نہیں چلے گا، اس لیے انھوں نے اپنی فوجی تیاریاں برابر جاری رکھیں اور بیوک مجلس میں بہت کچھ بحث ومباحثے کے بعد انھیں چوتھی بار سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ ادھر یونانیوں نے پھر دراز دستی شروع کر دی؛ ان کے زرہ پوش جہاز نے ۷ جون ۱۹۲۲ء کو سمسون پر گولہ باری کی اور مصطفٰی کمال کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ انھوں نے فوراً حملے کی تیاری شروع کر دی۔ سقاریہ کی شکست کے بعد دشمن کی فوجوں کا بڑا اجتماع افیون، قرہ حصار، دوملوپنار اور اِسکی شہر کے محاذ پر تھا۔ وہاں ان کی ۱۱۸ تمن (ایک لاکھ ۱۸ ہزار) فوج موجود تھی، حالانکہ ترکی فوج کی کل تعداد ۲۵ تمن تھی اور ان کے پاس گولہ بارود وغیرہ کی بہت کمی تھی۔ اسی اثنا میں انگریز جنرل ٹاؤن سنڈ (Townsend)، اناطولیہ آیا اور ۱۴ جولائی ۱۹۲۲ء کو اس کی مصطفٰی کمال سے ملاقات ہوئی۔ وہ ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا؛ چنانچہ ترکی سے واپسی پر اس نے کہا: ''میں آج تک کسی شخص سے اس قدر متاثر نہیں ہوا تھا۔ مصطفٰی کمال ایک عظیم ہستی ہیں''۔

آخر کار ۲۶ اگست ۱۹۲۲ء کو جمعہ کے مبارک دن مصطفٰی کمال نے اپنی فوجوں کو حملے کا حکم دے دیا اور اپنا کیمپ کوجہ تپہ (Kocatepe) میں قائم کیا۔ اس سے پہلے ۱۴ اگست کو انھوں نے اناطولیہ کا غیر ممالک سے تلغرافی سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ چار دن کے اندر ہی دشمنوں کے کئی مورچے تباہ کر دیے گئے اور اُن میں سے ایک بڑی تعداد مقتول یا اسیر ہوئی۔ یونانی جنرل (Trikopis) گرفتار ہو گیا اور ترکوں نے بھاگتے ہوے یونانیوں کا تعاقب شروع کیا۔ ۹ ستمبر ۱۹۲۲ء کو ترکی فوج اِزمیر (سمرنا) میں داخل ہو گئی اور اسی روز بروسہ میں بھی۔ اس طرح تین سال کے یونانی قبضے سے ترکی کی سرزمین آزاد ہو گئی اور ۱۰ ستمبر کو بیوک مجلس کی عمارت پر سے وہ سیاہ ماتمی نشان ہٹا دیا گیا جو اب تک لگا ہوا تھا۔ مصطفٰی کمال اسی روز فوزی پاشا کی معیت میں اِزمیر پہنچے اور Kramer Palas ہوٹل کے قریب ایک ڈاکٹر کے مکان میں مقیم ہوے۔ بعد ازاں وہ عشاق زادہ بے مُعَمر کے گیوز تپہ والے مکان میں منتقل ہو گئے اور انھوں نے ترکی فوج اور ترکی قوم کو مبارکباد کے پیغام بھیجے۔ اس موقع پر انھیں اِزمیر کی شہریت بھی عطا کی گئی۔ ترکوں کی ان کامیابیوں سے اتحادی ممالک میں کھلبلی مچ گئی اور لوزان میں صلح کانفرنس کے انعقاد کی تجویز کی گئی، جس میں استانبول اور انقرہ کی دونوں حکومتوں کو دعوتِ شرکت دی گئی؛ لیکن انقرہ کی حکومت نے استانبول کے نمائندوں کو بلانے پر اظہارِ ناراضی کیا اور اپنی جگہ یہ فیصلہ کر لیا کہ استانبول کی حکومت کو کالعدم قرار دیا جائے؛ چنانچہ ایک طرف تو وزیرِ خارجہ یوسف کمال کو لوزان روانہ کیا گیا اور دوسری طرف مصطفٰی کمال کی تحریک پر ''سلطنت عثمانی'' کے الغاء کی تجویز منظور کر لی گئی (یکم نومبر ۱۹۲۲ء)۔ اس طرح ۴ نومبر ۱۹۲۲ء کو استانبول کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ ۵ نومبر ۱۹۲۲ء کو عصمت پاشا ترکی وفد کے قائد کی حیثیت سے لوزان روانہ ہوے اور ۱۷ نومبر کو سلطان وحیدالدین انگریزی زرہ پوش جہاز ''ملایا'' میں مالٹا روانہ ہو گئے۔ منصبِ خلافت پر، جو ابھی تک باقی تھا، عبدالمجید افندی فائز ہوئے۔ خلیفہ کو تمام ملکی اور سیاسی اقتدار وقوت سے محروم کر دیا گیا۔ ۲۱ نومبر کو لوزان کانفرنس شروع ہو گئی اور ترکی مطالبات پر بحث وتمحیص ہوتی رہی۔ ادھر بعض حق ناشناس لوگوں نے

مصطفٰی کمال کی مخالفت شروع کی اور انھیں ''غیر ترک'' ٹھیرانے کی کوشش کی۔ مصطفٰی کمال کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنی ایک الگ پارٹی بنائیں، چنانچہ انھوں نے ''خلق فرقہ سی'' (People's Party) کے نام سے ایک جماعت قائم کی اور اخباری کانفرنس میں اس کے اغراض ومقاصد کی توضیح کی (۶ دسمبر ۱۹۲۲ء)۔ اناطولیہ اور رومیلیہ کی مدافعۂ حقوق جماعتوں کو اس نئی پارٹی میں ضم کر دیا گیا اور اس کے صدر مصطفٰی کمال منتخب ہوے۔ لوزان کانفرنس کے دوران میں عصمت پاشا برابر مصطفٰی کمال سے صلاح ومشورہ کرتے رہے اور وہ انھیں ہدایات بھیجتے رہے۔ ترکوں کے اس مطالبے پر کہ غیر ملکیوں کو جو مراعات (Sanctions) ترکی میں حاصل تھیں وہ منسوخ کر دی جائیں بہت بحث رہی۔ آخر کانفرنس کو ملتوی کرنا پڑا اور ترکی نمائندے واپس آ گئے۔ ۲۳ اپریل ۱۹۲۳ء کو کانفرنس پھر شروع ہوئی اور ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء کو عہد نامے پر دستخط ہو گئے۔ یہ سیاسی کامیابی اس فوجی فتح سے کسی طرح کم نہ تھی جو یونانیوں کے مقابلے میں حاصل ہوئی تھی۔ معاہدۂ سیورے کی ذلت آمیز شرائط کا خاتمہ ہو گیا اور ایک نئی اور جوان ترکی ملت وجود میں آئی۔

اگرچہ ۲۳ اپریل ۱۹۲۳ء کے بعد سے بیوک مجلس کی حکومت عملاً جمہوری نوعیت کی تھی، تاہم جمہوریت کا باقاعدہ اعلان ابھی نہ ہوا تھا۔ مجلس کے دوبارہ انتخابات کے بعد ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو ۱۰۱ توپوں کی گرج میں یہ اعلان بھی کر دیا گیا اور انقرہ دارالحکومت مقرر ہوا۔ جمہوریت کے پہلے صدر مصطفٰی کمال اور وزیر اعظم (باش باقان) عصمت پاشا منتخب ہوے۔ اب خلافت کے منصب کو بھی منسوخ کرنے کی تجویز بیوک مجلس میں پیش کی گئی اور مجلس کی طرف سے ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو خلافت کے خاتمے کے ساتھ ساتھ عثمانلی شاہی خاندان کے افراد کو ترکی سے خارج کرنے کا فیصلہ کر دیا گیا۔ غازی مصطفٰی کمال اب ملک کی اندرونی حالت کو درست کرنے کی طرف متوجّہ ہوے اور انھوں نے ترکی قوم کی فلاح اسی میں تصوّر کی کہ یورپی تہذیب کو اختیار کیا جائے۔ ان کے نزدیک اگرچہ ہر قوم ایک جدا حیثیت رکھتی تھی، لیکن مدنیّت کے اعتبار سے اُن میں یکسانیّت ضروری تھی اور بغیر اس کے ترکی زمانے کے دوش بدوش نہ چل سکتا تھا؛ چنانچہ انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ جمہوریت کے آئین سے وہ مدخارج کر دی جس کی رُو سے ترکی کا مذہب اسلام قرار دیا گیا تھا (۱۰ اپریل ۱۹۲۴ء) اور محاکم شرعیہ کا بندوبست بیوک مجلس سے علٰیحدہ کر دیا۔ پھر انھوں نے مدارس اور نصابِ تعلیم کی اصلاح شروع کی تاکہ انھیں مغربی اُصولوں پر تشکیل کیا جائے۔ پرانی وضع کے مدرسوں کو ختم کر دیا گیا۔ مجلس سے ناظر اُمورِ شرعیہ، ناظر اوقاف اور ناظر ارکانِ حربیہ عمومیہ کو علٰیحدہ کر دیا گیا۔ غیر مسلم مدارس میں بھی مذہبی تعلیم کی ممانعت ہو گئی اور صرف عقیدۂ توحید کی تعلیم کی اجازت دی گئی۔ ایک نیا قانونِ مدنیت نافذ کیا گیا، جس کی رُو سے عورتوں کا پردہ اٹھا دیا گیا اور انھیں مردوں کے مساوی حقوق دیے گئے اور میونسپل بورڈ کے رکن منتخب ہونے کا حق عطا کیا گیا۔ خود مصطفٰی کمال نے جب ۲۹ جنوری ۱۹۲۳ء کو سمرنا میں لطیفہ خانم سے شادی کی تو دولھا اور دُلھن دونوں محفلِ نکاح میں موجود تھے اور شادی کے بعد دونوں نے ایک ساتھ جگہ جگہ سفر کیا اور اس طرح ترکی معاشرے میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ اس کے علاوہ انھوں نے عورتوں اور مردوں کے مشترکہ کلب اور اجتماعات کی بھی ترغیب دی۔

مصطفٰی کمال کو لباس کی اصلاح کا خیال بھی پیدا ہوا۔ اس سلسلے میں پہلا قدم سلطان محمود ثانی کے زمانے میں اٹھایا گیا تھا جبکہ فوجی سپاہیوں کے لیے پتلون پہننا اور قاووق [بڑی سی روئی یا نمدے کی ٹوپی] کے بدلے فس (fez) کا استعمال لازمی قرار دیا گیا۔ مصطفٰی کمال نے سب لوگوں کو یورپی لباس پہننے اور برہنہ سر رہنے یا یورپی ٹوپی استعمال کرنے کا حکم دیا؛ چنانچہ وہ خود جب ۲۴ اگست ۱۹۲۵ء انقرہ سے قسطمون جا رہے تھے تو ننگے سر تھے اور ایک پانامہ ٹوپی ان کے ہاتھ میں تھی۔ ان کی اس ذاتی مثال کا یہ اثر ہوا کہ جب وہ اس سفر سے واپس آئے تو انقرہ میں انھیں بہت سے لوگ برہنہ سر یا یورپی ٹوپی پہنے نظر آئے۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۲۵ء کو بیوک مجلس نے باقاعدہ ''شاپقہ'' [از فرانسیسی Chapeaux، ٹوپی] کے استعمال کے متعلّق ایک قانون نافذ کر دیا اور فس، قلپاق کا پہننا جرم قرار دیا گیا۔ ترکی میں درویشوں اور فقیروں کا بہت زور تھا اور مصطفٰی کمال ان کو قومی ترقی کے راستے میں حارج سمجھتے تھے، اس لیے کہ ان کا کام لوگوں کو مجذوب یا ابدال، یا دوسرے الفاظ میں نکمّا اور بیکار بنانا تھا؛ چنانچہ انھوں نے ان کے قلع وقمع کی تدابیر اختیار کیں۔ بزرگوں کے مزاروں پر جانا اور دُعا مانگنا ممنوع قرار دیا گیا، کیونکہ بقول ان کے ''مرے ہووں سے مدد کی اُمید رکھنا ایک مدنی جمعیت کے لیے باعث عار ہے''۔ ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء کی ایک قرارداد کی رُو سے سب تکیوں اور زاویوں کو ختم کر دیا گیا اور پیری مریدی کا سلسلہ بند کیا گیا۔ کسی بھی مذہب کے دینی پیشواؤں کو اپنے عبادت خانوں میں کوئی مخصوص دینی لباس پہن کر جانے کی ممانعت کر دی گئی۔

ان معاشرتی اصلاحات کے بعد جن چیزوں کی جانب مصطفٰی کمال نے توجہ کی ان میں ایک تقویم [جنتری Calendar]، ساعت (گھڑی)، رقم اور تعطیل کے متعلّق اصلاحات تھیں۔ ۱۹۲۶ء کے ایک قانون کی رُو سے ہجری اور رومی تقویم منسوخ ہوئی اور اس کی جگہ عیسوی (مسیحی) تقویم رائج ہوئی۔ ترکی ساعت کی جگہ رائج العام ساعت (گھڑی) کی ترویج کی گئی۔ ''رقم'' کا پرانا طریقہ منسوخ کیا گیا اور دوسرے ملکوں کی تقلید کرتے ہوے جمعے کے بجاے اتوار کو چھٹی کا دن قرار دیا گیا۔ دوسری چیز قرآن [مجید] کا ترکی میں ترجمہ اور ۱۹۳۱ء سے اذان، نماز، دُعا وغیرہ ترکی زبان میں پڑھنے کا فیصلہ تھا۔ تیسری معرکہ آرا اصلاح رسم الخط کی عربی حروف سے لاطینی حروف میں تبدیلی تھی۔ ۱۹۲۷ - ۱۹۲۸ء میں اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ لوگوں کو اس انقلابی تغیّر کے لیے تیار کرنے میں مصطفٰی کمال اور عصمت پاشا نے بہت سرگرمی اور انہماک کا اظہار کیا۔ نئے رسم الخط کو مقبول عام بنانے کے لیے ایک ''دِل انجمنی'' (انجمنِ لِسان) قائم کی گئی۔ ۲ جون ۱۹۲۸ء کو ایک جلسہ عام اسی غرض سے انقرہ میں منعقد ہوا اور استانبول میں یکم اگست اور ۹ اگست ۱۹۲۸ء کو جلسے ہوے، جن میں سے دوسرے جلسے میں مصطفٰی کمال نے خود

تقریر کی اور لوگوں کو جلد از جلد نئے رسم الخط کو سیکھنے کی تقلید و تاکید کی۔ ۲۵ اگست ۱۹۲۸ء کو استانبول میں دولمہ باغچہ میں ایک بڑا اجتماع ہوا۔ اس میں نئے حروف میں مطبوعہ الف با کی نقول حاضرین میں تقسیم کی گئیں۔ علاوہ ازیں غازی مصطفٰی کمال نے تکہ داغ اور چناق قلعہ کے علاقے میں دورہ کر کے خود لوگوں کو نئے حروف کی تعلیم دی۔ آخر کار ۳ نومبر ۱۹۲۸ء کو بیوک مجلس کی طرف سے نئے رسم الخط کا استعمال قانوناً لازمی قرار دیا گیا۔ چوتھی چیز جس نے مصطفٰی کمال کی توجہ اپنی طرف منعطف کی وہ تاریخِ ترکی کی ازسرِ نو تدوین تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے ترکی مؤرخین کے سامنے حسبِ ذیل مسائل بغرضِ غور پیش کیے: (۱) ترکی کے سب سے قدیم باشندے کون تھے؟ (۲) ترکی کی پہلی مدنیت کس طرح اور کن لوگوں کے ہاتھوں وجود میں آئی؟ (۳) دنیا کی تاریخ اور مدنیت میں ترکوں کا کیا مؤقف ہے اور انھوں نے کیا خدمات انجام دی ہیں؟ (۴) ترکوں کا محض ایک عشیرہ سے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر لینا چونکہ ناممکن معلوم ہوتا ہے اس لیے اس عام روایت کی کیا تشریح و وضاحت ہوسکتی ہے؟ (۵) تاریخِ اسلامی کی حقیقی کیفیت اور ترکوں کی تاریخ، اسلام میں ترکوں کا مقام اور وظیفہ (role) کیا ہے؟ ان نکات کو پیشِ نظر رکھ کر تاریخِ ترکی کی تیاری کے لیے کئی مشہور ادیب اور تاریخ دان متعین کیے گئے اور ۱۹۳۰ء میں ترک تاریخینگ انا حدلری نام سے ایک مختصر سی تاریخ شائع کی گئی۔ ۱۹۳۱ء میں ایک جماعت ''ترک تاریخ تدقیق ہیئتی'' نامی بنائی گئی اور ۱۹۳۲ء میں انقرہ میں پہلی تاریخ کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں اس موضوع پر مباحثہ ہوا کہ ترکی ملّت کی تاریخ، جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا رہا ہے، صرف عثمانلی تاریخ سے عبارت نہیں ہے۔ ترکوں کی تاریخ بہت زیادہ قدیم ہے اور جن قوموں سے ان کا تعلّق رہا ہے ان کی مدنیت پر انھوں نے بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ مصطفٰی کمال کی پانچویں اصلاح زبان سے متعلّق تھی۔ اس مقصد سے ۱۹۳۲ء میں ایک ''ترک دل تدقیق جمعیتی'' قائم ہوئی، جس کے سپرد اصلاح و تدوین لغات اور صرف و نحو کے قواعد کی ترمیم و تنسیخ کا کام کیا گیا اور ایک زبان کی کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس مسئلے سے مصطفٰی کمال کو انتہائی شغف تھا اور وہ اپنی علالت کے آغاز تک برابر اس سلسلے میں کوشاں رہے۔ چھٹی چیز ملک کی اقتصادی حالت کی اصلاح تھی۔ اس کا مصطفٰی کمال کو شروع ہی سے خیال تھا؛ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں ازمیر (سمرنا) میں ایک اقتصادی کانگرس منعقد ہو چکی تھی۔ وہ سرمایہ داری کے مخالف تھے، لیکن ملک کی فلاح و بہبود کے لیے غیر ملکی سرمائے کی امداد کو ضروری اور بے ضرر تصوُّر کرتے تھے۔

۱۹۳۲ء میں ترکی کو مجلس اقوام میں شرکت کی دعوت دی گئی، اسی سال یورپ میں جو سیاسی بحران رونما ہوے ان میں مصطفٰی کمال نے بہت حزم و احتیاط سے کام لیا اور کئی ہمسایہ ملکوں سے دوستانہ معاہدے طے کیے، جن میں سے ائتلاف بلقانی (Balkan Entente)، جو ۱۹۳۴ء میں عمل میں آیا اور میثاق سعد آباد، جس پر ۱۹۳۷ء میں دستخط ہوے، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی تمام تر سعی امن و امان کی بحالی تھی؛ چنانچہ انھوں نے مذہبی مناقشات کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی اور امن عالَم کے لیے بھی برابر کوشاں رہے۔ انھیں ایک آئندہ جنگ کے خطرے کا احساس تھا اور وہ اس کے لیے تدابیر سوچتے رہے۔ ان کا قول تھا کہ اگر جنگ بم پھٹنے کی طرح ایک دم شروع ہوجائے تو اس کی روک تھام کے لیے سب قوموں کو پورے طور پر مسلّح رہنا چاہیے اور اپنی فوجی اور مالی قوتوں کو جمع کر کے حملہ آور کے خلاف ضروری اقدام کرنا چاہیے۔ جنگ کو روکنے کی سب سے مؤثّر تدبیر یہ ہے کہ جس قوم کی طرف سے تعدّی کا احتمال ہے اسے یہ معلوم ہوجائے کہ تعدّی و زیادتی سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ لیکن غازی مصطفٰی کمال گزشتہ چند سال سے جو محنت و مشقت برداشت کرتے رہے تھے اس سے ان کی صحت پر مضر اثر پڑنا شروع ہوا اور وہ وقت قریب آ گیا جبکہ ترکی قوم کا یہ عظیم ترین راہبر اپنے عزیز وطن اور محبوب ملّت سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو کر حیاتِ ابدی حاصل کرے؛ چنانچہ ان کی آخری علالت کا فوری سبب وہ سفر بن گیا جو انھوں نے ۱۹۳۸ء میں انقرہ سے یالوا (Yalua) کے راستے استانبول کی جانب کیا۔

۲۰ جنوری ۱۹۳۸ء کو وہ انقرہ سے روانہ ہو کر ۲۲ جنوری کو یالوا پہنچے اور ایک نئے ہوٹل (Hotel Phermal) میں سب سے پہلے مہمان کے طور پر مقیم ہوے۔ یکم فروری کو وہاں سے بروسہ کی جانب روانہ ہوے راستے میں گیملک (Gemlik) نامی مقام میں ریشم کے (Suni Ipek) کارخانے کے افتتاح کے لیے رُکے۔ بروسہ پہنچ کر لوگوں کی خواہش کے مطابق باوجود سخت بارش کے وہ ایک کھلی موٹر میں بیٹھ کر بازاروں میں سے گزرے، رات کو بلدیہ کی طرف سے ایک دعوت میں شریک ہوے اور دوسرے دن انھوں نے ماریا فابریکا (Marios Fabrika) کارخانے کا افتتاح کیا۔ ۳ فروری کو بروسہ سے روانہ ہو کر استانبول پہنچے اور وہاں چند روز قیام کے بعد مُدانیہ کے راستے انقرہ واپس آئے (۲۵ فروری) اور یونان، رومانیا اور یوگوسلاویا کے نمائندوں سے ملاقات کی۔ ان کی علالت، جو قسطنطنیہ ہی میں شروع ہوگئی تھی، زور پکڑ گئی، اس لیے بغرض استراحت چناقیہ میں ''قشقون'' میں مقیم ہوے اور ان کے معالجے کے لیے فرانس کے مشہور ڈاکٹر پروفیسر Fissenger کو بلایا گیا۔ ۳۱ مارچ ۱۹۳۸ء کو ان کی صحت کے بارے میں پہلا بلیٹن شائع کیا گیا۔ مئی میں ان کی صحت کچھ بہتر ہوگئی اور وہ انقرہ کے گردونواح میں سیر و تفریح کے لیے اکثر آتے جاتے رہے۔ ۷ مئی سے ۲۴ مئی تک انھوں نے مختلف مقامات کی سیاحت کی اور اَدنہ پہنچے۔ اس سفر سے جو تکان ہوئی اس سے علالت پھر عود کر آئی اور ۲۶ مئی کو انقرہ واپس آنے کے بعد انھیں فوراً بغرضِ علاج استانبول جانا پڑا۔ وہاں وہ دولمہ باغچہ میں مقیم رہے۔ ڈاکٹروں کی تشخیص یہ تھی کہ ان کی علالت کا باعث تلّی (قرہ جگر) کی خرابی ہے۔ کئی ترکی ماہرینِ طب ان کی دیکھ بھال پر مامور تھے اور پروفیسر Fissenger کو دوبارہ پیرس سے طلب کیا گیا۔ ان کے علاوہ برلن سے پروفیسر Bergmann اور وی اَنا سے پروفیسر Epinger کو بھی بلایا گیا اور علاج معالجے کا کام ایک طبی بورڈ کے

سپرد کر دیا گیا۔ ۳ جون کو بحیرۂ مارمورا میں ایک کشتی (yacht) میں سیاحت کی اور باوجود علالت اُمورِ مملکت سے برابر دلچسپی لیتے رہے۔ ۱۹ جون کو رومانیا کے بادشاہ سے ملاقات بھی کی اور ۲۴ جون کو دوبارہ بحیرۂ مارمورا کی سیاحت پر روانہ ہوے۔ استانبول واپس آکر انھیں اپنی علالت کے نازک صورت اختیار کر لینے کا احساس ہوا؛ چنانچہ انھوں نے اپنا وصیت نامہ تحریر کیا، جس کی رُو سے انھوں نے اپنے اثاثے کا ایک حصّہ اپنے اقربا کے نام اور باقی جگہ جگہ کی ''ترک تاریخی و دلی'' انجمنوں کے نام لکھ دیا۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۸ء سے صحت کے متعلّق سرکاری بلیٹن صبح و شام شائع ہونے لگا۔ بیچ میں حالت پھر کچھ سنبھل گئی، لیکن جمہوریت کی پندرھویں سالگرہ میں شریک نہ ہو سکے اور ترکی فوج کے نام ان کا پیغام جلال بایار (Bayar) نے پڑھ کر سنایا۔ یکم نومبر کو مجلس کے اجلاس میں بھی وہ شرکت نہ کر سکے اور ان کی صدارتی تقریر مجلس کے سپیکر نے پڑھی۔ دو ہفتے کچھ بہتر رہنے کے بعد بیماری پھر دفعۃً بڑھ گئی۔ ۸ نومبر سے پھر باقاعدہ بلیٹن نکلنا شروع ہوا اور آخر ۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء کو صبح نو بج کر پانچ منٹ پر وہ اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے اور ان کے انتقال کا حکومت کی طرف سے اسی روز باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔ ۱۶ نومبر کو ان کا تابوت دولمہ باغچہ کے بڑے سالون (Salon) میں رکھ دیا گیا، یعنی اسی جگہ جہاں ۱۹۲۷ء میں انھیں استانبول کی شہریت دی گئی تھی۔ ۱۹ نومبر کو پروفیسر شرف الدین یالتقایا نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ بارہ جنرلوں نے تابوت کو اٹھا کر توپ کی گاڑی پر رکھا اور جنازہ شہر کے بازاروں میں سے گزرتا ہوا گلخانہ پارک میں پہنچا اور وہاں سے یاوُوز نامی کروزر (cruiser) میں منتقل کر دیا گیا۔ تابوت شام کو ارمیت پہنچا اور ۲۰ نومبر کو انقرہ۔ نئے صدر عصمت انونو اور دوسرے بڑے ارکانِ مجلس نے اس کا استقبال کیا اور لوگ جوق در جوق اس کی زیارت کے لیے جمع ہو گئے۔ پھر بارہ جنرلوں نے تابوت کو توپ کی گاڑی پر رکھا اور ایک سو ایک توپ کی سلامی کے ساتھ اسے ہیوک مجلس کی عمارت کے سامنے ایک چبوترے پر رکھ دیا گیا تا کہ لوگ اپنے محبوب ملت قائد کی آخری زیارت کر سکیں۔ ۲۱ نومبر کو بارش میں جنازے کا جلوس روانہ ہوا۔ اس مرتبہ بارہ وکلاے ملت نے تابوت کو اٹھا کر توپ کی گاڑی پر رکھا اور بارہ جنرل گاڑی کو دونوں طرف سے باری باری کھینچتے رہے۔ راستے میں غیر ملکی فوجوں کے دستوں نے سلامی دی۔ جلوس آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ تابوت کے پیچھے تمام بڑے سرکاری عہدیدار اور غیر ملکی سفرا اور نمائندے پیدل چل رہے تھے۔ انقرہ ریلوے اسٹیشن سے جلوس اتنوگرافی میوزیم کے قریب اس مقام پر پہنچا جو غازی مصطفٰی کمال کی آخری آرام گاہ کے طور پر منتخب کیا گیا تھا۔ تابوت کو ایک مرمریں لوح پر رکھ دیا گیا اور اس طرح اس عظیم الشّان ہستی کو اس وطن کی خاک میں مستور کر دیا گیا جس کی حرمت و حفاظت کے لیے اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اس موقع پر عصمت انونو نے قوم کے نام ایک طویل اور انتہائی رقّت آمیز پیغام شائع کیا، جس میں غازی مصطفٰی کمال کی گوناگوں صفات حمیدہ اور مساعی جمیلہ کا ذکر تھا۔

غازی مصطفٰی کمال اتاترک حقیقۃً ترکوں کے سب سے بڑے قہرمانِ ملّی تھے۔ وہ ایک چھوٹے سے رتبے سے ترقی کر کے معراجِ کمال کو پہنچ گئے۔ انھوں نے جو کارہاے نمایاں طرابلس الغرب، چناق قلعہ، فلسطین اور مشرقی اضلاع میں اور آخر کار مجادلۂ ملّی میں دکھائے وہ اظہر من الشّمس ہیں۔ انھوں نے جس کام کو ہاتھ میں لیا اس میں کامیابی نے ان کا ساتھ دیا۔ وہ حقیقی معنی میں ایک مُصلح اور انقلاب پسند انسان تھے۔ سلطنت کا الغاء، خلافت کا خاتمہ، مغربی قانون کی ترویج، مدرسوں اور تکیوں کی منسوخی، رسم الخط کی تبدیلی، ٹوپی اور لباس میں جدت، عورتوں کی حیثیت کی اصلاح — یہ سب چیزیں ان کے ایک بڑے مصلح قوم ہونے کا بیّن ثبوت ہیں۔ وہ ترکی کی نشأۃِ ثانیہ (renaissance) کے اصلی معمار تھے اور ان کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ اصلی ترکی کردار کو برقرار رکھتے ہوے مغربی تہذیب کو اپنایا جائے؛ چنانچہ ایک موقع پر انھوں نے کہا تھا کہ ہم اپنی مدنیت کو ہم عصر مدنیت کے نمونے پر مرتّب کریں گے۔ وہ ایک بے نظیر ماہر سیاست تھے اور دور اندیشی، فہم و فراست اور ذہانت و فطانت میں بے مثل تھے۔ علاوہ ازیں وہ ایک بڑے حامی صلح و امن تھے۔ غرض ہر لحاظ سے وہ ایک عظیم الشان انسان تھے اور تاریخ انھیں ترکی قوم کا نجیب ترین فرزند اور دنیا کا شریف ترین انسان قرار دے گی۔

[اتاترک کے لیے دیکھیے نیز آ آ، لائڈن طبع دوم، ۱: ۸۳۴].

[مقتبس از آ آ ترکی]

اَتالیق: اتابک کی ہم معنی ایک اصطلاح، جو صرف ترکوں ہی میں نہیں، * بلکہ قفقاز، ترکستان اور ہندوستان میں رہنے والے تیموری اور ترکی خاندانوں میں بھی رائج تھی۔ یہ اصطلاح انیسویں صدی تک بخارا و خیوا کے امیروں میں مستعمل تھی اور کاشغر کا امیر یعقوب بے اپنے لیے اتالیق غازی کا لقب استعمال کرتا تھا۔

مآخذ: (۱) دیکھیے مقالہ از محمد فؤاد کوپرولو، مع مکمل فہرست مآخذ، در آ آ ترکی، بذیل مادّہ [قب نیز مادّۂ اتابک].

(R. MANTRAN منٹران)

اَتبَرَہ: دریاے نیل کی ایک معاون ندی، جسے قدما اَستَبوراس (Astaboras) * کے نام سے جانتے تھے۔ یہ حبشہ میں گوندر (Gonder) کے قریب سے نکلتی ہے اور جب یہ قلّابات (Gallabat) کے قریب سودان میں داخل ہوتی ہے تو کچھ دور نیچے جا کر اس میں سلام اور ستیت آ کر مل جاتے ہیں؛ پھر یہ خرطوم سے شمال میں تقریباً ۲۰۰ میل کے فاصلے پر اصل دریاے نیل میں جا گرتی ہے۔ طغیانی کے زمانے میں (اواخر مئی سے اواخر ستمبر تک) یہ اپنا مٹیالا پانی بڑی مقدار میں دریاے نیل میں لے جاتی ہے، لیکن سال کے بقیہ حصّے میں خشک ہو کر چھوٹے چھوٹے تالابوں میں بٹ جاتی ہے۔

دریا کے دہانے پر اَتبرہ کا شہر آباد ہے (میونسپل کونسل کے رقبے کی آبادی ۳۶,۱۴۳ ہے) اور سودان ریلوے کا صدر مقام اور بحیرۂ احمر لائن کا جنکشن ہونے کی وجہ سے اسے اہمیّت حاصل ہے۔ ۸ جون ۱۸۹۸ء کو نُخَیلہ کے مقام پر دریا کے دہانے سے اوپر کے رُخ تھوڑے فاصلے پر، اَتبرہ کی جو جنگ ہوئی اُس میں سر ہربرٹ (بعد میں لارڈ) کچنر کی کمان میں انگریزی مصری فوجوں نے ایک مہدوی فوج کو شکست دی، جو بارہ ہزار پیادوں اور چار ہزار سواروں پر مشتمل تھی اور جس کی قیادت درویش امیر محمود احمد کر رہا تھا۔

مآخذ: (۱) Sudan Almanac (خرطوم، سال بہ سال)؛ (۲) ہُرسٹ (H. E. Hurst): *The Nile*، لنڈن ۱۹۵۲ء؛ (۳) تھیوبولڈ (A. B. Theobald): *The Mahdiya*، لنڈن ۱۹۵۱ء۔

(S. HILLESON ہِلِّسن)

---

* **اِتّحاد:** ایک چیز بن جانا۔ متکلّمین اسلام نے اتحاد کی دو قسمیں بتائی ہیں: ۱۔ حقیقی اور ۲۔ مجازی۔ اتحاد حقیقی کی پھر دو قسمیں ہیں: اس لحاظ سے کہ اس کا اطلاق (ا) ایسی دو اشیا پر کیا جائے جو ایک ہو جاتی ہیں، مثلاً عمرو کا زید ہو جانا یا زید کا عمرو؛ یا (ب) اس شے پر جو کسی ایسی شے کی صورت اختیار کرے جس کا اس سے قبل وجود نہیں تھا، مثلاً زید وہ شخص بن جائے جو پہلے موجود نہیں تھا۔ اس قسم کا حقیقی اتحاد قطعاً خارج از امکان ہے؛ لہٰذا یہ مقولہ بن گیا کہ "الاثنان لا یتحدان" [دو ایک نہیں ہوتے]۔ اتحاد مجازی کی تین قسمیں ہیں اور وہ اس اعتبار سے کہ اس اصطلاح کا مطلب ہو: (ا) فوری یا بتدریج قلب ماہیت کے باعث کسی شے کا دوسری میں بدل جانا، مثلاً پانی کا ہوا میں (اس صورت میں پانی کی اصل ماہیت فنا ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کی مخصوص صورت اس کے جوہر سے دور کر دی گئی ہے اور ہوا کی مخصوص صورت اس جوہر سے ملا دی گئی ہے)، یا سیاہ کا سفید ہو جانا (اس صورت میں کسی شے کی ایک صفت معدوم ہو جاتی ہے اور کوئی دوسری صفت اس کی جگہ لے لیتی ہے)، یا (ب) کسی شے کا بذریعۂ ترکیب کوئی دوسری شے بن جانا، جس سے ایک تیسری شے ظہور میں آ جاتی ہے، مثلاً مٹی میں پانی ملا دیا جائے تو گارا بن جائے گی؛ یا (ج) کسی شخص کا دوسرے کی شکل اختیار کر لینا، مثلاً فرشتے کا انسانی شکل۔ اتحاد مجازی کی ان تینوں قسموں کا فی الواقع ظہور ہوتا رہتا ہے۔ مصطلحاتِ صوفیہ میں اصطلاحِ اتحاد یا تو صوفی کے اس وصال کے لیے استعمال کی جاتی ہے جس کے ذریعے مخلوق اور خالق ایک ہو جاتے ہیں اور یا اس نظریے کے لیے جس کے ماتحت اس قسم کے اتحاد کو ممکن سمجھا جاتا ہے۔ حالت اتحاد کا یہ تصوّر بالعموم صوفیہ کے ہاں وہی حیثیت رکھتا ہے جو ایک متوازی عقیدے حلول [رکّ بآن] کو ملحدین کے ہاں حاصل ہے، یعنی خدا کا کسی مخلوق کی شکل میں جلوہ گر ہونا، جس سے تجانس کا ماننا لازم آتا ہے اور تجانس سے توحید الٰہی کے صحیح اور سچے تصوّر کی نفی ہوتی ہے، جس کی رُو سے خدا کے سوا اور کسی شے کا حقیقی وجود نہیں۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ اتحاد کے لیے دو ایسی ہستیوں کا وجود پہلے سے مستلزم ہے جو بعد میں ایک ہو جائیں؛ لیکن اس کے برعکس زیادہ راسخ العقیدہ صوفیوں کی رائے میں انسان کی انفرادیت محض ایک مظہر ہے، جو بالآخر ایک واحد ازلی اور ابدی حقیقت میں گم ہو جاتا ہے (فنا فی الحق)۔ بعض موقعوں پر اتحاد کی اصطلاح تصوّف کی اصطلاح وحدت یا توحید کی طرح اس عقیدے کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے کہ اشیا کا بذاتِ خود کوئی وجود نہیں، وجود کا سرچشمہ خدا ہے، لہٰذا اس اعتبار سے وہ اور خدا ایک ہی ہیں (عبدالرزاق الکاشی: الاصطلاحات الصوفیۃ، طبع شپرنگر (Sprenger): ص ۵)۔ علی بن وفا کی رائے میں (جو الشعرانی نے الیواقیت والجواہر، طبع بولاق ۱۲۷۷ھ، ص ۸۰، سطر ۱۸ ببعد، میں نقل کی ہے) اتحاد کے معنی اصطلاح صوفیہ میں ہیں "رضائے مخلوق کا رضائے الٰہی میں مدغم ہو جانا"۔

مآخذ: (۱) *Dictionary of the Technical Terms used in the Sciences of the Mussalmans*، طبع Sprenger، ص ۱۴۶۸؛ (۲) جُرجانی: تعریفات، طبع فلُوگل (Flügel)، ص ۶؛ (۳) ہجویری: کشف المحجوب، ترجمہ از نکلسن، ص ۲۵۴؛ (۴) محمود شَبِستَری: گلشن راز، طبع وِنفیلڈ (Whinfield)، ۱۱: ۴۵۲-۴۵۵؛ (۵) Tholuck: *Ssufismus*، ص ۱۴۱ ببعد؛ (۶) Macd-onald: *The Religious Attitude and Life in Islam*، ص ۲۵۸۔

(NICHOLSON نکلسن)

---

* **اَتَر:** موریتانیا (Muritania) کا ایک شہر اور حلقۂ اضرار (Adrar) کا صدر مقام، جو سینٹ لوئی (St-Louis) سے تندوف (Tindouf) جانے والی سڑک پر ۲۳۰ میٹر کی بلندی پر، پورٹ ایتین (Port-Etinne) سے تقریباً ۴۲۰ کیلومیٹر مشرق کی طرف واقع ہے۔ 'قصر' میں ۴,۵۰۰ آدمی رہتے ہیں، جن میں سے اکثر سماکی (Smacids) سے تعلّق رکھتے ہیں، جو مرابطون کا ایک قبیلہ ہے۔ مقامی روایت کے مطابق اَتَر کی بنیاد سولھویں یا سترھویں صدی میں رکھی گئی۔ ان دنوں مکّہ [معظّمہ] جانے والے حاجیوں کے قافلے کو ہر سال اِداوُ (Idau) علی شِنقیطی (Chinguetti) مرتّب کیا کرتا تھا اور وہ اس قافلے کی امامت سماکیوں (Smacids) کے کسی ممتاز شخص کو تفویض کر دیتا تھا، لیکن پھر ایسا اتفاق ہوا کہ انھوں نے کسی غلّاوی (Ghellawi) کے حق میں اس دستور کو ترک کر دیا۔ اس بات پر بگڑ کر سماکیوں کے ایک گروہ نے احتجاجاً یہ شہر چھوڑ دیا اور ازوگوئی (Azougui) قبیلے کی اہم بستی میں جا بسے، جس کا اب نام و نشان باقی نہیں، لیکن جو اُن دنوں اتنی خوش حال تھی کہ پرتگالیوں نے پندرھویں صدی میں وہاں ایک کارخانہ کھولا تھا۔ اس طرح غصّے کا یہ مظاہرہ شہر اَتَر کے وجود میں آنے کا باعث بن گیا۔

اگرچہ شِنقیطی (Chinguetti) اب تک اضرار کا روحانی اور مذہبی مرکز رہا ہے، تاہم اب اَتَر سب سے بڑا تجارتی مرکز ہے، جو بڑے بڑے خانہ بدوشوں

کے لیے ایک منڈی کا کام دیتا ہے اور مراکشی کارکنوں کی مصنوعات کو باہر بھیجنے کا جنوبی راستہ ہے۔ چرواہے یہاں اپنے اونٹ اور بھیڑیں بیچنے اور اپنے لیے چائے، شکر، نیل اور تیل وغیرہ کا ذخیرہ لینے کے لیے آتے ہیں اور یہیں کے کھجور کے مشہور باغ میں وہ اس عمل کی غرض سے آتے ہیں جو جطنہ (getna) کہلاتا ہے، یعنی کھجوروں کو صاف کرنے کا کام، جس سے کھجوروں کی فصل میں بہت دولت حاصل ہوتی ہے۔

جب بیسویں صدی کے آغاز میں کوپولانی (Coppolani) اور اس کے جانشین کرنل مونٹین کیپڈی بوسک (Montane-Capdebosc) نے فرانسیسی اثر کو سینی گال کے شمال تک بڑھا لیا تو وہ جلد ہی مجبوراً اس نتیجے پر پہنچا کہ جب تک اضرار کا کوہستانی سلسلہ مسلّح باغیوں کے لیے ایک محفوظ مرکز کا کام دیتا رہے گا موریتانیا میں امن قائم رکھنا ناممکن ہوگا۔

"[جنگی] موقف کی کلید" اضرار کا صدر مقام اتر ہی تھا، جسے کرنل گُورَو (Gouraud) نے ۱۹۰۸ء میں اپنے فوجی دستے کا مطمح نظر قرار دیا۔

امیر کے مجاہدوں اور شیخ ماء العینین کے طالبوں کو درۂ ہمدون (حمدون؟) پر شکست دینے کے بعد وہ ۹ جنوری ۱۹۰۹ء کو قصر میں داخل ہوا اور سما کی (Smacids) سردار سِیدِیا اُولد سیدی بابا (Sidia Ould Sidi Baba) نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔

اس وقت سے اَتَر، جسے خشکی اور ہوا کے ذریعے سینی گال اور مراکش سے ملا دیا گیا ہے، تجارتی اور اقتصادی اہمیت کے اعتبار سے بہت بڑھ گیا ہے۔

مآخذ: (۱) Gouraud: *Mauritanie-Adrar*، پیرس ۱۹۴۵ء؛ (۲) سشاری (Psichari): *Les Voix qui crient dans le désert* (مکمل تصانیف، ج ۲)، پیرس ۱۹۴۸ء؛ (۳) موڈا (Cdt. Modat): *Portugais, Arabes et Français dans l' Adrar mauritanien*، در *Bull. du Comité d' Études historiques et scientifiques d' A.O. F.* ۱۹۲۲ء، ص ۵۵۰؛ (۴) *RMM*، ج ۱۹، ۱۹۱۲ء، ص ۲۶۰؛ (۵) *Études mauritaniennes* (*IFAN* no. 5) Ahmed Lemine ech Chinguetti.

(S. D' OTTON LOYEWSKI لائیوسکی)

✱ **اُترار:** (Otrar)، سیر دریا (سَیحُون) کے دائیں کنارے پر اور اُس کے معاون اَرِس کے قدرے جنوب میں ایک شہر۔ جغرافیائی اصطلاح کے طور پر یہ نام پہلی بار اُطرار کی شکل میں یاقوت (۱: ۳۱۰) میں آیا ہے، مگر الطبری (۳: ۸۱۵ - ۸۱۶) اس سے پہلے ہی خلیفہ ہارون الرشید کا ایک باجگزار باغی امیر اترار بندہ نامی کا ذکر کرتا ہے۔ المقدسی نے اِسْبِیجَاب کے ضلع میں جس ترار زَراخ (*BGA*، ۳: ۲۶۳، ۲۷۴) کا ذکر کیا ہے وہ یقیناً کوئی بالکل دوسری جگہ ہوگی۔ اُترار شاید وہی مقام ہو جو ولایت فاراب [رکّ بآن] کا صدر مقام تھا، جس نے قدیم تر شہر کَدَر (جس کا ذکر الاِصْطَخْرِی اور ابن حَوْقَل نے کیا ہے) کی جگہ لی تھی اور جسے المقدسی فاراب (باراب، برص ۲۷۳) کہتا ہے۔ چنگیز خان کے حملے کے وقت اُترار کا جو حشر ہوا اس کے باعث اس شہر کو ایک المناک شہرت حاصل ہوگئی۔ اترار اس وقت خوارزم شاہ محمد کی مملکت کا سرحدی شہر تھا، جسے اس نے ۱۲۱۰ء میں قرہ خطائیوں سے چھین لیا تھا۔ اس زمانے میں یہ شہر تاج الدین بلقا خان کے ماتحت تھا، جو اپنے نئے بادشاہ کو تنگ کر رہا تھا۔ ۱۲۱۸ء میں اُترار میں ایک بڑا قافلہ وارد ہوا، جو ۴۵۰ آدمیوں پر مشتمل تھا (جُوینی)۔ یہ سب کے سب مسلمان تھے اور انھیں مغل فاتح [چنگیز] نے مسلمانوں کی سلطنت سے تجارت اور صلح و آشتی کے تعلّقات قائم کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ حاکم شہر اینالجِک نے پہلے تو انھیں روک لیا — یا تو اس لیے کہ وہ انھیں جاسوس سمجھا اور یا محض اس لیے کہ اسے ان کے مال و متاع کا لالچ پیدا ہوا — اور بعد میں ان سب کو قتل کر دیا گیا اور حاکم نے ان کے مال و متاع پر قبضہ کر لیا۔ ایک ماخذ (النَّسوی) اس فعل کی ذمّہ داری کسی حد تک سلطان پر بھی ڈالتا ہے۔ بہر حال جب چنگیز خان کا ایک سفیر اس شرمناک حرکت کی شکایت اور اینالجِک کی حوالگی کا مطالبہ کرنے آیا تو سلطان نے اسے حوالے کرنے سے انکار کیا اور سفیر کو قتل کرا دیا۔ اس واقعے سے جنگ ناگزیر ہوگئی، چنانچہ ۱۲۱۹ء میں چنگیز خان مغلوں کا لشکر لے کر سیر دریا پر نمودار ہوا اور اُترار کا محاصرہ کر لیا۔ شہر کئی مہینوں کے محاصرے کے بعد سر ہوگیا۔ اینالِچک کو گرفتار کر کے قتل کے لیے قراقرم روانہ کر دیا گیا۔ اُترار کے مقام ہی سے مغل فوجوں نے پھیل کر خوارزم شاہیوں کی سلطنت کو فتح کیا۔ اُترار پندرھویں صدی کے آغاز میں بھی موجود تھا، کیونکہ ۱۴۰۵ء میں یہاں تیمور کی وفات ہوئی (علی یزدی: ظفر نامہ، ۲: ۶۴۶)۔ اُترار کے محلِ وقوع کا پتا آج محض اس کے شکستہ آثار سے ملتا ہے۔

مآخذ: (۱) اُترار کے قتلِ عام اور اس کی فتح کا حال ان مؤرّخوں نے بیان کیا ہے: (۱) جوینی: تاریخ جہان گشا، در *GMS*، ۱: ۶۱ ببعد؛ (۲) الجُوزجانی: طبقات ناصری، طبع Nassau Lees، ص ۲۷۲، ۹۶۷؛ (۳) النَّسَوی، طبع ہُوداَ (Houdas)، ص ۳۴ ببعد؛ (۴) ابن الاثیر، طبع ٹورن برگ (Tornberg)، ۱۳: ۲۳۹ ببعد؛ (۵) رشید الدین: جامع التواریخ، ج ۱ (طبع بِریزِن Berezin)؛ (۶) قبّ نیز مغلوں کی تاریخیں از دیسان (d' Ohsson)، فان ہامر (von Hammer) اور ہورتھ (Howorth)؛ (۷) بارٹولڈ (W. Barthold): *Turkestan down to the Mongol Invasion*، در *GMS*، سلسلۂ جدید، ۵: ۱۷۷ و مواضع کثیرہ، در حصّۂ تاریخ؛ (۸) لی سٹرینج (G. Le Strange): *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۴۸۵۔

(J. H. KRAMERS کرامرز)

✱ **اَتْرَک:** خراسان کے شمال میں ایک دریا، جس کا منبع کوپت داغ کے گلستان نامی سلسلے میں کوہ ہزار مسجد پر ہے، ۳۷°-۱۰' شمال، تقریباً ۵۹° درجے مشرق، قُوچان (Kočan) کے شمال مشرق میں ۳,۹۷۵ فٹ سطح سمندر سے